حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

الابقاء ماہ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ جلد ۳۵ شمارہ ۱   ۱   مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۲ء

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

الوعظ المسمّٰی بہ

خیر الارشاد لحقوق العباد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ

و

—— رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ——

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ۱

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمٰی بہ

خیر الارشاد لحقوق العباد

اين	کہاں ہوا	جلال آباد مکان تحصیلدار صاحب ضلع مظفر نگر
متی	کب ہوا	۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ بروز دوشنبہ بوقت چاشت
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹے ۵۰ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	تخت پر کرسی رکھوا کر کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا
لم	کیوں ہوا	تحصیلدار صاحب کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	حقوق العباد کے اہتمام کی تاکید اور یہ کہ حق العبد کے فوت کرنے میں حق اللہ بھی فوت ہوتا ہے نیز حقوق العباد میں کوتاہی کا سبب بیان فرما کر اس کا ازالہ کیا گیا۔
لمن ای شان	کس کے لئے زیادہ مفید تھا	تمام مسلمانوں کو عموماً اور اہلِ حکومت کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	الاحقر ظفر احمد عفا عنہ و وفقہ لما یحب و یرضیٰ
المستمعون	سامعین کتنے تھے	مجمع رجال تقریباً ۵۰ اور پردہ میں مجمع مستورات ان کے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	اس وعظ کی تسوید تفصیلی ۲۱ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ کو شروع ہوکر یکم رجب ۱۳۴۳ھ بروز سہ شنبہ تمام ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و

مولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۰ پس الزام تو انھی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ ایک آیت ہے سورۂ شوریٰ کی اس میں حق تعالےٰ نے حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے گو سباق وسیاق کے لحاظ سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے۔ مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عبارۃ النص سے تو اس کی دلالت معنی مسوق لہ پر ہے جو کہ ایک خاص حق العبد ہے اور اشارۃ النص سے مطلق حقوق العباد پر دلالت ہے یعنی مطلق حقوق العباد پر اس کی دلالت اشارۃً ہے نہ کہ قصداً مگر دلالت خفی نہیں بلکہ صریح ہے اور اس کو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون ضرورت کے موافق بیان ہوا ور یوں تو شریعت کے سارے مضامین ہی ضروری ہیں مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا

۱؎ کیونکہ اس سے اوپر یہ آیت ہے وَالَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۰ إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ الآیہ اور اس کے بعد یہ آیت ہے وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ۰ اس ماقبل و مابعد کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ فی الوعظ میں ظلم سے مراد انتقام کے وقت ظلم کرنا ہے مگر الفاظ آیت خود عام ہیں نیز جب ظلم بوقت انتقام کی یہ حالت اور اس پر یہ وعید ہے تو ابتدائے کلام تو اس سے اشد ہے اس پر بدرجہ اولیٰ یہ وعید ہوگی۔

بیان کیا جائے اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک حکم ضروری العمل ہو اور اس سے غفلت اور بے التفاتی برتی جا رہی ہو چنانچہ اس وقت میرے خیال میں اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ جب مجھ سے کئی ہفتہ پہلے بیان کے لئے کہا گیا تھا تو اسی وقت دل میں یہ بات آئی تھی کہ اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے مگر اس وقت باحتمال بارش کے یہاں آنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے کہدیا تھا کہ جس دن بادل نہ ہوا اس دن چلوں گا چنانچہ اس جمعہ کو جو مجھ سے تاریخ پوچھی گئی تو میں نے پیر کا دن اسی شرط کے ساتھ معین کر دیا تھا گو آج بھی بادل گھر آ ہوا تھا اور ہمت آنے کی نہ ہوتی تھی مگر جب سواری آگئی تو میں نے باربار سواری واپس کرنا گوارا نہ کیا اور خدا کے نام پر چلا آیا (اور بحمد اللہ بادل کے وقت گئے تھے اور کھلے میں واپس آئے لوٹتے وقت بادل نہ رہا تھا ۱۲ ظ) تو اس مضمون کا خیال مجھے درخواست کے ساتھ ہی آگیا تھا چنانچہ آج اس کو بیان کرنے کا موقع ملا ہے تو بیان کرتا ہوں اور شروع ہی سے میں نے اطلاع بھی کر دی کہ میں یہ بیان کروں گا۔ میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف صاف کہدیتا ہوں تاکہ روح بیان اور خلاصہ کے علم سے باقی مضمون سہولت سے سمجھ میں آجائے۔ نیز اس میں چونکہ تفصیل بعد الاجمال ہوتی ہے اس لئے وہ اوقع فی النفس (دل میں زیادہ اترنے والا) بھی ہوتی ہے بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں بعض دفعہ بیان کرنے والا مقصود کو توطیہ و تمہید کے بعد ادا کرتا ہے اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مضمون مقصود کا اشتیاق رہتا ہے اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو

لے اس وقت بھی جبکہ میں یہ مقام لکھ رہا ہوں اتفاق سے بادل گھرا ہوا ہے اور بارش کی ضرورت ہے حق تعالیٰ شانہ امن وامان وعافیت ورحمت کی بارش نازل فرمائیں ۱۲ ظ

جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سن کر لوگوں پر گرانی نہ ہو اور بعض سامعین اُٹھ اٹھ کر نہ چلدیں جیساکہ چندہ کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا بلکہ اول مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس وغیرہ کا قیام ہے پھر کہتے ہیں کہ ان کا قیام سب مسلمانوں کی توجہ و ہمت سے ہوسکتا ہے۔ اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا۔ اول تو میں چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو اول ہی کہدیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے بیٹھے اور جس کا جی نہ چاہے اُٹھ کر چلا جائے میں چندہ کے مضمون کو تو طیہ و تمہید کے بعد اس لئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکا ہوتا ہے کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگا نہ جائے گا اور جب اخیر میں ان سے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائے گا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت نہ ضائع کرتے۔ دوسرے اس طرز سے تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور شور اس لئے تھا کہ ہمیں چندہ دو۔ سو میں مسلمانوں کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھوتا چاہتا ہوں جس مضمون کے متعلق مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سے بعض سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے ہی اس کو ظاہر کر دیتا ہوں اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا مطمئن ہوکر بیٹھے گا اور مجھ پر اس کے بیٹھے رہنے کا کچھ احسان نہ ہوگا اور نہ وہ میرے اجمال وابہام کی وجہ سے بندھے گا۔ ان وجوہ سے میں ابہام کو پسند نہیں کرتا اور اگر کسی کو توطیہ وتمہید سے صرف دفع وحشت عن المضمون مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود کے بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ دفع وحشت سامع بھی مطلوب ہے۔ مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں اس پیشہ والوں کی نیت توطیہ وتمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت مدنظر رکھتے ہیں۔

کہ کہیں لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہوجائے اس لئے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے وحشت نہ ہو مگر میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے وعظ کہے۔ اس کو تو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیے کہ ان کی اصلاح کس طرز پر زیادہ ہے چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنی مصالح کا لحاظ کر کے بیان کروں۔

ایک بار میں جودھپور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وعظ میں امام ابوحنیفہؒ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا کیونکہ یہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی جماعت کو ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں (یعنی غیر مقلدی کی طرف مائل سمجھتے ہیں ۱۲) میں نے کہا اب تو میں ہرگز یہ مضمون بیان نہیں کروں گا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے وعظ کہوں کہ بھائیو ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں تو یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی سامعین کی اس میں کیا مصلحت ہوئی۔ البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحبؒ سے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحبؒ کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی کہ ایک امام صاحب کے ساتھ بدگمانی کرنے سے لوگوں کو رکاوٹ ہو جاتی۔ مگر جب سامعین میں امام صاحبؒ سے غیر معتقد کوئی نہیں تو اب مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا بلکہ اس میں محض اپنی مصلحت رہ گئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے کوئی مضمون بیان کروں چنانچہ میں نے یہ مضمون (فضائل امام کا) نہیں بیان کیا بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لئے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں یہ بھی کہدیا کہ بعض خیر خواہوں کی یہ رائے تھی کہ آج فضائل امام ابوحنیفہ بیان کئے جائیں اور اس میں مصلحت یہ بتلائی گئی کہ مجھے یہاں پر کر بعض لوگ ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں تو ان کے اس خیال کی اصلاح ہو جائے گی۔ مگر میں اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنی نصرت

ومصلحت کے لئے مریضوں کی مصلحت کو فوت کروں فضائل امام کے بیان سے آپ
لوگوں کو کچھ نفع نہ ہوگا کیونکہ آپ میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں ہاں
بظاہر میرا ایک نفع تھا سو میں اپنے نفع کے واسطے بیان کرنا نہیں چاہتا وہ طبیب
طبیب نہیں جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنی مصالح کی رعایت رکھے (مثلاً ایسی دوائیں
لکھے جو اسی کے پاس ملتی ہوں ۱۲) اور مریض کی مصالح کو نظر انداز کردے اس لئے
میں اس مضمون کو چھوڑ کر وہ مضمون اختیار کرتا ہوں جو آپ کے لئے نافع ہے اور
جو کچھ بیان کروں گا قرآن وحدیث سے بیان کروں گا جس پر ہر مسلمان عمل کرنے کا
طالب ہے اس لئے آپ مضمون پر نظر رکھیں اس کو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا
کیسا ہے۔ میرے اندر ہزاروں عیوب سہی لیکن ان شاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا
جو آپ کے واسطے نافع ہے اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو خالی الذہن
ہو کر سن لو پھر خود غور کرو یا جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کر لو اس کے بعد
بھی اگر غلطی ہوگی معذور رہو اس کے بعد پھر جو بیان ہوا تو سامعین پر بہت بڑا
اثر ہوا۔

تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطب کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائے گا تو اس کا
ضرور اثر ہوگا اس لئے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت وضرورت کا لحاظ رکھتا
ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا۔ اسی لئے میں نے اس وقت یہ مضمون
"حقوق العباد" کا اختیار کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اس مقام پر یہ سامعین
کی مصلحت وضرورت کا مضمون ہے شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ یہ تو پھیکا
مضمون ہوگا، تو صاحب بیان تو علاج ہے اور علاج و دوا میں یہ نہیں دیکھا جاتا
کہ یہ دوا پھیکی ہے یا میٹھی بلکہ ضرورت اور نفع کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی دوا پھیکی
ہی ہو یا اس سے بڑھ کر یہ کہ کڑوی ہو مگر ضرورت کے موافق کہ اس سے زیادہ
نافع کوئی دوا نہ ہو تو بتلائیے اس وقت اس کو ترجیح ہوگی یا اس میٹھی دوا کو جو نہ
ضرورت کے موافق ہے نہ زیادہ نافع ہے اس لئے اس کو مت دیکھو کہ یہ مضمون

پھیکا ہے یا جوشیلا بلکہ اس کو دیکھئے کہ یہ آپ کی ضرورت کا بھی ہے یا نہیں سو ضرورت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ دیندار لوگ بھی عبادات میں تو فرائض و واجبات بلکہ مستحبات تک کا اہتمام کرتے ہیں یعنی جو لوگ کام کرنے والے ہیں اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں کہ سب ہی اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں مگر جو کام کرنے والے ہیں وہ عبادات میں تو فرائض و واجبات کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں مستحبات کی بھی پابندی کرتے ہیں درود شریف اور تسبیحات حتیٰ کہ دلائل الخیرات اور وظائف تک کا اہتمام کرتے ہیں اور گو یہ دلائل و حزب برکت کی چیزیں ہیں اور ان میں ثواب بھی ہے مگر دلائل الخیرات اور حزب البحر وغیرہ یہ جتنے وظائف آجکل معمول بہا ہیں حدیث کے اوراد کے برابر ہرگز نہیں ہیں غرض بعض لوگ ان زوائد کے پابند ہیں مگر حقوق العباد کا ان کو بھی خیال نہیں۔ بس آجکل لوگوں نے محض نوافل و تسبیحات پڑھنے کو دین داری سمجھ لیا ہے۔

حالانکہ اصل دینداری معاملات سے معلوم ہوتی ہے چنانچہ سلف کے نزدیک دینداری کا معیار زیادہ تر معاملات ہی تھے۔ صرف نماز و روزہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کے دیندار ہونے کا حکم نہ لگاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں مدعی کے پاس دو گواہ تھے۔ ایک گواہ کی عدالت تو حضرت عمرؓ کو معلوم تھی۔ دوسرے گواہ کی عدالت کا ان کو علم نہ تھا تو آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اس گواہ کی عدالت کے متعلق تم سے کوئی گواہی دیتا ہے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں اس کے عادل ہونے پر گواہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تجھ کو اس کا عادل ہونا کیسے معلوم ہوا "هَلْ جَاوَرْتَهُ أَمْ صَحِبْتَ مَعَهُ فِي السَّفَرِ الَّذِي يُسْفِرُ عَنِ الْحَقِيقَةِ الْمَرْءِ وَعَقَدْتَ مَعَهُ عَقْدًا" کیا تو اس کے پڑوس میں کبھی رہا ہے یا سفر میں کبھی تیرا اور اس کا ساتھ ہوا ہے جس سے انسان کی مخفی حقیقت ظاہر ہوتی ہے یا تو نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ بیع و شرا کا کیا ہے اس نے کہا نہیں قَالَ فَعَلَّكَ

دَاَیْتُہٗ خَارِجًا مِنَ الْمَسْجِدِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ" فرمایا تو شاید تم نے اس کو نماز پڑھ کر مسجد سے نکلتا ہوا دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے کہا جی ہاں۔ فرمایا "فَاَنْتَ لَا تَعْرِفُ" تم اس کو نہیں پہچانتے محض اتنی بات سے کسی کا دیندار اور عادل ہونا معلوم نہیں ہو سکتا تو دیکھئے حضرت عمرؓ نے محض نماز اور تسبیحات کو دینداری کے لئے کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ معاملات کی درستی کو بھی ضروری سمجھا مگر آج کل ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ دین کا ایسا ضروری جزو ہے کہ اس کے بدون آدمی گواہی دینے کے قابل نہیں ہوتا اس سے آپ کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ جس بات سے اتنی غفلت ہو کہ باوجود ضرورت کے لوگ اس کو ضروری نہ سمجھتے ہوں وہ بہت زیادہ اہتمام کے قابل ہوگا، اس لئے غور سے اس مضمون کو سننا چاہیئے گو اس میں لطف نہ آئے اور وہ مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے "حقوق العباد" کو بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے اور اس مرض کا ایک سبب ہے پہلے اس کو معلوم کر لینا چاہیئے اور سبب کے علم سے ایک گونہ ایک لوگوں کا عذر بھی معلوم ہو جائے گا۔ جن کی میں شکایت کر رہا ہوں اور عذر کے بعد ان کا جرم بھی ہلکا ہو جائے گا گو ان لوگوں کو اپنا عذر خود بھی معلوم نہیں مگر میں تبرعاً خود ان کا عذر بتلائے دیتا ہوں کیونکہ عذر کا جواب دے دینے سے پھر حجت تام ہو جاتی ہے اس لئے میں اتمام حجت کیلئے ان کا عذر بیان کر کے ان کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے سبب مرض کے جاننے سے مرض کا ازالہ بھی سہل ہو جائے گا کیونکہ ؎

اِنَّمَا الْاِصْلَاحُ تَبْدِیْلُ الْمِزَاجِ

اصلاح کا طریقہ یہی ہے کہ مریض کے مزاج کو بدل دیا جائے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جو سبب ہے اس کے مرض کا اس کو زائل کر دیا جائے تو سنئے کہ تاکد حق کے دو سبب ہوتے ہیں کبھی تو عظمت حق کی وجہ سے حق کا تاکد ہوتا ہے اور کبھی حاجت کی وجہ سے عظمت حق کی وجہ سے حق کا موکد ہونا تو ایسا ہے

جیسے باپ کسی کام کو کہے کہ یہ کر اور پڑوسی کہے کہ مت کر یہاں عقلاً اور شرعاً باپ کی اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ اس کی عظمت پڑوسی کی عظمت سے زیادہ ہے اس لئے پڑوسی کی بات پر عمل نہ کیا جائے گا بلکہ باپ کی بات پر عمل کیا جائیگا خواہ اس کام میں باپ کا ذاتی نفع بھی نہ ہو لیکن عظمت کی وجہ سے اس کی اطاعت پڑوسی کی اطاعت پر مقدم ہوگی۔ اور خواہ اس کا کچھ نفع ہو جیسے باپ کہے کہ میرا بدن دبا اور پڑوسی کہے کہ میرا بدن دبا تو بتلائیے اس صورت میں پڑوسی کا حق زیادہ ہوگا یا باپ کا۔ سب عقلاء یہاں متفق ہیں کہ باپ کا حق زیادہ ہے اور حاجت کی وجہ سے تاکد کی مثال یہ ہے جیسے ایک سائل آکر آپ سے روپیہ مانگے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میں برف کی قفلیاں کھاؤں گا (جیسا کہ بعض بھنگڑ رئیسوں سے ایسی فرمائش کیا کرتے ہیں اور وہ ان کو مجذوب سمجھ کر سب کچھ کھلاتے ہیں ۱۲) اور ایک سائل آکر یہ کہے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میرے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ تو بتلائیے اس صورت میں کس کا حق زیادہ ہے آیا اس شخص کا جو برف کی قفلیاں کھانے کو روپیہ مانگتا ہے یا اس غریب کا جس کے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے یقیناً اس غریب فاقہ زدہ کا حق زیادہ ہے ایسے ہی ایک رئیس کے یہاں شادی ہو جس میں سو روپیہ نیوتہ میں دینے کے لئے آپ لے جا رہے ہوں حالانکہ اس کو آپ کے سو روپیہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں اور اسی وقت ایک غریب آدمی پر جو شریف خاندان کا ہے کوئی مقدمہ قائم ہوگیا جس میں ضمانت نہ داخل کی گئی تو اس شریف آدمی کی آبرو جاتی رہے گی تو بتلائیے اس وقت نیوتہ میں امیر کو سو روپیہ دینا چاہیئے جس کو کچھ بھی اس کی پروا نہیں یا اس غریب کی آبرو بچانی چاہیئے۔ تو جس کو حس ہوگا وہ سمجھے گا کہ اس صورت میں نیوتہ دینے سے زیادہ ضروری اس غریب کی آبرو کا بچانا ہے یہاں بھی حاجت کی وجہ سے حق کا تاکد ہوگیا غرض آپ دنیا کے معاملات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تاکد حق کا سبب کبھی عظمت ہے کبھی حاجت مگر دین کے بارے میں اس قاعدہ پر کوئی بھی

خیال نہیں کرتا یہاں سب لوگوں نے تاکد حق کو صرف عظمت میں منحصر کرلیا ہے جس کی عظمت قلب میں ہے اسی کے حقوق ادا کیتے ہیں حاجت کو تاکد حق کا سبب نہیں سمجھتے اور اگر حاجت کی وجہ سے کسی کا حق ادا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی جب کہ اپنے ملنے والوں میں سے کسی امیر کو حاجت پیش آ جاوے۔ باقی غریب کی حاجت تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ آجکل غریب ہونا بھی ایک جرم ہے۔ خصوصاً اس چودھویں صدی میں چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ آجکل غریبوں کی ایسی حقارت ہے کہ کسی امیر کی ریح صادر ہوجاوے تو تبارک سلامت ہوتی ہے کہ صحت ہوئی۔ اور غریب کی ریح صادر ہو تو کہا جاتا ہے کہ دماغ سڑادیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غریبوں کی روح کی بھی وہ قیمت نہیں جو امیروں کی ریح کی ہے۔ چنانچہ غریب کے مرنے کا لوگوں کو اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا کسی امیر کی ریح بند ہوجانے کا ہوتا ہے۔

کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے محلہ میں سے کسی کے رونے چلانے کی آواز سنی تو ماما سے کہا دیکھنا کیا بات ہے اس نے کہا کہ محلہ میں فلاں غریب آدمی مرگیا ہے۔ اس کے بیوی بچے رو رہے ہیں تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں اوئی میں تو یہ سمجھی تھی کوئی آدمی بیمار ہوگیا ہے (یعنی کوئی رئیس) گویا ان کے نزدیک وہ غریب تو آدمی ہی نہیں۔ غربا تو ان کے نزدیک گدھے ہی ہیں۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ امیروں کے بیمار ہونے سے بھی رنج ہوتا ہے اور غریبوں کے مرنے کی بھی پروا نہیں یہی وجہ ہے کہ امیروں کو ذرا کام بھی ہو جائے تو سو آدمی ان کی عیادت کو آتے ہیں اور کوئی غریب مرجاوے تو اس کی بیوی بچوں کی تعزیت کو بھی کوئی نہیں جاتا الا القلیل اور بعض لوگ تھوڑے سے غریبوں کی بھی کچھ ہمدردی کرتے ہیں بشرطیکہ مسلمان ہو اور اگر مسلمان نہ ہو بلکہ ہندو ہو جیسے چمار بھنگی تو اس کے حقوق تو سمجھتے ہی نہیں وہ تو گویا بہائم ہیں کہ جو چاہا انھیں کہدیا اور جس طرح چاہا مار پیٹ لیا۔ اور صاحبو! اس وقت کیا ہوگا جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بہائم کے بھی حقوق ہیں میرا ارادہ ہوا تھا کہ اس وقت حقوق العباد کے بجائے حقوق الخلق بیان کروں جس میں

تمام مخلوق کے حقوق کا بیان ہو جائے کافروں کے بھی اور جانوروں کے بھی مگر سارا قاعدہ بغدادی آج ہی کیونکر ختم کرا دوں اس لئے میں حقوق بہائم کی تفصیل کرنا نہیں چاہتا مگر اجمالاً کہے دیتا ہوں کہ شریعت میں جانوروں کے بھی حقوق ہیں ان انسانوں کے حقوق کیوں نہ ہوں گے جن کو آپ جانور سمجھتے ہیں۔

پس خوب سمجھ لو کہ غریب اگر کافر بھی ہو اس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی مسلمان فاسق و فاجر ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں۔ گناہ کرنے سے یا کفر کرنے سے وہ وقف نہیں ہو گیا کہ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ معاملہ کریں ایک بزرگ نے کسی شخص کو حجاج بن یوسف کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا تھا تو فرمایا جس طرح حق تعالیٰ حجاج سے ان لوگوں کا بدلہ لے گا جن پر اس نے ظلم کیا تھا ایسے ہی حجاج کا بدلہ ان لوگوں سے لے گا جنھوں نے اس کی غیبت وغیرہ کی ہو گی۔ حجاج خدا کی نافرمانی کرنے کے سبب کے لئے وقف نہیں ہو گیا کہ جو بھی چاہے اس کو برا بھلا کہے۔

سبحان اللہ ایسا کون قانون ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہوں۔ یہ خدا ہی کا قانون ہے جس میں باغیوں تک کے حقوق ہیں حتیٰ کہ کافروں کے بھی حقوق ہیں چنانچہ بیٹے کو جائز نہیں کہ وہ جہاد میں اپنے کافر باپ کو قتل کرے گو وہ خدا کا باغی ہے مگر خدا تعالیٰ نے بیٹے پر اس کا یہ حق رکھا ہے۔ غرض ہم لوگوں نے تاکدِ حق کا سبب محض عظمت کو سمجھ لیا ہے۔ اور یہ مرض دینداروں میں بھی ہے کہ وہ بھی اہل عظمت ہی کے حقوق کو زیادہ ادا کرتے ہیں میں نے ایک دفعہ دیوبند کے مدرسہ میں طلبہ سے کہا تھا کہ تم لوگ اساتذہ کی عظمت نہیں کرتے نہ ان کے حقوق کی رعایت کرتے ہو پھر میں نے کہا کہ شاید آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ ہم تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی بہت عظمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت بھی کرتے ہیں تو ذرا دل میں غور کر لو کہ مولانا کی یہ عظمت و خدمت محض استاد ہونے کی وجہ سے ہے یا ان کی شہرت و عظمت کی وجہ سے ہے ظاہر ہے کہ محض حق استادی کی وجہ سے تم مولانا کی عظمت نہیں کرتے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ اور استادوں کی

عظمت و وقعت نہیں کی جاتی آخر وہ بھی تو استاد ہیں معلوم ہوا کہ مولانا
کی عظمت بوجہ شہرت کے کرتے ہو کہ وہ سب سے زیادہ بزرگی وغیرہ میں مشہور
ہیں تو جب اہل علم میں بھی یہ مرض ہے کہ وہ مشاہیر اہل عظمت ہی کے حقوق ادا
کرتے ہیں پھر دوسروں کا تو کیا کہنا غرض اس غلطی میں قریب قریب سب ہی
مبتلا ہیں کہ لوگوں نے تاکد حق کے مدار کو عظمت ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ حقوق اللہ کی تو کچھ رعایت کی بھی جاتی ہے اور حقوق العباد کی رعایت
بالکل نہیں کی جاتی۔ کیونکہ عظمت کے لحاظ سے بندہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں
حق تعالیٰ کی وہ عظمت ہے کہ اس کے سامنے بندہ مِنْ حَیْثُ هُوَ بندہ (اس
حیثیت سے کہ وہ بندہ ہے) کچھ عظمت نہیں رکھتا بندہ چاہے کیسا ہی عظیم ہو
حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت مٹ جاتی ہے جیسے آفتاب
کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی مٹ جاتی ہے حالانکہ اس وقت آفتاب
پر بادل بھی آرہا ہے مگر چاند ستاروں کے مٹانے کے لئے وہ اب بھی کافی ہے

چو سلطان عزت علم بر کشد
جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

دیکھئے جگنو رات کو تو چمکتا ہے مگر دن کو نہیں چمکتا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تو
دن میں کہاں رہتا ہے جو نظر نہیں آتا کہا میں تو دن میں اسی جگہ رہتا ہوں
جہاں رات کو سوتا ہوں مگر دن میں آفتاب کے سامنے چمک نہیں سکتا
شیخ سعدی اسی کو فرماتے ہیں

نگہ دیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد ہمی کرمکے چوں چراغ
کسے گفتش اے کرمک شب فروز — چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ آں کرمک پاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بصحرا نیم — ولے پیش خورشید پیدا نیم

(ترجمہ) (شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ باغ وصحرا میں رات کے وقت جگنو مثل چراغ
کے چمکتا ہے تو اس سے کسی نے پوچھا تو دن میں کیوں نہیں نکلتا دیکھو اس خاک زاد
کیڑے نے کیسا بصیرت افروز جواب دیا کہ میں رات دن ہیں صحرا میں رہتا ہوں
مگر آفتاب کے سامنے گم ہو جاتا ہوں)

اسی لئے حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا کہ عزت وعظمت بتمامہا حق تعالیٰ کے لئے ہے اس کی عظمت کے سامنے کسی کی کچھ عظمت نہیں اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری جگہ تو حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور مومنین کے لئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی عظمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں عزت بالذات کا ذکر ہے اور دوسری جگہ عام ہے۔ بالذات اور بالواسطہ کو پس حاصل یہ ہوا کہ عزت بالذات تو بتمامہا اللہ ہی کے لئے ہے اور عزت بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ہے غرض بالذات اور بالعرض کا فرق ہے بالذات کے درجہ میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی کے لئے بھی عظمت نہیں انسان چاہے کتنا ہی بڑا عظیم ہو اس کی عظمت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے جو کہ عظمت الٰہی کے سامنے سلب ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہ بات ہے جس کو مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا جس پر آج اعتراض ہو رہے ہیں انھوں نے بھی وہی کہا ہے جو فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (عزت بتمامہا اللہ ہی کے لئے ہے) سے مفہوم ہو رہا ہے اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ نے فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا عربی میں فرمایا ہے اور مولانا شہیدؒ نے اسی مضمون کو اردو میں کہدیا ہے باقی بات ایک ہی ہے زبان بدلنے سے حکم نہیں بدل جاتا زبان تو وہ چیز ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کا کچھ بھی اعتبار نہیں ان کی نظر تو حقیقت پر رہتی ہے، اور یہی حال اہل اللہ کا ہے ہمارے حاجی صاحب قدس سرہٗ کے پاس ایک رومی شیخ آئے تھے اس وقت حاجی صاحب

مثنوی کا درس دے رہے تھے اور حاجی صاحبؒ کی عادت تھی کہ تقریر اردو میں فرمایا کرتے تھے گو حضرت کو فارسی پر بھی پوری قدرت تھی اور وہ شیخ فارسی سمجھ بھی لیتے مگر بے تکلف زبان اردو ہی تھی اس لئے اپنی ہی زبان میں تقریر فرمارہے تھے مگر باایں ہمہ وہ شیخ رومی درس سے محظوظ ہو رہے تھے۔ حالانکہ وہ اردو بالکل نہ سمجھتے تھے درس کے وقت کسی خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو انھیں کتنا لطف آتا جو بغیر سمجھے بھی اس قدر محظوظ ہو رہے تھے۔ حاجی صاحب نے فرمایا میاں ان مضامین کے لئے اس زبان کی قید نہیں وہاں تو کوئی دوسری ہی زبان ہے۔ پھر مولانا کے یہ شعر پڑھے ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است　　　عشق را خود صد زبان دیگر است

بوئے آں دلبر چو پرّاں می شود　　　ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(فارسی میں کہو اگرچہ عربی بہتر ہے عشق کی خود سیکڑوں زبانیں دوسری ہیں اس دلبر کی بو جب اڑتی ہے یہ تمام زبانیں حیران ہوتی ہیں۔)

بلکہ بعض اوقات بے زبانی میں وہ اثر ہوتا ہے جو زبان دانی میں نہیں ہوتا میں نے ابھی (وعظ سے پہلے) مجمع احباب میں کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک ڈپٹی صاحب مجھ سے ملے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں میں اخلاق کے ساتھ کھل کر ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو میں اور خواجہ صاحب اور چند رفقاء نماز کے اہتمام میں مشغول ہو گئے۔ وہ ڈپٹی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے ویسے ہی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ خواجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ان ڈپٹی صاحب کو نماز کے لئے کہنا چاہئے کیونکہ یہ آپ سے محبت ظاہر کرتے ہیں آپکا کہنا ان کو ناگوار بھی نہ ہوگا اور امید ہے کہ اثر بھی زیادہ ہوگا اور باوجود قدرت کے امر بالمعروف کو ترک کرنا شاید نامناسب ہو۔ میں نے کہا کہ امر بالمعروف اس موقعہ میں واجب نہیں کیونکہ ان کو نماز کا فرض ہونا معلوم ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ چند آدمی نماز کو اٹھے ہیں اب بھی اگر ان کو توفیق نہ ہو تو یہ ان کی کوتاہی ہے

باقی میں تو زبان سے کچھ نہ کہوں گا کیونکہ میرے کہنے سے اگر انھوں نے نماز پڑھ بھی لی تو پڑھیں گے اپنے واسطے اور احسان ہوگا میری گردن پر سو مجھے تو اس سے غیرت آتی ہے کہ دین کے کام میں ان کا احسان اپنے سر لوں اگر آپ کو امر بالمعروف کا ایسا ہی جوش ہے تو آپ خود کیوں نہیں کہتے ؟ باقی میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اس وقت نماز کیلئے کہنے کا ان پر وہ اثر نہ ہوگا جو نہ کہنے کا اثر ہوگا۔

غیر خواجہ صاحب نے بھی ان سے کچھ نہ کہا اور میں نماز پڑھ کر ان کے پاس آبیٹھا اور جس بشاشت سے پہلے باتیں کر رہا تھا اسی بشاشت سے اب بھی کرنے لگا میں نے ظاہری برتاؤ سے یہ بات بالکل ان پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ مجھے آپ کے نماز نہ پڑھنے سے انقباض ہوا یا آپ کی حقارت میرے دل میں ہے ہرگز نہیں اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا اور ہم اسی طرح نماز کو اٹھے اور بعد نماز کے میں پھر انھیں ڈپٹی صاحب کے پاس آبیٹھا اور اسی نشاط سے پھر باتیں کرنے لگا اس کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا' اور وہ نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ اور ایک صاحب سے کہتے تھے کہ صاحب ریل کے سفر میں جب مولانا نماز کو اٹھے اور میں نہیں اٹھا تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے سر پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ اور غضب یہ کہ مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ بھی زبان سے یہ نہ فرمایا کہ آؤ تم بھی نماز پڑھ لو (اگر یہ فرما دیتے تو میں کچھ عذر ہی کر دیتا جس سے شرمندگی کم ہو جاتی ۱۲) اور اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید اب نماز پڑھ کر جو مولانا آئیں گے تو نہ میرے پاس بیٹھیں گے نہ مجھ سے بات کریں گے مگر جب وہ نماز سے فارغ ہو کر بدستور میرے پاس آبیٹھے اور اسی بشاشت سے گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے تو واللہ اس ادا نے تو مجھے ذبح ہی کر ڈالا۔ بھائی اس روز سے میں نماز کا پورا پابند ہو گیا ہوں۔

راوی نے جب ان کا یہ قول مجھ سے نقل کیا تو میں نے لوگوں سے کہا بتلاؤ اس وقت امر بالمعروف کا زیادہ اثر ہوتا یا خاموش رہنے کا زیادہ اثر ہوا۔ امر بالمعروف سے اتنا ہو جاتا کہ وہ صرف اس وقت نماز پڑھ لیتے مگر یہ جو اثر ہوا کہ وہ شرمندگی سے ذبح

ہو ہو گئے اور عمر بھر کے لئے نمازی بن گئے یہ بے زبانی ہی کا اثر تھا تو دیکھئے اس وقت ان کو کچھ نہ کہنے کا وہ اثر ہوا جو کہنے سے نہ ہوتا۔ یہاں بے زبانی سے زیادہ اثر ہوا اور واقعی گو میں نے اُن کو زبان سے نماز کے لئے نہ کہا تھا مگر دل میں یہی نیت تھی کہ ان شاء اللہ میرے سکوت سے ان پر زیادہ اثر ہوگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا واقعی حکیم ہر کام کا موقعہ خوب سمجھتا ہے۔ سیاست اسی کا نام ہے کہ ہر شخص کی تربیت اس کے مناسب طریق سے کی جائے اور یہ بات حضرت اقدس میں باکمل وجوہ بحمد اللہ نمایاں ہے فللہ درہ من حکیم ۱۲ جامع)

غرض کبھی بے زبانی بھی زبان سے زیادہ کام دیتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ زبان پر اثر کا مدار نہیں پس محض زبان کے بدلنے سے دوسرا اثر لے لینا عجیب بات ہے جو لوگوں کی کم فہمی پر دال ہے۔

ہمارے ملنے والوں میں ایک بزرگ تھے امیر شاہ خاں صاحب وہ پُرانے بزرگوں کے دیکھنے والے تھے تحریکات حاضرہ میں ان کی رائے وہی تھی جو میری رائے ہے۔ ان کا قیام مینڈھو میں رہتا تھا جہاں کچھ دنوں سے مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی بھی مدرس ہو کر پہنچ گئے ہیں ان کی رائے بھی تحریکات حاضرہ میں میرے موافق ہے (بلکہ وہ ہم سے بھی زیادہ پختہ ہیں ۱۲ جامع) مگر لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مولوی حبیب احمد صاحب کی باتوں پر تو اعتراض کرتے تھے اور امیر شاہ خاں صاحب سے خوش تھے۔ ایک مرتبہ امیر شاہ خاں صاحب نے مجھے لکھا کہ میرا مسلک بھی وہی ہے جو مولوی حبیب احمد صاحب کا ہے جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اردو میں کہتے ہیں اور میں فارسی میں کہتا ہوں اس لئے لوگ میری باتوں سے متوحش نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض و طعن کرتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ تو حقیقت میں یہ عوام کی کم فہمی ہے ورنہ خدا تعالٰی کے یہاں زبان کی کچھ قید نہیں اس لئے زبان کے بدلنے سے شرعاً حکم نہیں بدل جاتا۔ چنانچہ مولانا شہیدؒ بھی حقیقت میں وہی کہتے تھے جو حق تعالٰی نے فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا

(تمام کی تمام عزت اللہ ہی کے لئے ہے) میں فرمایا ہے۔ مگر انھوں نے اس کو اردو میں کہدیا اس سے لوگ متوحش ہونے لگے اور بے چاروں پر فتویٰ لگانے لگے بہر حال چونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے بندہ کی عظمت کچھ بھی نہیں اس لئے لوگوں کو حقوق العباد کا اہتمام نہیں کہ وہ صاحب عظمت نہیں مگر میں نے بتلا دیا ہے کہ تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے پس حقوق اللہ کا تاکد تو عظمت کی وجہ سے ہے اور حقوق العبد کا تاکد حاجت کی وجہ سے ہے فقہاء نے اس کو سمجھا ہے اور واقعی فقہا حکمائے امت ہیں اسی طرح صوفیہ بھی اور فقہ کی تعریف تصوف کو بھی شامل ہے۔ سلف میں فقہ فقط احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ احکام ظاہرہ و باطنہ کے علم کو فقہ کہتے تھے چنانچہ امام صاحب نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے "مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا (نفس کا پہچاننا نفع اور نقصان کی باتوں کو) جس میں تصوف بھی داخل ہے تو فقہا جا بجا فرماتے ہیں "حَقُّ الْعَبْدِ مُقَدَّمٌ عَلٰی حَقِّ اللهِ" کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ عظمت کی وجہ سے ایسا ہے بلکہ احتیاج کی وجہ سے حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہا گیا ہے کیونکہ بندہ محتاج ہے اور حق تعالیٰ احتیاج سے بری ہیں مگر فقہاء کا یہ جملہ ظاہر میں ایسا وحشت ناک ہے کہ اگر کوئی صوفی ایسا کہدیتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے مگر فقہا نے کے دھڑ

ف میں کہتا ہوں کہ حفظ الایمان کی عبارت دربارہ مسئلہ علم غیب پر جو اہل بدعت نے شور مچایا ہے اسکی بھی یہی اصل ہے کہ مضمون حفظ الایمان کا وہی ہے جو شرح مقاصد و شرح مواقف وغیرہ میں سلف نے بیان فرمایا ہے بلکہ ان کے الفاظ سے حفظ الایمان کے الفاظ بہت کم ہیں مگر سلف نے عربی میں کہا تھا اس لئے ان پر کچھ اعتراض نہ ہوا اور حفظ الایمان میں وہی مسئلہ اردو میں ظاہر کیا گیا تو شور و شغب ہونے لگا۔ اسی طرح بہشتی زیور کا مسئلہ سب کتب فقہ میں مصرح ہے عالمگیری اور در مختار ملاحظہ ہو مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کیونکہ انھوں نے عربی میں لکھا ہے اور بہشتی زیور پر بعض علماء کا لجہلا نے خوامخواہ زبان طعن دراز کی ہے۔ خدا ان کو ہدایت دے ۱۲ جامع

فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے کیونکہ وہ منتظم ہیں ان کو حقوق کا انتظام کرنا ہے اور واقعی حقوق العباد کا اہتمام بدون اس طرح صاف صاف کہے نہیں ہوسکتا تھا مگر ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتا لوگ ان کو قانونی سمجھتے ہیں اس لئے ان سے ڈرتے ہیں جانتے ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کیا گیا تو جھاڑ کی طرح پیچھے لگ جائیں گے اور ایک مسئلہ کے ثابت کرنے کو رسالے کے رسالے تصنیف کر دیں گے اور صوفیہ بیچارے غریب ہیں کسی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے اس لئے ان کو سب دباتے ہیں۔ اور ان کی بات بات پر فتوے لگائے جاتے ہیں وہ تو ایسے غریب ہیں کہ کوئی ان کو غریب کہہ بھی دے تب بھی برا نہیں مانتے۔ اور ذرا اہل ظاہر کو تو غریب کہہ دو دیکھو کیسے چڑتے ہیں۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نواب نے کسی مصلحت سے ایک گنوار کو مجسٹریٹ بنا دیا تھا وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے لگا ایک دفعہ کسی نے عرضی پیش کی تو اس میں لکھا تھا غریب پرور سلامت تو آپ بہت برہم ہوئے اور کہا نواب صاحب تو ہم کو مسفق (بسین مہملہ) مہربان لکھتے ہیں اور یہ نالائق ہم کو گریب (یعنی غریب ۱۲) لکھتا ہے۔ اچھا پانچ روپیہ جرمانہ اُس الو کی سمجھ میں غریب ہی آیا پرور کو وہ سمجھا ہی نہیں اور شاید یہ خیال کیا ہو کہ پرور بھی کوئی تحقیر کا لفظ ہوگا جبھی تو غریب کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ غرض آجکل غریب کہنے سے بھی لوگ چڑتے ہیں مگر صوفیہ اس سے بھی برا نہیں مانتے بلکہ اگر کوئی ان کو جاہل بھی کہہ دے جب بھی بُرا نہیں مانتے کیمیا گر کو اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اسے کیمیا نہیں آتی ویسے ہی جھوٹ موٹ کیمیا گر بنا ہوا ہے تو وہ کبھی ناخوش نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا کہ اچھا ہے لوگ یوں ہی سمجھتے رہیں تاکہ میں پولیس کی دست برد سے بچا رہوں اسی طرح کسی صوفی کو کوئی جاہل کہہ دے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا میں رجوع خلائق سے بچا ورنہ لوگ ہجوم کر کے خلوت مع المحبوب سے روک دیتے اور اگر کبھی ان کو جواب کا جوش بھی ہوتا ہے تو اندر سے کوئی یوں کہتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق مستی ، بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اس کو خود پرستی اور تکبر میں مرنے دو)

غرض صوفیہ حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہدیتے ہیں تو ان پر فتویٰ لگ جاتا مگر فقہار کو کوئی کچھ نہیں کہتا وہ صاف کہتے ہیں کہ حق العبد مقدم علی حق اللہ اور منشا اس کا صرف یہی ہے کہ بندہ محتاج ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج سے حقوق اللہ کو ترک کر کے حقوق العباد ہی کو لیلو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں دونوں میں تعارض ہو وہاں حق العبد مقدم ہے اور یہ بھی شریعت کا حکم اور حق اللہ ہی ہے اور جہاں تعارض نہ ہو وہاں ہر ایک کو اپنے اپنے موقعہ پر ادا کرنا چاہیئے۔

دیکھو اگر باپ بیٹے سے یوں کہے کہ کھانا کھالے اور ماں کہے کہ پانی پی لے تو اس وقت ان دونوں باتوں پر عمل کیا جائے گا کیونکہ دونوں میں تعارض کچھ نہیں دونوں کا جمع ممکن ہے اور اگر باپ کہے کہ پہلے نمکین کھاؤ اور ماں کہے کہ پہلے میٹھا کھاؤ تو یہاں البتہ سوال ہوگا کہ دونوں میں سے کس کا حق ادا کیا جائے۔ غرض مقدم و موخر کو وہیں دیکھا جاتا ہے جہاں تعارض ہو اور عدم تعارض کے وقت دونوں کو اختیار کیا جاتا ہے بس اب بتلاؤ کہ نماز پڑھنے اور قرض ادا کرنے میں کیا تعارض ہے کچھ بھی نہیں۔ پس دونوں کو بجالاؤ نماز بھی پڑھو اور قرض بھی دو تعارض کی صورت یہی ہے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے ہیں جن پر سال بھی گذر گیا ہے تو قاعدہ سے اس میں دو روپے آٹھ آنے زکوٰۃ کے واجب ہونے چاہئیں مگر اس شخص پر کسی کا دین بھی ہے تو اس وقت حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم پر کسی کا دین ہے تو پہلے بندہ کا حق ادا کرو زکوٰۃ ساقط ہے یہاں فقہا فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے اور یہ بھی حقیقت میں حق اللہ ہی ہے کیونکہ بندوں کے حقوق کا ادا کرنا حق تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے تو لازم ہے حق تعالےٰ نے خود حکم دیا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرو اس بنا پر یوں کہنا چاہیئے کہ اس وقت ایک حق اللہ دوسرے حق اللہ پر مقدم ہو گیا اس لئے حق اللہ و حق العبد میں تعارض بھی نہیں مگر چونکہ ظاہر میں وہ حق العبد معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے مگر یہ محض ظاہری تقدیم ہے اور ایک حقیقت کی بنا پر

یہ ظاہری تقدیم بھی رفع ہو جاتی ہے اور وہ حقیقت حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی ہیں میں نے منقول کہیں نہیں دیکھا وہ یہ کہ حق اللہ سے مراد حق النفس ہے کیونکہ جن امور کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ طاعات و عبادات ہیں اور ظاہر ہے کہ بندہ کے افعال سے حق تعالیٰ کا نہ کوئی نفع ہے نہ ضرر ہے بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے۔ تو یقیناً حق اللہ میں جو اضافت ہے یہ اضافت نفع یا ضرر کی نہیں ہو سکتی جیسا کہ حق العبد میں اضافت نفع یا ضرر کے لئے ہے کہ وہ ایسا حق ہے جس کا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات و عبادات ایسا حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا خدا کو نافع اور تلف کرنا ان کو مضر ہے (نعوذ باللہ) پس میرے نزدیک حق اللہ سے مراد حق النفس ہے اور حق العبد سے مراد حق الغیر ہے اس تفسیر پر دونوں جگہ اضافت یکساں ہو گی۔ یعنی ہر جگہ اضافت نفع و ضرر ہے پس حق اللہ یعنی حق النفس تو وہ ہے جس کا ادا کرنا اپنے آپ کو نافع اور ضائع کرنا اپنے آپ کو مضر ہے اور حق العبد یعنی حق الغیر وہ ہے جس کا ادا کرنا دوسروں کو نافع اور تلف کرنا دوسروں کو مضر ہے۔

پس اس تفسیر پر حق اللہ و حق العبد میں کہیں تعارض نہیں ہوا اور جو اشکال حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کرنے میں ہوتا تھا وہ بھی نہ رہا کیونکہ اس تفسیر پر جس کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں حق النفس ہے پس جہاں حق اللہ پر حق العبد کو مقدم کیا جاتا ہے وہاں درحقیقت حق الغیر کو حق النفس پر مقدم کیا گیا ہے اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں بلکہ یہ تو ایثار ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے " ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔ (وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بھوکے رہیں) اس میں حق تعالےٰ نے بعض صحابہ کی (یعنی حضرت ابوطلحہؓ کی) مدح فرمائی ہے کہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں۔

ان کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو اپنے

گھر لے آئے تھے اور انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں ان سے کوئی چیز بچانا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے گھر تو آج اتنا ہی کھانا ہے جو صرف بچوں کو کافی ہو سکتا ہے۔ تو حضرت ابو طلحہؓ نے فرمایا کہ پھر تم بچوں کو تو بہلا پھسلا کر سلا دینا اور ہم دونوں بھی کھائیں گے نہیں جو کچھ کھانا تیار رہے سب مہمانوں کے سامنے رکھدینا مگر وہ مہمان ایسے ہیں کہ بدون ہمارے کھائے کچھ کھائیں گے نہیں، تو تم یہ کام کرنا کہ جس وقت مہمان گھر میں آئیں اسی وقت چراغ گل کر دینا پھر میں کہدوں گا کہ چراغ گُل ہو گیا ہے اور روشن کرنے کا سامان اس وقت دشوار ہے (کیونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی کہاں تھی چقماق وغیرہ سے کام کرتے تھے ۱۲) اس لئے اندھیرے ہی میں کھانا کھالیجئے ہم بھی ان کے دکھلانے کو ساتھ بیٹھ جائیں گے اور منہ چلاتے رہیں گے تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ بھی کھا رہے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا کہ دونوں میاں بیوی خود بھوکے رہے اور مہمانوں کو کھلا دیا۔ یہ ایثار ہے جس پر حق تعالے نے ان کی مدح فرمائی ہے صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام رہتا ہے وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کریں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں مگر اس واقعہ مذکورہ پر ایک اشکال ہے میں اس کو بھی رفع کئے دیتا ہوں ان علماء وطلباء کی بڑی مشکل ہے ان کو ہر جگہ شبہے پڑتے ہیں اور ہمیں صوفیہ کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہم ان کو بھی مجتہد وفقیہ سمجھتے ہیں اس لئے اس کا بھی خیال رہتا ہے کہ ان کا فعل خلاف شرع نہ ہو۔ چنانچہ ایثار کرنا صوفیہ کا طرز ہے اور اس لئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان صحابی نے (جن کا واقعہ شان نزول میں مذکور ہوا ہے) مہمانوں کو اپنے نفس پر اور بچوں پر جو مقدم کیا تو یہ جائز کہاں تھا کیوں کہ اپنے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے) اس کا جواب علماء اہل ظاہری نے بہت اچھا دیا ہے کہ ان کو اس درجہ کی بھوک نہ تھی جیسی

مہمانوں کو بھی (یعنی انھوں نے اپنے نفس کے حق کو ضائع نہیں کیا بلکہ یوں کہو کہ اپنے کو زیادہ راحت نہیں دی کہ اس میں کچھ اشکال نہیں کہ دوسرے کی کلفت رفع کرنے کو اپنی راحت میں کچھ کمی کر دی جائے۔) اب یہ شبہ رہا کہ پھر بچوں پر مہمانوں کو کیسے مقدم کیا۔ ان کی تو اجازت بھی معتبر نہ تھی اس کا جواب دیا گیا ہے کہ بچوں کو بھوک نہ تھی وہ تمھارے بچوں کی طرح نہ تھے جن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور اس بات کو ماں باپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بچہ کو بھوک ہے یا محض کھانا دیکھ کر حرص کرنے لگے گا۔ تو حضرت ابوطلحہؓ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بچوں کو بھوک نہیں ہے۔ وقت پر اچھی طرح کھا چکے ہیں اور رات کو نہ کھانے سے انھیں کلفت نہ ہو گی۔ اس لئے بہلا پھسلا کر سُلوا دیا۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت طلحہؓ کے نزدیک بچے بھوکے نہ تھے محض حرص ہی کا درجہ باقی تھا اس کا جواب یہ ہے کہ معقول پڑھ کر آؤ تو معلوم ہو گا دلیل مستدل کے ذمہ ہے یا مانع کے ظاہر ہے کہ مانع کے ذمہ دلیل نہیں بلکہ منع کے لئے ابدار احتمال کافی ہے اب مستدل کا فرض یہ ہے کہ اگر اس کو یہ احتمال تسلیم نہ ہو تو دلیل سے اس کو باطل کرے غرض فقہار نے جو یہ فرمایا ہے کہ "حق العبد مقدم علی حق اللہ" درحقیقت اس میں ایثار کی تعلیم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق پر غیر کے حقوق کو مقدم کرنا چاہیئے فقہار اس کو اس عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ اس کو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں حاصل دونوں کا ایک ہی ہے اتنا فرق ہے کہ فقہار نے صرف معاملات میں اس کا اہتمام کیا ہے اور صوفیہ نے ہر امر میں اس کی سعی کی ہے حتیٰ کہ عبادات میں بھی فرائض و واجبات کے اندر تو نہیں مگر مستحبات و فضائل میں وہ ایثار کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی کوئی صوفی صف اول میں کھڑا ہو جائے اس کے بعد کوئی بزرگ آجائیں استاد یا شیخ تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنے بزرگ کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات خاص حالات میں صف اول میں دائیں جانب کھڑا ہونے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ بائیں جانب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

اور عام عادت یہ ہے کہ لوگ صف اول میں دائیں طرف کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ بائیں طرف بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے دائیں طرف کو بائیں طرف سے مطلقاً فضیلت نہیں بلکہ مدار قرب امام پر ہے پس سب سے افضل تو وہ شخص ہے جو امام کے پیچھے ہے اس کے بعد وہ افضل ہے جو اس کے دائیں طرف ہو پھر وہ جو اس کے بائیں طرف ہو۔ اسی طرح جب اس کے بعد ایک آدمی دائیں طرف اور آجاوے تو اب دوسرے کو بائیں طرف کھڑا ہونا چاہیئے اس وقت اس کا بائیں طرف ہونا دائیں طرف کھڑے ہونے سے افضل ہے کیونکہ اس صورت میں بائیں طرف ہو کر یہ امام سے زیادہ قریب ہوگا اور دائیں طرف کھڑا ہونے سے بعد ہو جائے گا۔ غرض بائیں طرف کھڑا ہونے سے اگر امام کے اور اس کے درمیان میں چار آدمی کا واسطہ ہو اور بائیں طرف ہونے سے پانچ کا واسطہ ہو تو اس وقت بائیں جانب کھڑا ہونا افضل ہوگا وعلی ہذا القیاس پس صف کو اس طرح بھرنا چاہیئے کہ ایک آدمی امام کے بالکل پیچھے ہو پھر ایک اس کے دائیں اور ایک بائیں کھڑا ہوتا چلا جاوے۔ مگر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے دائیں جانب کو بھرنا چاہیئے جب اس طرف جگہ نہ رہے پھر بائیں طرف آنا چاہیئے یہ غلط ہے بلکہ دونوں طرف برابر آدمی ہونے چاہئیں۔ مگر صوفیہ کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خاص حالات میں زیادہ کوشش بائیں طرف[۱]

---

[۱] قلت قال العلامۃ الشعرانی فی العہود المحمدیۃ اخذ علینا العہد العام من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آینا یسرۃ المسجد قد عطلت من صلوٰۃ الناس فیہا ان نکرمہا بالصلوٰۃ فیہا جبرالہا قال وقد روی ابن ماجۃ وغیرہ عن ابن عمر قال قیل للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان میسرۃ المسجد قد تعطلت فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من عمر میسرۃ المسجد کتب اللّٰہ لہ کفلین من الاجر وفی روایۃ للطبرانی مرفوعاً من عمر جانب المسجد الایسر لقلۃ اہلہ فلہ اجران اھ (ص۳۵) قلت وہذا ہو السر فی اہتمام الصوفیہ بالجانب الایسر ای لقلۃ رغبۃ الناس فیہ وامام اہتمامہم بالصف المؤخر مع کونہ خلافاً للحدیث خیر صفوف الرجال اولہا وشرہا آخرہا فالسر فیہ ما قالہ الشعرانی ایضا اخذ علینا العہد العام من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط اللّٰہ عز وجل بحیث لم یبق فی سرائرنا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کھڑا ہونے کی کرتے ہیں اور دائیں طرف کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح صف اول پر بھی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ خاص حالات میں دوسروں کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں اور خود صف ثانی یا ثالث میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جنازہ کی نماز میں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اکثر پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ تو منقول ہے وہ یہ کہ صف مؤخر میں کھڑا ہوتے والا اکمل صفوف زوائد ہے اور حدیث میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز کی ہو جائیں اس کی مغفرت ہو جاتی ہے تو صف ثالث میں کھڑا ہونے والا علت تامہ کا جزو اخیر ہے جو کہ سبب مغفرت ہے اور ایک وجہ میرے قلب میں آئی ہے وہ یہ کہ صف اول والے بلا واسطہ میت کے لئے دعا کرتے ہیں اور صف اخیر والا اگلی صف کے مسلمانوں کو بھی واسطہ بناتا ہے وہ سب کے واسطہ سے دعا کرتا ہے اس لئے صوفیہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اگلوں کو واسطہ بنا کر دعا کریں۔ خیر جماعت جنازہ کا ذکر تو تبعاً تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ جماعت صلوٰۃ مفروضہ میں بھی صف اول میں ایثار کرتے ہیں اگر

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) وظواہرنا الامایرضی ربنا ان نواظب علی الصلوٰۃ فی الصف الاول عملاً بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی ای العقل ولا یکون العبد عاقلاً الا اذا کان لنداالوصف الذی ذکرناہ فمن کان فی ظاہرہ او باطنہ صفۃ یکرہہا اللہ تعالیٰ فلیس بعاقل کامل رای ولیس اہلاً للقرب من الامام ایضا بدلالۃ الحدیث ۱۲) ولا یتقدم للصف الاول بین یدی اللہ فی المواکب الالہیۃ الا الانبیاء والملائکۃ ومن کان علی اخلاقہم واما من تخلف عن اخلاقہم فیقف فی اخریات الناس خیر لہ اھ (ص۳۵) قال واما حدیث خیر صفوف الرجال ولہا فالمراد بالرجال الکمل اھ (ص۳۶) ای الکاملون فی الاحلام والنہی کیلا تتضاد الآثار فان حدیث لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی کما یفیدالدنو من ہولاء یفید طلب التاخر عمن لیس علی مرتبتہم ایضاً اویقال خیر صفوف الرجال اولہا خیر بمعنی الانتشار ای لیجعل الامام خیر الرجال فی اول الصف واللہ اعلم فاذا رای احدٌ غیرہ افضل منہ فتاخر لہ من الصف الاول وقدمہ فقد عمل بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی فای یوم علیہ اذا قدم من کان احق بالصف الاول منہ فافہم ولا تعجل بالانکار علی القوم فتندم ۱۲ جامع)

کوئی ان کا بزرگ آجائے تو وہ اس کو مقدم کر دیتے ہیں اس پر فقہا خشک اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے صف اول کے ثواب کو چھوڑ دیا جس میں استغناء عن الثواب ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ ایک ثواب تو صف اول میں کھڑے ہونے کا ہے اور دوسرا ثواب تعظیم اہل اللہ کا ہے جو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے تو ہم ظاہر میں گو ایک ثواب کے تارک ہوئے مگر باطن میں دوسرے بڑے ثواب کے جامع ہوئے تو استغناء عن الثواب

ے قلت وقد علمت مما ذکرناہ سابقا ان فی ذلک عملاً بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی رواہ مسلم فی صحیحہ وقال فی رد المحتار وفی حاشیۃ الاشباہ للحموی عن المضمرات عن النصاب وان سبق احد الی الصف الاول فدخل رجل اکبر منہ سنا او اہل علم ینبغی ان یتاخر ویقدمہ تعظیما لہ اھ فہذا یفید جواز الایثار بالقرب بلا کراہۃ خلافا للشافعیۃ وقال فی الاشباہ لم ارہ لاصحابنا ونقل العلامۃ البیری فروعا تدل علی عدم الکراہۃ ویدل علیہ قولہ تعالیٰ یوثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ وما فی صحیح مسلم من انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اتی بشراب فشرب منہ وعن یمینہ اصغر القوم وہو ابن عباس وعن یسارہ اشیاخ فقال صلے اللہ علیہ وسلم للغلام اتاذن لی فی ان اعطی ہولاء فقال الغلام لا واللہ فما عطاہ الغلام۔ اذ لاریب ان مقتضی طلب الاذن مشروعیۃ ذلک بلاکراہۃ وان کان غیرہ افضل اھ (ای لو کان آثر الغلام غیرہ بحقہ کان ذلک جائزا لہ) اقول وینبغی تقیید المسئلۃ (ای مسئلۃ جواز الایثار) بما اذا عارض تلک القربۃ ما ہو افضل منہا کاحترام اہل العلم والاشیاخ کما افادہ الفرع السابق والحدیث فانہما یدلان علی انہ افضل من القیام فی الصف الاول او من عطاء الاناء لمن لاحق فیکون الایثار بالقربۃ انتقالاً من قربۃ الی ما ہو افضل منہا وہو الاحترام المذکور اما لو آثر علی مکانہ فی الصف مثلاً من لیس کذلک یکون اعرض عن القربۃ بلا داع وہو خلاف المطلوب شرعا اھ (ص۶۹۵ ج ۱) قلت وکون الرجل لیس کذلک یختلف باختلاف الذوق فمن ذاق کونہ احسن الخلق کلہ وان کل مسلم افضل منہ فلہ تقدیم کل مسلم علی نفسہ ویکون فی ذلک عاملا بقولہ علیہ السلام لیلینی منکم الخ بتقدیم الافضل منہ عندہ فافہم واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع

کہاں ہوا اس میں بھی تو طلب ثواب ہی ہے پھر شرعی قاعدہ ہے الدال علی الخیر کفاعلہ (نیکی کا بتلانے والا مثل اس کے کرنے والے کے ہے) اس بنا پر جس کو ہم نے صف اول میں کھڑا کیا ہے اس کو جو صف اول کی فضیلت ہماری وجہ سے حاصل ہوگی اس کا ثواب بھی ہم کو ملے گا تو ہم ثواب صف اول سے بھی محروم نہ ہوئے اور اس کے ساتھ دوسرے ثواب کے جامع ہوگئے۔ ہمیں اس صورت میں دوہرا ثواب ملا۔

غرض ایثار حضرات صوفیہ کا بہت بڑا معمول ہے بھلا بزرگوں کے ساتھ تو وہ کیونکر ایثار نہ کرتے ان کا تو مذاق یہ ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں یہ بڑے بزرگ صاحب باطن ہیں اور اس کے ساتھ ہی بڑے عالم اور محدث بھی ہیں ہندوستان میں علم حدیث یہی لائے گو شہرت شاہ ولی اللہ صاحب کی زیادہ ہے مگر اصل حدیث کے لانے والے یہاں پر یہی ہیں یہ علامہ ابوطاہر محدث مدنی کے شاگرد ہیں۔ ان کی ایک حکایت ایثار کے متعلق ہے مگر اس سے پہلے میں ایک دوسرا واقعہ بیان کردوں (کیونکہ دونوں میں ارتباط ہے ۱۲) سو ایک واقعہ تو ان کا یہ ہے۔ کہ وہ ایک دفعہ بہت قیمتی اور عمدہ لباس پہنے ہوئے دربار شاہی میں جارہے تھے صوفیہ ناقصین تو ہر حالت میں تقشف سے رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تو ظاہر میں جیسے اپنے گھر رہا کرتے ہیں ویسے ہی بادشاہوں کے سامنے رہیں گے ہم سلاطین کی عظمت کے لئے لباس کیوں تغیر کریں اور ایسے صوفیوں کی عوام کی نظر میں زیادہ وقعت ہوتی ہے مگر کامل کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین
نیستم در صف طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں)

وہ اپنے لئے کوئی خاص وضع اور ہیئت تجویز نہیں کرتا وہ ہر حالت میں حکم کا تابع ہوتا ہے اسی لئے کبھی خستہ حال رہتا ہے کبھی بنا ٹھنا رہتا ہے یہ لوگ سلاطین کی

ملاقات کے لئے قیمتی لباس بھی پہن لیتے ہیں کیونکہ اس میں مزورلہ کا اکرام ہے اور اکرام مزورلہ مطلوب ہے اس لئے وہ ان کی خاطر اپنی وضع کو چھوڑ کر اس وقت شاہی وضع اختیار کر لیتے ہیں عوام ان کی اس حالت پر طعن کرتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کی ملاقات کے لئے کیسے بنے ٹھنے جا رہے ہیں مگر ان کو کیا خبر وہ کس حال میں ہیں اسی لئے کامل کا پہچاننا دشوار ہے کیونکہ وہ کسی حالت و وضع کا پابند نہیں ہوتا تو عوام کو اس میں ظاہرا دوسروں سے وہ خاص امتیاز نظر نہیں آتا ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو تاہ کرنا چاہیئے اسی میں سلامتی ہے)

ایک بزرگ بی بی کا قصہ ہے کہ وہ ہر رات کو بعد عشاء کے خوب زینت کرتیں عمدہ لباس پہنتیں زیور سے آراستہ ہو کر کنگھی سرمہ لگاتیں اور اس حالت سے شوہر کے پاس آکر ان سے دریافت کرتیں کہ تم کو میری حاجت ہے اگر وہ کہتے ہاں تو ان کے پاس کچھ دیر لیٹ جاتیں اور اگر وہ کہتے کہ مجھے حاجت نہیں تو پھر کہتیں کہ اچھا اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے خدا کے ساتھ مشغول ہوں چنانچہ شوہر کی اجازت کے بعد وہ اپنا لباس اور زیور وغیرہ اتار کر رکھ دیتیں اور کمبل اور ٹاٹ کا لباس پہن کر تمام رات عبادت کرتیں۔ تو دیکھئے یہ بزرگ بی بی ایک وقت میں کیسی زینت کرتیں اور دوسرے وقت کمبل اور ٹاٹ میں رہتیں اب اگر کوئی زینت کے وقت ان کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ کیسی بزرگ ہیں جو اس قدر زیب و زینت کا اہتمام کرتی ہیں مگر کسی کو کیا خبر کہ وہ کس لئے زینت کرتی تھیں وہ نفس کی خواہش کے لئے ایسا نہ کرتی تھیں بلکہ حکم شریعت کی وجہ سے زینت کرتی تھیں کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے خوب زیب و زینت کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں اس کو زینت کرنے سے ثواب ملتا ہے مگر آجکل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ شوہر کے سامنے تو بھنگیوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں برادری میں جاتی ہیں تو سر سے پیر تک آراستہ ہوتی ہیں اور اگر کوئی بیچاری شوہر کی خاطر

زینت کرلے تو اس کو نکّو بناتی ہیں کہ ہائے اسے حیا و شرم ذرا نہیں یہ اپنے میاں کے واسطے کیسے کیسے چوچلے کرتی ہے افسوس جس جگہ زینت کا حکم تھا وہاں تو اس پر طعن ہوتا ہے اور جہاں ممانعت ہے وہاں اہتمام کیا جاتا ہے تو وہ بزرگ بی بی ایسی نہ تھیں وہ تو حکم کے تابع تھیں جہاں شریعت کا حکم تھا وہاں خوب زینت کرتیں کیونکہ جب شوہر زینت کو کہے دولہن کو خراب وخستہ رہنے کا کیا حق ہے مگر جب شوہر کو کچھ غرض نہ ہوتی تو وہ اپنے نفس کے لئے زینت کا اہتمام نہ کرتی تھیں۔ بلکہ وہی کمبل اور ٹاٹ پہن لیتی تھیں اسی طرح کاملین زینت اور ترک زینت میں حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے۔

چنانچہ شاہ عبدالرحیمؒ صاحب دربار میں جانے کے لئے عمدہ بیش قیمت لباس پہن کر جا رہے تھے، اس حالت سے تو ظاہر بینوں کو کچھ کچھ شبہات ہوئے ہوں گے اب دوسری حالت دیکھئے کہ راستہ میں آپ نے ایک کتے کے بچہ کو دیکھا جو نالی میں سردی کے مارے جاڑے میں سکڑ رہا تھا آپ سے یہ حالت دیکھ کر نہ رہا گیا فوراً کھڑے ہوگئے اور خادم سے فرمایا کہ اس کو نالی سے نکال لو اس نے کچھ ناک مُنہ چڑھایا تو آپ نے آستین چڑھا کر اُسے خود نکالا اور ایک حمام قریب تھا وہاں لیجا کر گرم پانی سے اس کو غسل دیا پھر آگ میں تاپا یہاں تک اس کی سردی کم ہوگئی اور اچھی طرح چلنے پھرنے لگا پھر آپ نے اہلِ محلہ سے فرمایا کہ اگر تم اس کی راحت کا انتظام کر سکو اور نگہداشت کا وعدہ کرو تو میں اس کو یہیں چھوڑ دوں ورنہ اس کو اپنے ساتھ لیجاؤں اور میں خود اس کا انتظام کروں گا۔ اہل محلہ نے وعدہ کیا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور پھر دربار میں تشریف لے گئے (بھلا جو شخص فخر وتکبر کے لئے زینت کرتا ہو کیا اس سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کتے کے بچہ کو اپنے ہاتھ سے اس طرح دھوئے اور یوں اس کو راحت پہنچائے ہرگز نہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے بے تکلف اس کی خدمت کی، خادم نے بھی ناک مُنہ چڑھالیا مگر آپ کو ذرا بھی اس سے انقباض نہ ہوا یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے نفس کے لئے زیب وزینت نہ کرتے تھے ۱۲)

یہ قصہ تمہید ہے دوسرے قصہ کی اور دوسرا قصہ جو مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ایک بار آپ بٹیا پر جارہے تھے ایک موقع ایسا آیا کہ بٹیا کے دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا صرف بٹیا ہی کا راستہ سوکھا ہوا تھا سامنے سے ایک کتا بھی اسی بٹیا پر آگیا اب وہاں اس کی ضرورت تھی کہ دونوں میں سے ایک کیچڑ میں اترے تو دوسرا بٹیا کے راستہ سے نکلے کیونکہ بٹیا پتلی تھی اس میں اتنی وسعت نہ تھی کہ دونوں برابر کو نکل جائیں چنانچہ شاہ صاحب کھڑے ہو گئے اور وہ کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا پھر اشارات میں گفتگو شروع ہوئی (بعض اہل اللہ جمادات وحیوانات سب کی گفتگو سمجھ لیتے ہیں ۱۲) چنانچہ شاہ صاحب نے کتے سے کہا کہ بھائی تم پانی میں اترو، اس نے کہا کیوں مجھ میں اور آپ میں کیا فرق ہے آپ کیوں نہیں اترتے اور یہ کہا کہ افسوس پہلے بزرگوں کا مذہب ایثار تھا اور اس وقت کے بزرگوں کا مذہب اختیار رہے۔ فرمایا نہیں تم نے بدگمانی کی بلکہ میں تجھ سے اترنے کو اس لئے کہتا ہوں کہ تو مکلف نہیں ہے اور میں مکلف ہوں اگر تو اس پانی اور کیچڑ سے ناپاک بھی ہو جائے گا تو تھوڑی دیر میں خشک ہو کر پھر پاک ہو جائے گا پھر تیرے ذمہ نہ وضو ہے نہ نماز ہے، اور میں اتروں گا تو مجھے اپنے سارے کپڑے اور بدن کا دھونا اور پاک کرنا لازم ہو گا جس میں بہت دیر لگے گی ممکن ہے کہ نماز میں دیر ہو جائے۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت اچھا میرا تو کچھ حرج نہیں میں پانی میں اُترتا ہوں مگر یہ یاد رکھو کہ تمہارے کپڑے ناپاک ہو جائیں تو ایک دو لوٹے پانی سے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر میں اس وقت پانی میں اترا اور تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو اس سے تمہارا قلب ایسا ناپاک ہو گا جس کی ناپاکی ہفت قلزم سے بھی نہ دُھل سکے گی۔ یہ سُن کر شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہو گئی اور فوراً پانی میں اُتر کر راستے سے ہٹ گئے اور کتا بٹیا پر سے چلا گیا اور آپ اس کے بڑے احسان مند ہوئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک علم عظیم عطا ہوا۔

اب شاہ صاحب پر غیب سے الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ ہم نے تم کو

یہ علم عظیم کتے کے ذریعے سے کیوں دیا یاد کرو تم نے ایک دن ایک کتے کے بچے پر احسان کیا تھا کہ اس کو پانی میں سے نکال کر گرم پانی سے دھویا اور آگ سے تاپا تھا تو ہم نے اس احسان کا آج بدلہ کر دیا کہ اسی کی ابن النوع کے ذریعہ سے تم کو یہ علم عظیم عطا کیا تاکہ اس کتے کے بچے پر اپنا احسان نہ سمجھیں اور ان علوم کی قدر صوفیہ ہی سمجھتے ہیں انکو ان میں ایسا مزا آتا ہے کہ واللہ جب کوئی علم جدید عطا ہوتا ہے تو اس سے ایسا حظ آتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے گرد ہوتی ہے غرض صوفیہ نے ایثار سے یہاں تک کام لیا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کیا صوفیہ نے ہر مقام پر اس کی رعایت کی ہے اور بعض مواقع پر شریعت نے بھی اس کو واجب کیا ہے۔ چنانچہ حقوق نفس پر حقوق غیر کو مقدم کیا گیا ہے بشرطیکہ اپنی ہلاکت اور اپنے اہل بیت کی پریشانی کا اندیشہ نہ ہو پس جہاں ایثار واجب نہ ہے صوفیہ وہاں تو کیوں نہ کرتے وہ تو جہاں واجب بھی نہیں وہاں بھی اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے ان کو علوم حاصل ہوتے ہیں، اور ان کو تو بڑا مزا ان علوم ہی میں آتا ہے مگر اب لوگ چاہتے ہیں ان سے دنیوی ترقی کرانا بھلا یہ اس کام کے کہاں ؎

تا ندانی ہر کرا یزداں بخواند　　　از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالٰی اپنا بنالیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

صاحبو! جس کو ان علوم کا مزا حاصل ہو گیا ہے وہ واقعی دنیا کے کام کا نہیں رہتا ہاں جو ایسے باہمت ہوں کہ دونوں کو جمع کر سکیں جیسے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما وہ البتہ دونوں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو دنیا کے مشاغل ان علوم سے مانع نہیں ہوتے بلکہ دنیا بھی ان کے ہاتھ میں دین بن جاتی ہے مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ تو ایسے باہمت نہیں ہوتے۔ ان کا تو وہی حال ہوتا ہے ؎

تا ندانی ہر کرا یزداں بخواند　　　از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالٰی اپنا بنالیتے ہیں اس کو دنیا کے تمام کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

بہر حال لوگوں نے حقوق العباد سے بہت ہی غفلت کر رکھی ہے۔ حالانکہ حق العبد کا تقدم معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حق اللہ پر حق العبد کا تقدم بوجہ عظمت کے نہیں ہے بلکہ محتاج و حقیر کے حق کو کریم غنی نے اپنے حق پر مقدم کر دیا ہے کہ جب دونوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ فرما دیتے ہیں کہ یہاں ہمارے حق کو چھوڑ دو ہمیں کچھ ضرورت نہیں اور بندہ کے حق کو ادا کرو وہ محتاج ہے اگر اس کا حق ادا نہ ہو گا تو پیٹ پھاڑ کر مر رہے گا یہ وجہ ہے تقدم کی۔ پس لوگوں کا تاکد حق کے سبب کو صرف عظمت میں منحصر کر دینا صحیح نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے جب سبب مرض کا میں نے ازالہ کر دیا تو اب مرض کا علاج سہل ہو گیا۔ پس بندہ کے حقوق کو اس کے حاجت کی وجہ سے ادا کرو اور جب میں آپ کے عذر کا جواب دے چکا تو حجت تام ہو گئی۔ اب کسی کے پاس حقوق العباد سے غفلت کرنے کا کوئی عذر نہیں رہا یہ تو ان لوگوں کی غفلت کا علاج تھا جو حقوق العباد کا بالکل ہی اہتمام نہیں کرتے۔ اب دوسری غلطی بعض لوگوں میں یہ ہے کہ وہ حق العبد کو صرف مال میں منحصر کرتے ہیں کہ چوری کرنا غصب کرنا قرض لے کر انکار کر دینا کسی کی امانت رکھ کر مکر جانا بس یہی جرم ہے ان کے علاوہ حق العباد میں اور کوئی جرم نہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق العبد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی حقوق ہیں اور وہ بھی حقوق مالیہ کے برابر بلکہ ان سے بھی معظم تھیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے صحابہ نے ادب کی وجہ سے عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جاننے والے ہیں) فرمایا اَلَیْسَ یَوْمُ عَرَفَۃَ کیا یہ عرفہ کا دن نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بَلٰی بیشک یہ عرفہ کا دن ہے۔ پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے صحابہ نے ادب سے وہی جواب دیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ آپ نے فرمایا اَلَیْسَ ذِی الْحِجَّۃِ کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ حج کا مہینہ ہے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا شہر ہے اس پر بھی صحابہ نے ادب سے اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ہی کہا آپ نے فرمایا اَلَیْسَ بِالْبَلَدِ الْحَرَامِ کیا یہ بلد حرام نہیں ہے، صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ بلد حرام ہے۔

(بقیہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

اس تمہید کے بعد آپ نے فرمایا۔ اَلَا اِنَّ اَمْوَالَکُمْ وَدِمَائَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا اِلیٰ یَوْمِکُمْ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیَامَةِ (اَوْکَمَاقَالَ) سن لو تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آج سے قیامت تک ویسی ہی حرام ہیں جیسے اس یوم معظم شہر معظم اور بلد معظم میں حرام ہیں ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ویسی ہی ہے جیسی آج ہے اس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حقوق نفس، دوسرے حقوق مال، تیسرے حقوق عرض۔ جب شریعت سے تین حقوق معلوم ہوتے ہیں تو آپ کو صرف مال میں حق العبد کو منحصر کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو جان کا بھی حق ہے، آبرو کا بھی حق ہے، مال کا بھی حق ہے۔ جان کا حق تو یہ ہے کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرو خیر قتل تو یہاں اس بادشاہت میں بکثرت کون کر سکتا ہے اس کی طاقت تو یہاں کسی کو نہیں ہے گو شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر وہ چھپ نہیں سکتا فوراً مقدمہ قائم ہو کر پھانسی ہو جاتی ہے اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں۔ ہاں یہ حق البتہ باقی ہے کہ کسی غریب کے دو چار ڈنڈے لگا دیئے گو ہمارے قصبہ میں یہ حق بھی باقی نہیں رہا وہاں کسی کی مجال نہیں جو کسی بھنگی کو بھی مار سکے یا بیگار میں کام لے سکے ہمارے بھائی کے ایک کارندہ ہیں حاجی جی اب تو انھوں نے کارندگی سے استعفا دیدیا ہے مگر جس زمانہ میں وہ کارندہ تھے اس زمانہ کا قصہ بیان کرتے تھے۔ ایک دن میں نے سڑک صاف کرنے والے بھنگی سے کہا کہ جب تو سڑک پر جھاڑو دیا کرے تو ذرا ہمارے دروازہ میں بھی جھاڑو دے دیا کر تو وہ کیا کہتا ہے کہ حاجی جی کنوُن[1] تو ہے نہیں۔ خیر تمہاری خاطر سے دیدیا کروں گا تو وہاں کے بھنگی بھی قانونی ہیں، ہر شخص بجائے خود رئیس ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں (ہر شخص رئیس وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی رئیس نہ ہو ۱۲) میں تو اس حالت سے بڑا خوش ہوں گو اپنی قوم کی حالت تنزل سے افسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کی وقعت بھنگیوں کے

[1] قانون۔

دلوں میں بھی نہیں رہی مگر اس سے خوش ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اب ظلم نہیں ہو سکتا ریاست تو وہی اچھی ہے جس میں ظلم نہ ہو اور جس ریاست کا یہ نتیجہ ہو کہ غریبوں پر ظلم کیا جائے اس کے ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ چنانچہ اب ہمارے قصبہ میں زوال ریاست سے یہ بات تو ہوگئی کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا اور جو کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے تو جواب میں دس باتیں وہ ان کو سنا لیتا ہے پس ظالمانہ ریاست سے ان کی یہی حالت اچھی ہے ان کو اگر تھوڑی سی بھی ریاست ملتی ہے تو چوگنا ظلم کرتے ہیں۔

کانپور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے بارہ وہ پٹھانوں کی بستی ہے وہاں کے پٹھان بہت شریف ہیں مگر آخر تو رئیس ہیں کبھی کسی غریب کو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں تو وہاں کے ایک پٹھان نے کسی جلاہے سے تمسخراً پوچھا کہ میاں جی کس حال میں ہو۔ کہا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھ کو جلاہا بنا دیا جس سے مجھ کو کوئی کچھ کہہ لیتا ہے کوئی کوئی دو چار ڈنڈے لگا دیتا ہے تو قیامت میں مجھے کسی کی نماز ملے گی کسی کے روزے ملیں گے پٹھان نہیں بنایا۔ اگر پٹھان ہوتا تو قیامت میں دوسرے لوگ میرے سب اعمال لے جاتے اور میں مفلس بن کر کھڑا رہ جاتا تو میں اس بات پر خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پٹھان نہ بنایا یہ جواب سن کر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم اس جلاہے کی کیا گت بناتا مگر وہاں کے پٹھان شریف ہیں انھوں نے کچھ نہیں کہا نہ برا مانا۔ ان لوگوں کی شرافت کا ایک اور اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ ہے، وہ یہ کہ میں کئی سال ہوئے ایک دفعہ کانپور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نواح کانپور میں بعض دیہات کے نو مسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں، آریہ اُن کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور روساء کو ساتھ لیا اور موضع گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گانوں تھا پھر وہاں سے دو دو تین تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے یہ سُنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو۔ اگر کوئی شبہ اسلام میں ہو رفع کر لو۔ ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے ان کے یہاں تو

نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے جس کو کوئی شریف ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے ہم تو نو مسلم ہی رہیں گے۔ میں نے کہا اچھا تم نو مسلم ہی رہو۔ پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اصلی بات یہ ہے کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو ڈر یہ ہے کہ ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دے گا نہ ہماری لڑکی لے گا اس لئے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے۔ اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا۔ خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا کہ وہ بھی خبر سن کر آگئے تھے۔ ان میں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ صاحبو! تم بیفکر رہو تم کو ہم اپنی بیٹیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہو گی مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی کہ شاباش۔

ع ایں کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند (یہ کام تم سے ہوا اور مردانِ خدا ایسا ہی کرتے ہیں)

مگر یہاں آکر چودھری لاجواب تو ہو گیا۔ لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی جس سے صرف ہم کو لاجواب کرنا مقصود تھا۔ اور حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں وہ اپنے اسی طرز میں خوش ہیں درحصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں حالت ان کی یہ ہے کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے ہیں چنانچہ ایک چودھری کا نام ننو سنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا یہ بنسبت پہلے کے ذرا سمجھ دار تھا بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے کہنے لگا ہاں آتا ہے کہا گیا سناؤ تو کہنے لگا کہ بس سنو مت گانوں کے لوگ مجھے یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھت ہے ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے، دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے، تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے

مگر ساتھ ہی ہندؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے۔ اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا شعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی مسلمانوں کو اجازت دی میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ ہے ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کا محافظ ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہوجائیں گے اس وقت بدعت وسنت کی تعلیم دے دینا۔

ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اُسے کہا کہ کالج علیگڈھ میں مولود شریف، ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ مولود شریف (بہیئۃ معروفہ) اور جگہ تو بدعت مگر کالج میں جائز بلکہ واجب ہے کیونکہ اس بہانہ سے وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ کے فضائل و معجزات سُن لیتے ہیں تو اچھا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا مجھے ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہوجاوے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جبتک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو۔ غرض بارہ کے پٹھان بڑے شریف ہیں اور یہ ان کی شرافت ہی ہے کہ اس جُلاہے کا جواب ناگوار نہ ہوا ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوب مرمت کرتا۔ مگر واقعی بڈھے نے بات سچی کہی کہ اللہ کا شکر ہے جو میں جولاہا ہوگیا پٹھان نہ ہوا ورنہ پھر میں ظلم کرتا اور لوگ میرے نیک اعمال چھین لیتے۔ سو ہمارے قصبہ میں تو یہ ریاست اب نہیں رہی کہ کوئی کسی کے ڈنڈے لگا سکے گو تھوڑا سا کہیں ہو بھی جاتا ہے مگر پھر کم ہے جس سے میں خوش ہوں

لیکن اور قصبات میں جہاں تھوڑی بہت ریاست ہے وہاں اس قسم کا ظلم زیادہ ہوتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس سے غربا بھی بچے ہوئے نہیں ان میں بھی تکبر بہت ہوتا ہے گو امیروں کی برابر قدرت نہ ہو مگر اینٹھ مروڑ ان میں بھی ہے۔ چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں کہ کوئی مال مست ہے کوئی کھال مست ہے۔ اور یہ بہت سخت بات ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تین شخصوں سے بہت زیادہ بغض و نفرت ہے ایک ملک کذاب بادشاہ جھوٹ بولنے والا کیونکہ آدمی اس لئے جھوٹ بولا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنا کام نکالے اور اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اپنے سے زیادہ زبردست ہو جس کے سامنے سچ بولنے سے کچھ اندیشہ ہوتا ہے تو بادشاہ سے اوپر تو کوئی نہیں ہوتا اس کو جھوٹ بولنے کی کیا مار آئی دوسرے "شیخ زانی" یعنی بڈھا زناکار کیونکہ جوان میں تو ایک داعی زنا کا موجود ہے جس کا روکنا ہمت کی بات ہے مگر بڈھے میں تو وہ داعی بھی موجود نہیں یہ تو زبردستی اپنے نفس کو سوچ سوچ کر آمادہ کرے گا تو اس کا زنا کرنا محض حرص اور خباثت و شرارت ہی ہے۔ تیسری عائل متکبر یعنی غریب تکبر کرنے والا کیونکہ امیر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بھی ہے اور یہ خوامخواہ فرعون بے سامان بنا ہوا ہے، غرض جس شخص میں جس گناہ کا سبب اور داعی موجود ہو اس کا جرم اس شخص سے کم درجہ کا ہے جس میں کوئی سبب اور داعی موجود نہیں اس لئے غریبوں کا تکبر امیروں کے تکبر سے اشد ہے مگر حالت یہ ہے کہ غریب بھی اپنی کھال میں مست ہیں کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی دوسروں کی ایذارسانی سے نہیں چوکتے۔

ہمارے قصبہ میں ایک رئیس کے یہاں تقریب ہوئی تھی جس میں بہت کچھ سامان کیا گیا تو برادری کے ایک غریب شریف زادہ نے اس کی آبرو ہی بہانا چاہیں اور سوچتے رہے کہ کسی بات پر موقع ملے تو اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالوں مگر وہاں ایسا عمدہ انتظام تھا کہ کسی بات میں ان کو بولنے کا موقع نہ ملا۔ اتفاق سے سقہ پانی کی مشک لئے ہوئے ان کے پاس سے گذرا اور مشک کی ایک باریک دھار سے کچھ چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑ گئے بس یہ کہاں تھے فوراً بھلا کہہ کر کھڑے ہو گئے اور رئیس کو برا بھلا کہنا شروع کیا

کہ نو آموز دولت ہے انتظام کا سلیقہ نہیں ہے برادری کے بھائیوں کے سامنے سے سقوں کو زکا لا جاتا ہے جس سے سب کے کپڑوں پر چھینٹے پڑتے ہیں اور ان کو ذلیل کیا جاتا ہے ہم ایسے اوچھے کی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے یہ کہکر چلتے ہو گئے پھر اس رئیس بیچارہ نے خوشامد کی ٹوپی پیروں میں ڈالی جب آپ تشریف لائے کیونکہ مقصود یہی تھا کہ ذرا اس کو ذلیل کردیں اور اپنے پیروں میں اس کی ٹوپی ڈلوالیں مگر یہ اینٹھ مروڑ بھی اسی کی بدولت تھا کہ جانتے تھے وہ ہماری خوشامد کریگا آگے ہاتھ جوڑے گا اس لئے اس پر ناز تھا اور اس رئیس کی یہ تواضع بھی ریاست ہی کی بدولت تھی کیونکہ رؤسا جانتے ہیں کہ ہماری شان اتنی بڑی ہے جو ایسی باتوں سے نہیں گھٹتی۔ پس غربا میں بھی تکبر اور ایذا رسانی کا مرض موجود ہے اس لئے اب میں اہل دولت کا لفظ چھوڑ کر "اہل قدرت کہوں گا تو جس کو جتنی بھی قدرت حاصل ہے اس میں وہ دوسرے کی جان پر دست اندازی کرنے سے پاک نہیں کرتا گو زیادہ دست اندازی رؤسا ہی کے ہاتھ سے ہوتی ہے کیونکہ ان کو قدرت زیادہ ہے غریب آدمی کسی پر زیادتی کرتا ہے تو دوسرا اس کا بدلہ لے سکتا ہے اور امرا کی ال تو غربا رنالش نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں ۔ اور اگر نالش کریں بھی تو کامیابی دشوار ہے کیونکہ حکام بھی امراء کی رعایت کرتے ہیں دبس وہی حال ہو جاتا ہے) ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کرینگے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا۔

خصوصاً حکومت غیر عادلہ میں تو امراء کی بہت ہی رعایت ہوتی ہے۔ ہاں حکومت عادلہ ہو تو وہاں کسی کی پروانہ ہو گی چاہے کوئی کتنا ہی امیر اور مالدار ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ الایہم شاہ غسان اسلام لایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام سے خوشی ہوئی تھی کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہونے سے اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں

دوسرے اس سے مخالفین پر بھی رعب پڑتا ہے مگر اس خوشی کا یہ اثر نہ تھا کہ جبلہ کی ایسی رعایت کی جاتی کہ وہ جس پر چاہے ظلم کرنے لگے اور کچھ باز پرس نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ جبلہ لنگی باندھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ لنگی باندھنا اہل عرب کا عام شعار تھا بادشاہ اور غریب سب لنگی باندھتے تھے۔ تو اس وقت اتفاق سے کسی غریب کے پیر سے جبلہ کی لنگی کا کونہ دب گیا جبلہ نے جو قدم آگے بڑھایا دفعۃً لنگی کھل گئی، غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس غریب مسلمان کے بڑی زور سے طمانچہ مارا اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس نے جبلہ کو تو کچھ نہ کہا سیدھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں جا کر دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے اس مسلمان کو طمانچہ مارا ہے اس نے اقرار کیا۔ آپ نے مدعی سے فرمایا کہ تم جبلہ سے قصاص لے سکتے ہو۔ جبلہ نے کہا اے امیر المؤمنین اس بازاری کو مجھ جیسے بادشاہ کی برابر کس چیز نے کر دیا جو اس کو مجھ سے قصاص لینے کا حق حاصل ہو گیا۔ آپ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا۔ جبلہ نے کہا اچھا مجھے کل تک کی مہلت دی جاوے میں کل قصاص دیدوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مہلت نہیں دے سکتا یہ مدعی کا حق ہے اگر وہ چاہے مہلت دے یا نہ دے۔ بے چارہ غریب آدمی ذرا سی بات پر پسیج جاتا ہے مدعی نے کہا کہ مجھے کل تک کی مہلت دینا منظور ہے۔ پھر رات کو وہ کمبخت چپکے سے نکل کر بھاگ گیا اور مرتد ہو کر نصرانیوں میں جا ملا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوئی اور نہ اسلام کو جبلہ کے ارتداد سے کچھ نقصان پہنچا بلکہ اگر حضرت عمرؓ اس کی رعایت کرتے تو اس سے بیشک اسلام کو ضرر پہنچتا۔ کیونکہ عقلاء کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں ضعیف کا قوی سے تہیں ح لایا جاتا بلکہ زبردستوں کی رعایت کی جاتی ہے اور یہ خلاف عدل ہے اور اب گو ظاہر میں ایک جبلہ اسلام سے نکل گیا مگر عدل اسلامی کی نظیر تمام دنیا کے سامنے قائم ہو گئی اور سب کو معلوم ہو گیا کہ قانون اسلام میں کوئی زبردست کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عدل اسلامی کے شیدا بن گئے ۱۲ جامع)

اور تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جبلہ بھی اپنے ارتداد پر بہت پچھتا تا تھا۔ اور باوجودیکہ نصرانیوں میں اس کی بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اور ہر قسم کے سامان عیش اس کے لئے مہیا تھے مگر بعض دفعہ وہ رو کر یہ کہتا تھا اے کاش میں اس دن قصاص کو گوارا کر لیتا تو وہ میرے لئے اس عزت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ اسلام واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کبھی چین نہیں مل سکتا۔

تو جہاں حکومت مسلمہ عمریہ ہو وہاں البتہ کسی رئیس یا بادشاہ کی کسی غریب کے مقابلہ میں کچھ رعایت نہ ہوگی اور میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اس کو نچاتے نہ پھرا کرو۔ ہاں اس کی خدمت اور خاطر کرو باقی ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو جس سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو کیونکہ کوئی رئیس ہو یا بادشاہ جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے۔ مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے کہ ان میں رؤسا اور امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے تو غرباء نالش کر کے بھی مالداروں سے انتقام نہیں لے سکتے اس لئے مالداروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے۔ اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلا وجہ لگوا دیں ان کی تو کون نالش کرتا ہے اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لے کر کسی کا حق ضائع کر دیا ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ وہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے مگر ان سے سب خوش تھے بلکہ ایماندار مشہور تھے کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے ان کی رشوت واپس کر دیا کرتے تھے۔ اور بعضے یہ کیا کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دیدی اس کے موافق فیصلہ کر دیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کر لی۔ مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے ہیر پھیر کر کے وہ جس طرح چاہے بنا دے اسی وسعت اختیار پر نظر کر کے میں مسلمانوں سے

کہا کرتا ہوں کہ تم حکام وقت کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت مضر ہے اس پر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر رہتے ہیں خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لئے یہ حرکت کر رہے ہیں تو قانون اُن کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں گے اور شریعت کا امر ہے لَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس سے حاکم کی ناراضی ہو کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھ کر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں اور اہل اللہ خدا کی امانت سمجھ کر حفاظت کرتے ہیں کہ اس کو خلاف منشا رحق صرف نہ کیا جاوے (اس لئے عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہو اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے گو عوام اس کو بزدل و ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں یعنی رؤسا، اور حکام۔ اور ایک طبقہ اور ہے میانجیوں کا یہ بچوں کے ساتھ بہت ظلم کرتے ہیں. اُن کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے تو قہر عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں اس سے میانجی بہت کم بچے ہوئے ہیں ہاں اگر کوئی ایسا ہو جیسے حافظ علی حسن صاحب کیرانوی مقیم گنگوہ تھے تو بے شک وہ اس ظلم سے بچ سکتا ہے مگر ان میں افراط نہ تھا تو یہ تفریط تھی کہ بچوں کو مار کر ان سے کہتے تھے کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو اور بعضے لڑکے ایسے شریر تھے کہ بدلہ بھی لے لیتے اور حافظ جی کو تپچی سے سڑا سڑ مارتے تھے اور وہ ایسے سیدھے تھے کہ بچوں کے ہاتھ سے مار کھا لیتے تھے ان کے سیدھے پن کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ سقے کہیں بارات میں چلے گئے اور کئی روز تک محلہ والوں کو پانی کی

تکلیف رہی تو آپ اپنے لڑکے سے فرماتے ہیں کہ ارے سعید تو ہی ایک مشک بنالے اور گھروں میں پانی بھر دیا کر۔ حافظ جی تو پرانے زمانہ کے آدمی تھے ان کو تو باوجود سید زادے اور شریف ہونے کے ایسے کاموں سے عار نہ تھا مگر ان کے صاحبزادے بڑے خفا ہوئے کہ لوابا جان ہمیں سقا بنانا چاہتے ہیں۔ غرض وہ بڑے سید ھے تھے اور نیک بھی بہت ہی تھے، نماز تو ایسی اچھی پڑھتے تھے کہ سبحان اللہ! بڑی لمبی نماز پڑھتے تھے اور ہر رکن کو اعتدال واطمینان سے ادا کرتے تھے مگر عدم علم کی وجہ سے وہ جماعت میں بھی ایسی ہی تطویل کرتے تھے جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ بہرحال وہ تو ایک میانجی ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو بچوں پر ظلم نہ کرتے تھے اور کبھی ذراسی زیادتی ہو گئی تو اس کی تلافی اس طرز سے کرتے تھے گو یہ طریقہ اچھا نہیں اس سے لڑکوں کی شرارت اور بد دماغی اور بدخلقی بڑھ جاتی ہے اور معلم کو اس کی رعایت بھی ضروری ہے بچوں کے اخلاق خراب نہ ہوں تو اب اگر کوئی اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو اور جس پر زیادتی کی ہے اس کے ساتھ احسان کرو یہاں تک کہ وہ خوش ہو جاوے۔ جیسے میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک غریب نوکر کے طمانچہ مار دیا تھا پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس کو ایک روپیہ دیا پھر دوسرے نوکر سے کہا کہ اس سے پوچھا اب کیا حال ہے کہنے لگا میں تو دعا کر رہا ہوں کہ ایسا طمانچہ روز لگ جایا کرے۔ بس یہ طریقہ تلافی کا بہت اچھا ہے اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی برا اثر نہ ہوگا اور ظلم کا دفعیہ بھی ہو جائے گا اور جب میانجی کا ایک دو دفعہ کرنے میں کچھ خرچ ہوگا تو آئندہ کو وہ خود بھی ذرا سنبھل کر مارا کریں گے نیز سزا کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے دل میں معلم سے بغض وعداوت نہ پیدا ہو جاوے جو علم سے محرومی کا سبب ہے۔ اس راز کو ایک رئیس نے سمجھا تھا۔

قصہ ان کا یہ ہے کہ جب میں کانپور میں تھا تو ہمارے مدرسہ میں ان رئیس کا بھانجا پڑھتا تھا جو بہت ہی شریر تھا اس کی یہ حالت تھی کہ پاخانہ کی دیواروں پر اساتذہ مدرسہ

کے نام لکھتا تھا لوگوں کو فکر ہوئی کہ کون نالائق ہے آخر لوگوں نے خفیہ طور پر تفتیش کی اور پہلا لکھا ہوا سب مٹا کر یہ انتظام کیا کہ جو شخص پاخانہ سے نکلتا اس کے نکلنے کے بعد فوراً دیکھا جاتا کہ کچھ لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ آخر وہ لڑکا جو ایک دفعہ نکلا تو دیوار پر نام لکھے ہوئے پائے گئے اور اس کو پکڑ کر مدرسین کے پاس لایا گیا تو ایک مدرس نے اس کو سخت سزا دی حتیٰ کہ مارتے مارتے بے ہوش کر دیا اور اس کی جان کا خطرہ ہو گیا بعض لوگوں نے اس کے ماموں کو اطلاع دی وہ فوراً کانپور آئے تو واقعی لڑکے کی حالت نازک تھی مگر علاج معالجہ سے افاقہ ہوا اور بچنے کی امید ہو گئی شہر کے لوگوں نے ان کو بہت بہکایا کہ پولیس میں رپٹ لکھوا دو مگر وہ سمجھدار آدمی تھے انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ کی شکایت غیروں کے پاس لے جاؤں بالآخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب میری عدالت تو آپ ہیں۔ میں آپ کے یہاں استغاثہ کرتا ہوں۔ میں نے چپکے سے ان مدرس صاحب کے پاس رقعہ لکھا کہ تم اسی وقت اپنا استعفاء داخل کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ میرے پاس ان صاحب کا استعفاء ملازمت سے آگیا ہے اور وہ آپ کے سامنے ہے اب ہم کو ان پر کوئی حق مواخذہ کا نہیں رہا کیونکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ رہے اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کا جہاں جی چاہے استغاثہ دائر کر کے انتقام لیجئے وہ کہنے لگے کہ کیا آپ نے ان کا استعفا منظور کر لیا ہے۔ میں نے کہا اور رد کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے۔ وہ بیچارے بہت بڑے اہل آدمی تھے کہنے لگے یہ تو میری بڑی نحوست ہوئی کہ میری وجہ سے ایک عالم مدرسہ سے الگ ہوتے ہیں اور ان کا فیض مدرسہ سے بند ہوتا ہے میں اپنا استغاثہ واپس لیتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کہیں استغاثہ نہ کروں گا میں نے اپنا حق معاف کیا آپ ان کا استعفاء واپس کر دیں ان کی اس اہلیت سے میں بڑا خوش ہوا کہ شاباش مسلمان کو دین سے ایسی ہی محبت ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ان کی عجیب خوش فہمی یہ تھی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے جاؤں اور گھر پر اس کی تعلیم کا انتظام کروں

مگر اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کو کچھ دنوں مدرسہ ہی میں رکھوں کیونکہ ابھی اگر میں اسکو گھر لے گیا تو یہ اس حالت میں جائے گا کہ اس کے دل میں ایک عالم سے کینہ اور بغض ہوگا اور یہ اس کی آخرت کو مضر ہوگا۔ اس لئے چند روز اس کو مدرسہ ہی میں رکھا جائے اور انہیں حضرت کے سپرد کیا جائے جنہوں نے اس کو مارا تھا اور ان سے کہدیا جائے کہ اب اس کے ساتھ شفقت اور ملاطفت کا ایسا برتاؤ کریں جس سے اس کے دل کا غبار نکل جائے اور ان سے اس کو محبت ہو جائے پھر میں اس کو گھر بلالوں گا واقعی اس شخص کی سلامت فطرت پر میں حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے دل سے ان کے لئے دعا نکلی اور اس وقت ہی سے میری سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ بچوں پر زیادتی ہو جائے تو اس کی تلافی اس طرح کرنا چاہئے (دیکھئے بعضے دنیا دار بھی کیسی سمجھ کے ہوتے ہیں ۱۲)

بعضے میاں جی بچوں پر مار کا تو ظلم نہیں کرتے مگر اور طرح ظلم کرتے ہیں وہ یہ کہ ان سے اپنے گھر کی خدمت لیتے ہیں کہیں پانی بھرواتے ہیں کبھی آٹا پسواتے ہیں، کبھی مٹی ڈھواتے ہیں۔ یاد رکھو والدین کی اجازت کے بغیر نابالغ بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں، بعضے میاں جی یہ کرتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر میں خود تو سو رہتے ہیں اور بچوں سے پنکھا جھلواتے ہیں یہ کتنا بڑا ظلم ہے آخر جس طرح تم کو نیند آتی ہے ان کو بھی تو آتی ہے مگر بعضے لڑکے ان کے بھی چچا ہوتے ہیں۔ لوہاری میں ایک میاں جی تھے ان کے پاس جہاں سے کچھ مٹھائی آتی اور وہ حفاظت کے ساتھ رکھتے لڑکے سب کھا جاتے اور کوئی ثبوت ہوتا نہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں سے بتاشے آئے تو انہوں نے بتاشوں کو لوٹے میں رکھ کر اوپر سے آٹا لگا کر منہ بند کر دیا جو سوکھنے کے بعد بچوں سے دقت کے ساتھ کھلتا اور راز ظاہر ہو جاتا۔ اب لڑکے آئے اور سوچنے لگے کہ آج تو میاں جی نے بڑا انتظام کیا ہے۔ اگر منہ کھولتے ہیں تو پتہ چل جائے گا۔ ایک لڑکے نے کہا میں اس کی ترکیب بتاتا ہوں اس کی ٹونٹی میں پانی ڈالو اس سے بتاشے گھل جائیں گے پھر شربت کو سب پی جاؤ۔ چنانچہ ایسے ہی کیا اور لوٹا بند کا بند

رہا اب جو میانجی نے کسی دن خوش خوش اس کے منہ کو کھولا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا تو بعض لڑکے ان میانجیوں کی بھی خوب گت بنا دیتے ہیں۔ مگر اکثر یہی زیادتی کرتے ہیں بعضے میانجی دوسروں کا کام بھی بچوں سے لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مرگیا تو اس کا تیجہ بچوں سے پڑھواتے ہیں اور بعضے میت کے گھروں پر بھی بھیجدیتے ہیں۔ کانپور میں بھی یہ رواج تھا کہ بچوں کو تیجے کے لئے لے جاتے تھے۔ میں نے روک دیا کہ بچے مدرسہ میں تیجے کے واسطے نہیں آتے بلکہ نتیجہ کے واسطے آتے ہیں یہاں سے اس کام کے لئے کوئی نہ جائے گا۔ تب یہ سلسلہ بند ہوا غرض بچوں سے ایسا خدمت لینا جائز نہیں جس میں والدین کی رضا نہ ہو اور اگر رضا بھی ہو تو جو خدمت بچوں کی طاقت سے باہر ہو یا خدمت خلاف سنت ہو (جیسے تیجہ کے دلانے پڑھوانا ۱۲) وہ بھی جائز نہیں میانجیوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ایک طبقہ اور ہے جو بچوں کی جان و مال پر ظلم کرتا ہے وہ رسمی مشائخ کا طبقہ ہے یہ تو مریدوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اور ان سے آئے دن فرمائشیں کرتے ہیں۔ کبھی پاؤں دبواتے ہیں کبھی پنکھا جھلواتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اب کے آؤ تو انگور لانا، بعضے گھوڑے کے لئے گھاس منگواتے ہیں اور ایسی خدمتیں لیتے ہیں جو اکثر ان پر بار ہوتی ہیں یاد رکھو یہ بھی جائز نہیں ہے کیسا ہی مخلص مرید ہو از خود اس سے کوئی فرمائش نہ کرنا چاہیئے ورنہ تمہاری وہ حالت ہوگی جیسے ایک مرید نے کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری انگلیاں پاخانہ میں وہ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کیوں نہ ہو بحمد اللہ ہم پاک صاف ہیں اور تم دنیا دار گندگیوں کے بھرے ہوئے ہو۔ کہنے لگے حضور یہ تو سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اب تو وہ بڑے جھلائے کہ نالائق ہے مردود ہے کہنے لگا حضور میں نے تو خواب بیان کیا ہے جو دیکھا تھا وہ عرض کر دیا واقعی اگر یہ خواب تھا تو اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ مرید تو شیخ سے دین حاصل کرتا تھا اور شیخ مرید سے

دنیا وصول کرتا تھا اور اگر اس نے گڑھا تھا تو بہت ہی موقع کے مناسب گڑھا ۔ اس لئے مشائخ کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مریدوں کی دنیا پر نظر نہ کریں اور از خود کسی سے کچھ فرمائش نہ کریں ہاں کسی سے بہت ہی بے تکلفی ہو جہاں بار ہونے کا مطلق احتمال نہ ہو اس سے کوئی بہت ہی ہلکی فرمائش کا مضائقہ نہیں مگر ایسے مخلص ہزار میں ایک ہی دو ہوتے ہیں عالم حالت یہی ہے کہ لوگوں کو فرمائش سے گرانی ہوتی ہے۔ بلکہ خود ہدایا میں بھی جن کی خود فرمائش بھی نہیں کی جاتی خلوص و محبت کی رعایت سخت ضروری ہے ہر وقت ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ بیٹھے رہا کریں کیونکہ بعض لوگ محض اس خیال سے ہدیہ دیتے ہیں کہ اگر نہ دیں گے تو شیخ کو یہ خیال ہوگا کہ اس کو ہم سے محبت نہیں یا دوسرے یہ سمجھیں گے کہ اس کو تعلق نہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں خلوص کہاں (خلوص و محبت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہدیہ دینے والے کو دنیا کی غرض تو کیا آخرت کی بھی غرض مقصود نہ ہو یعنی ثواب کا بھی قصد نہ ہو کیونکہ ثواب کے لئے کچھ دینا صدقہ ہے ہدیہ نہیں ہے ہدیہ وہ ہے جو محض تطییب قلب مہدی لہ کے لئے دیا جائے گو تطییب قلب مسلم بھی ثواب کا موجب ہے اور اس سے ثواب کی نیت مذموم نہیں مگر ثواب اعطار کا قصد نہ ہونا چاہیئے کذا قالہ الشیخ ۱۲) اور فکر کے بعد خلوص و محبت کی پہچان ہو جاتی ہے پھر دھوکہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ مجھے اس کی پہچان میں ملکہ ہو گیا ہے بہت کم دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ سے اس کی فکر ہے گو کبھی دھوکہ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ آخر بشر ہوں اور وہ بھی بار جارہ کے ساتھ نہ کہ فاعل کے ساتھ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے میرے پاس آجکل ہی میں تین خط آئے اور تینوں ساتھ ہی آئے اور ایک ہی جگہ سے چلے ہوئے تھے غالباً بہار کی طرف سے آئے تھے اور تینوں کا طرز خط بھی یکساں تھا ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ڈیڑھ سو روپیہ ہدیۃً بھیجنا چاہتا ہوں جس کے لئے اجازت کا طالب ہوں۔ دوسرے میں ایک سو اٹھارہ روپے لکھے تھے اور تیسرے میں شاید صرف اٹھارہ تھے مجھے ایک ہی دن میں تین خطوں کے آنے سے شبہ ہوا پھر مضمون اور رسم الخط یکساں دیکھ کر یہ شبہ قوی ہو گیا کہ شاید ان سب میں کچھ مشورہ ہوا ہے یا ایک ہی شخص نے نام

بدل کر تین خط بھیجے ہیں۔ اب میں بڑا پریشان ہوا کہ کیا جواب دوں اگر منظور کر لوں کہ ہاں بھیجدو تو اس کے ساتھ یہ شبہ لگا ہوا تھا کہ شاید یہ محض باہمی مشورہ اور ان لوگوں کو امتحان مقصود ہو تو اس جواب سے دین کی سُبکی ہوگی اور اگر انکار کردوں تو شبہ تھا کہ شاید ان لوگوں نے خلوص سے لکھا ہو سو محض اپنے گمان پر میں مخلصین کی دلشکنی کیسے کردوں پھر گمان بھی اتنا ہی ہوا تھا کہ شاید باہم مشورہ ہوا ہے سو مشورہ میں بھی خلوص ہو سکتا ہے ممکن ہے یہاں کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ جب عدم خلوص کا علم نہ تھا تو قبول کرنا حلال تھا ہاں بیشک یہ صحیح ہے مگر جب تھوڑی سی کوشش سے علم ہو سکے تو پھر سستی کیونکر جائز ہوگی بات یہ ہے کہ باہم مشورہ میں گو خلوص ہو سکتا ہے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کی رائے ہوتی ہے ایک کی نہیں ہوتی وہ محض شرما شرمی سے شریک ہو جاتا ہے اور یہی اغلب و اکثر ہے مشورہ میں سب کا خلوص نادر ہے تو اس احتمال قوی کے ہوتے ہوئے ان ہدایات کا مطلقاً قبول کر لینا کیونکر جائز ہوتا اور ترجیح کے لئے کسی مرجح کی ضرورت تھی یہاں مرجح کوئی تھا نہیں کیونکہ میں ان کاتبین میں سے کسی سے بھی واقف نہ تھا اس لئے میں نے اس شبہ کے زائل کرنے کی تدبیر سوچی اور جو شخص اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرماتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امداد فرمائی اور یہ دل میں آیا کہ ابھی نہ اقرار کرنا چاہیئے نہ انکار بلکہ ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہیئے کہ مجھ کو یہ شبہ ہوا ہے آیا یہ صحیح ہے یا نہیں اس کے بعد جو کچھ جواب آئیگا اس سے اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی چنانچہ میں نے ہر شخص کو یہی لکھدیا کہ آپ کا خط آیا اور تعجب ہے کہ اس کے ساتھ اسی دن کی ڈاک میں دو خط اسی مضمون کے اور آئے جن کا رسم الخط بھی اسی خط سے ملتا ہوا تھا اس اتفاقی اجتماع سے مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید باہم کچھ مشورہ ہوا ہے آیا میرا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ اس جواب کو لکھے ہوئے تقریباً دس بارہ دن ہو گئے مگر آج تک بھی ان کا خط نہیں آیا۔ بس سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے میں نے خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے دنیا داروں کی چالاکی و تحقیر سے بچا لیا۔ اور صاحب ہماری عزت

توکیا چیز ہے مگر اہلِ علم کی حرص وغیرہ سے لوگ دین اور علم کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں پس مشائخ کو اس میں بہت احتیاط کرنا چاہیئے اور بدون سوچے سمجھے ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کیا کریں نیز اپنے مریدوں کو اس کا عادی کرنا چاہیئے کہ وہ بالالتزام ہدیہ لے کر نہ آیا کریں کیونکہ التزام میں خلوص نہیں رہتا اور یہ جو مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاوے وہ فیوض سے خالی آوے یہ مطلب نہیں کہ جو فلوس سے خالی جاوے وہ بھی محروم ہی آتا ہے ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی کو ایسا ہی التزام کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کا اہتمام نہ کرے کہ ہر دفعہ بڑھیا چیز ہی لے جاوے بلکہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی لیجایا کرے (مثلاً مسواک لے گئے یا ایک دو پیسہ کی روشنائی ہی لے گئے یا ایک دو قلم لے گئے۔ کبھی دو چار خوشبودار پھول لے آئے وغیرہ وغیرہ ۱۲) بزرگانِ سلف ایسا ہی کرتے تھے کہ جب ہدیہ کا شوق ہوا تو جو چیز بھی ملی خواہ وہ کیسی ہی معمولی ہو وہی لے گئے اس کے لئے اہتمام اور تکلف نہ کرتے تھے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے راستہ میں خیال ہوا کہ کچھ ہدیہ لے چلنا چاہیئے کوئی دوسرا ہوتا تو گھر واپس آتا مگر انھوں نے یہ کیا کہ جنگل میں سے کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اٹھالیں اور لاکر ان بزرگ کے سامنے رکھ دیا کہ یہ لکڑیاں حضرت کے لئے پانی گرم کرنے کو لایا ہوں وہ بزرگ اس ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور اس کی ایسی قدر کی کہ فوراً اپنے خادم کو بلایا اور کہا کہ لکڑیاں بہت حفاظت سے رکھو جب ہم مرجائیں تو ہمارے غسل کے لئے اس سے پانی گرم کیا جاوے۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ اس ہدیہ حلال وخالص کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں گے، سبحان اللہ کیسے قدر دان لوگ تھے۔ لو اس طرح اگر التزام بھی کرو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر گھاس پھوس نہ ملے تو کم از کم دو چار مٹی کے ڈھیلے ہی استنجا کے لئے لیجاؤ اور اگر یہ خیال ہو کہ ایسے حقیر ہدیہ سے شیخ ناخوش ہوں گے اور اس کی قدر نہ کریں گے تو یاد رکھو ایسا شخص شیخ بنانے کے قابل نہیں جس کو خلوص کی قدر نہ ہو فلوس ہی کی قدر رہو۔ صاحب تم کر کے تو دیکھو محبت کی قدر ضرور ہوتی ہے چاہے ہدیہ ظاہر میں

قلیل ہی ہو اور دنیا قدر نہ ہو تو خدا کے یہاں تو ضرور قدر ہوگی۔

حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم (فدا ک آباءنا وَ اُمّھاتُنَا وَ اَزْوَاجُنَا وَمَابِاَیْدِیْنَا ۱۲) یہ ہمارے باپ مائیں اور ازواج اور جو کچھ ہمارے پاس ہے سب آپ پر قربان ہے) کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا پکوایا تھا ماشاء اللہ سلطان جی کے یہاں شاہانہ انتظام تھا بڑے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے تھے۔ (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ ثواب سے زیادہ اور کس چیز میں وہ خرچ کرتے ۱۲) کھانا تیار ہو گیا تو خدام نے اجازت چاہی کہ اس کو اٹھا کر تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ ابھی ذرا ٹھہرو پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا تو فرمایا ابھی ٹھہرو کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ اب تقسیم کر دو کسی خادم نے وجہ پوچھی کہ آپ کو کس کا انتظار تھا پہلے بار بار انکار کیوں تھا اور اب اجازت کیسے دیدی۔ فرمایا اس وقت میرے بھائی علی احمد صابر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کو ثواب کے لئے بھنے ہوئے چنے تقسیم کئے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن ادھر متوجہ ہیں تو ایسی حالت میں میں نے اپنا کھانا تقسیم کرنا نہیں چاہا بلکہ میں نے یہ چاہا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر متوجہ ہوں تو پھر کھانا اٹھاؤں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صابر کے چنے اس قدر محبوب تھے کہ آپ ہمہ تن اس طرف متوجہ تھے۔ حالانکہ حضرت سلطان جی کے کھانے ظاہر میں ان سے بہت بڑھے ہوئے مگر چونکہ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس زیادہ سامان نہ تھا انھوں نے ساری عمر گولر اور درخت کے پتے کھا کر ہی گذار دی حتیٰ کہ چند سیر سے زیادہ اناج عمر بھر میں بھی ان کے پیٹ میں نہیں پہنچا واقعی بڑے صابر تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا قلیل ہدیہ ہی دوسروں کے سازو سامان سے زیادہ عزیز تھا مگر آجکل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا ہدیہ ہوگا ویسا ہی ثواب ہوگا۔ اگر ہدیہ قلیل ہو تو ثواب بھی قلیل ہوگا۔ صاحبو یہ صحیح نہیں بلکہ وہاں تو خلوص کو دیکھا جاتا ہے اگر ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملے گا اور ہدیہ زیادہ ہوا اور خلوص کم ہو تو ثواب کم ہوگا (البتہ اگر دونوں زیادہ ہوں خلوص بھی اور ہدیہ بھی تو بیشک یہ تو

نورٌ علیٰ نور ہوگا۔ ہاں اس کے بعد پھر اس کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ جس نے زیادہ دیا ہے وہ صاحب وسعت ہے اور جس نے کم دیا ہے وہ صاحب وسعت نہیں تو باوجود خلوص میں برابر ہونے کے بھی کم وسعت والے کا ہدیہ صاحب وسعت کے ہدیہ سے بڑھ جائیگا) بعض لوگوں میں ایک غلطی اعتقادی یہ بھی ہے کہ ثواب کو نوعیت میں بھی کھانے کے موافق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیر خوار بچوں کے لئے ایصال ثواب میں دودھ دیتے ہیں گوشت نہیں دیتے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دانت کہاں ہیں جو گوشت کھائیں اسی طرح شہداء کو سبیل میں شربت کا ثواب پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ پیاسے شہید ہوئے تھے۔ اس میں علاوہ اس اعتقادی غلطی کے دوسری غلطی یہ بھی ہے کہ گویا ان کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہی ہیں نعوذ باللہ لے صاحب انھوں نے تو مرتے ہی جنت کا ایسا شربت پیا ہوگا جس سے عمر بھر بھی پیاس نہ لگے اس کے متعلق خیر آباد کے ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک مرید نے زندگی ہی میں ان کی فاتحہ کی تھی جب وہ فاتحہ دلا کر ان سے ملنے آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ذرا فاتحہ دیتے ہوئے گرم ٹھنڈے کا تو خیال کر لیا کرو تم نے فاتحہ میں فیرنی ایسی جلتی ہوئی دی کہ اب تک میری زبان میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مرید نے اپنے گھر پر فاتحہ دی تھی مگر وہ جلتی جلتی ہی فقیروں کے منہ میں سے پیر صاحب کے منہ میں پہونچ گئی۔ ہمیں یہ قصہ گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ واہیات بھلا ایصال ثواب سے دوسرے کو ثواب پہنچتا ہے یا وہی کھانا پہنچتا ہے یقیناً ثواب پہنچتا ہے اور ثواب گرم ٹھنڈا ہوتا نہیں بلکہ وہ نیکیاں ہیں جو مہدی لہ کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں جس کا صلہ جنت کے درجات ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ محض لغو ہے۔ ثواب کے لئے تو نص قطعی ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ کہ خدا کے یہاں قربانی کے جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ وہاں تو تقویٰ (اور خلوص) پہنچتا ہے اس نص سے عوام کی غلطی ظاہر ہو گئی جو ثواب کو کھانے کے موافق سمجھتے ہیں اور اسی نص کے موافق

اہل اللہ کے یہاں بھی خلوص کی قدر ہوتی ہے۔ گو ظاہر میں ہدیہ قلیل ہو چنانچہ ان بزرگ نے لکڑیوں کے گٹھر کی یہ قدر کی کہ اس کو اپنے جنازہ کے غسل کے لئے احتیاط سے رکھوایا بعض دفعہ اہل اللہ تو کسی کے ہدیہ کی تحقیر نہیں کرتے مگر ان کے خدام تحقیر کرتے ہیں تو خدام کی رعایت نہ کرنا چاہیئے۔ اور مشائخ کو چاہیئے کہ کسی کو اپنا خادم خاص نہ بنائیں جس کو ان کے کاموں میں زیادہ دخل ہو بعض دفعہ یہ حواشی غضب کرتے ہیں کہ مریدوں کے ہدایا کی تحقیر کرتے اور بعض مریدوں کی شکایتیں شیخ سے کرتے رہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بڑھا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں پھر شیخ بھی آخر بشر ہے سنتے سنتے کچھ اثر اس کے قلب پر بھی ہو ہی جاتا ہے اس لئے میں تو بجائے حواشی کے ان کو مواشی کہتا ہوں غرض ظلم سے بہت کم لوگ بچے ہوتے ہیں مشائخ تو مریدوں کی جان میں تصرف کرتے ہیں اور میاں جی بچوں کی جان میں اور رؤسا غریبوں کی جان میں بعض جگہ عوام رؤسا میں یہ دستور ہے کہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے سے کوئی غریب مزدور سر پر بوجھ رکھے ہوئے گذرا تو اس کو بلا کر کہہ دیا کہ بوجھ تو یہاں رکھ دے اور فلاں جگہ جا کر یہ کام کر آ یہ صریح ظلم ہے کیونکہ اس سے لوگوں پر عموماً ناگواری ہوتی ہے۔ وہ غریب بیچارہ رئیس کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا دل ہی جانتا ہے کہ اس کا وقت کیسا کھوٹا ہوا اگر کام ہی لینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے یہ کہو کہ ہم کو فلاں جگہ ایک آدمی بھیجنے کی ضرورت ہے اور اتنی مزدوری دیں گے اگر تجھے مزدوری لینا ہو تو بوجھ رکھ کر یہ کام کر لے۔ غرض غریب کا دل خوش کر کے پھر کام لو اور غریب کا خوش کر دینا ہی کیا مشکل ہے دو چار آنے کے پیسوں میں بیچارہ خوش ہو جاتا ہے مگر تراضی طرفین سے ہو۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ٹمٹم اور گاڑی کا کرایہ طے نہیں کرتے نہ قلی کی مزدوری چکلاتے ہیں۔ بس بے کہے سنے سوار ہو گئے یا مزدور کے سر پر بوجھ لاد دیا اور بعد میں سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دیتے ہیں تو یاد رکھو یہ جائز نہیں بلکہ کرایہ اول چکانا چاہیئے اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگا کہ لیجئے حکومت نے تو ٹمٹم والوں

اور قلیوں کی زیادتی سے مسافروں کو محفوظ کرنے کے لئے ایک نرخ مقرر کیا تھا۔ شریعت نے اس کو بھی ناجائز کر دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بس جتنا بھی کوئی مانگے وہی دو چاہے لٹ ہی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ظلم کو روکنا چاہا نیز اس سے بھی بچانا چاہا کہ بعد میں نزاع نہ ہو سو ظاہر ہے کہ مزدور سے بلا رضامندی کام لینے کا کسی کو کیا حق ہے اسی طرح کسی کی گاڑی میں بدون اس کی خوشی کے سوار ہونے کا کسی کو کیا حق ہے۔ باقی حکومت نے جس مصلحت سے نرخ نامے مقرر کئے ہیں شریعت اس کو فضول نہیں کہتی مگر اس کی صورت شریعت کے موافق یہ ہے کہ ٹمٹم والے سے یا قلی سے کام لینے کے پہلے صاف کہدو کہ ہم سرکاری نرخ نامے کے موافق تم کو کرایہ یا مزدوری دیں گے اس سے زیادہ نہ دیں گے اگر خوشی ہو قبول کرلو اگر وہ اس پر بھی آپ کو بٹھلالے یا سامان اٹھالے تو پھر سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دینا جائز ہے۔ کیونکہ اب آپ نے معاملہ صاف کرلیا اور دوسرے نے بخوشی اسکو منظور کرلیا ہے پس تم سرکاری نرخ نامہ کے موافق ہی دو مگر پہلے کہکر دو یہ نہیں کہ اول تو خاموش سوار ہو جاؤ اور بعد میں سرکاری نرخ کے حساب سے دو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ٹمٹم والے نے اس مزدوری کے خیال سے آپ کو نہ بٹھایا ہو۔ بلکہ ٹمٹم والوں کے عام رواج کے موافق مزدوری لینا چاہتا ہو پھر بعد میں نزاع ہوگا۔ چنانچہ ہم نے اکثر لوگوں سے جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا ہے (اگر انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت ہو تو وہ بعد کے نزاع کو ہرگز گوارا نہ کرے گا یہی شریعت کی تعلیم ہے کہ مزدوری اور کرایہ اول طے کرلو چاہے سرکاری نرخ ہی کے موافق طے کرلو بدون صفائی کے کسی چیز سے منتفع نہ ہو ۱۲) اسی طرح بعض حکام یہ ظلم کرتے ہیں کہ دورہ کے وقت کہیں سے بلا قیمت دودھ منگاتے ہیں، کہیں سے پھل منگاتے ہیں اور بعض جگہ قصبات کے روساء ان کے لئے یہ چیزیں بھیجتے ہیں۔ پہلی صورت تو صریح ظلم ہے اور دوسری صورت رشوت میں داخل ہے اور اس میں بھی اکثر ظلم ہی ہوتا ہے کیونکہ زمیندار اور رئیس اپنے گھر سے یہ سامان نہیں بھیجتے بلکہ بستی کے دکانداروں پر ظلم کرکے ان سے

لیتے ہیں اور حکام کے ڈیرہ پر پہنچاتے ہیں جب حکومت کی طرف سے دورہ کرنے والوں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور دورہ کا بھتہ بھی ملتا ہے پھر ان کو بستی والوں سے یہ چیزیں لینے کا کیا حق ہے مسلمانوں کو اس طریقہ سے بچنا چاہیئے بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم خود تو منتظم ہوتا ہے کسی سے رشوت نہیں لیتا نہ کسی پر ظلم کرتا ہے مگر ان کے متعلقین چپراسی وغیرہ ظلم کرتے ہیں اس لئے حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دیدے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملہ میں کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز کوئی نہ دے بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے نیز جو شخص حاکم سے ملنے آئے اس کو خود جاکر دروازہ سے باہر تک پہنچائے تاکہ نکلتے ہوئے کوئی چپراسی وغیرہ اس کو تنگ نہ کرے قرآن میں نص ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ۔ علت سے اس کے عموم میں یہ صورت بھی قیاساً داخل ہے نیز حکام کو یہ بھی چاہیئے کہ لوگوں کے تعلقات براہِ راست اپنے سے رکھیں کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں اگر یہ کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے تو میں کہوں گا ہاں بیشک مشکل ہے مگر حکومت کرنا آسان نہیں یہ منہ کا نوالہ نہیں حاکم ہر وقت جہنم کے کنارہ پر ہے اگر جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے اور تم نے تو یہ بلا خود اپنے سر لی ہے تم نے کوششیں کرکے سفارشیں کرا کے حکومت حاصل کی ہے پھر اس کے حقوق ادا کرنے سے کیوں جان چراتے ہو جو بلا خود تم نے اپنے سر لی ہے اس کا مزہ چکھو۔

صاحبو! حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں اسی پر شہید کئے گئے۔ خلیفہ وقت نے کئی دفعہ ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا مگر انکار کر دیا کیونکہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

"مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ" یعنی جو شخص قاضی بنا دیا گیا وہ بدون چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ اس لئے امام صاحب عذر کرتے تھے آخر اسی بات پر امام صاحب قید کئے گئے اور قید خانہ ہی میں زہر دیکر شہید کئے گئے یہ سب کچھ گوارا تھا مگر حکومت منظور نہ تھی۔

صاحبو! سلف کی یہ حالت تھی کہ جب خلفا کسی عالم کو قاضی بنانا چاہتے اور وہ قضا کی مذمت اور وعیدیں ان کو احادیث سناتے تو سلاطین ان کی خوشامد کرتے تھے کہ اچھا ہم تم کو چھوڑے دیتے ہیں مگر للہ یہ باتیں دوسروں سے نہ کہنا ورنہ سب لوگ قضا کو چھوڑ دیں گے لیکن یہ وعیدیں اسی حاکم کے لئے ہیں جو حکومت کے حقوق ادا نہ کرے اور جو عدل وانصاف کا اہتمام کر کے اس کے حقوق ادا کرے تو اس کے لئے قیامت میں عرش کا سایہ بھی ہے مگر اب دیکھئے کہ جن لوگوں نے اس کے حقوق ادا کئے ہیں ان کی کیا حالت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ نے جب شام کا دورہ کیا ہے تو آپ کے ساتھ کل یہ سامان تھا کہ ایک غلام تھا اور ایک اونٹ اسی پر آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے تھے اور کھانے کے لئے ستو کا ایک تھیلا تھا اور ایک کھجوروں کا بس سارے راستہ اسی کو گھول کر پی لیا اور چار کھجوریں کھا لیں نہ ساتھ میں خیمہ تھا نہ گھوڑے تھے۔ نہ بہت لاؤ لشکر تھا پھر راستہ میں جہاں ٹھہرتے تھے وہاں استقبال کرنے کی ممانعت تھی نہ کسی کا ہدیہ لیتے تھے نہ کسی گاؤں سے دودھ اور جنس منگاتے تھے یہ تو خلیفہ کی حالت تھی۔ اب سردار لشکر کی حالت سنئے۔ جس وقت حضرت عمرؓ ملک شام میں پہنچے اور حضرت امیر عبیدہؓ امیر العساکر اسلامیہ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا نہ وہاں فرش وفروش ہیں نہ کچھ زیب وزینت ہے۔ بس چمڑہ کا بستر تھا اور خیمہ کی چوب میں ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا اے ابو عبیدہؓ اس تھیلہ میں کیا ہے فرمایا اس میں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں افطار کے وقت ان کو بھگو کر کھا لیتا ہوں۔ فرمایا اے ابو عبیدہؓ تم اس وقت

ملک شام میں ہو جہاں قسم قسم کی نعمتیں ہیں ہر چیز ارزاں ہے تم یہ سوکھے ٹکڑے کس لئے کھاتے ہو اپنے کو راحت کیوں نہیں دیتے، کہا اے امیر المؤمنین کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت یاد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زندگی بسر کی ہے بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح زندگی گذار دوں، اے امیر المومنین! زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے چاہے اس کو راحت سے گذار دو یا مشقت سے اس وقت متنعم اور غیر متنعم برابر یکساں ہونگے یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ بھی رونے لگے اور وہ بھی روتے رہے۔ اس مضمون میں ایک بزرگ کا قطعہ عجیب ہے جو انھوں نے ایک رئیس کے جواب میں لکھا ہے غالباً رئیس نے ان کی تکلیف کا حال سن کر لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں تو یہاں آپ کو خوب راحت ملے گی وہ جواب میں لکھتے ہیں ؎

خوردنِ تو مرغ مسمیٰ ومی ــــ خوردنِ ما نانک جوین ما
پوششِ تو اطلس و دیبا حریر ــــ بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما

(تمہارا فربہ مرغ کھانا اور ہماری جو کی روٹی کھانا ایک دم کے لئے ہے تیرا لباس ریشم واطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمیں بخیہ زدہ ہے)

اسی طرح سب چیزوں کا موازنہ کرکے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمین است کہ می بگذرد
راحت تو محنت دوشین ما

(یہی حالت جو گذر رہی ہے اچھی ہے یعنی تمہاری راحت اور ہماری کل کے لئے محنت)

فرماتے ہیں کہ ہاں بلاشک اس وقت تیرا کھانا ہمارے کھانے سے اچھا اور لباس ہمارے لباس سے اچھا ہے مگر یہی حالت اچھی ہے جو گذر رہی ہے ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند
آں تو نیک آمد و یا این ما

(یعنی ذرا صبر کرو کہ قیامت میں معلوم ہو جائیگا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا ہماری محنت)

قیامت آنے دو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کس کی حالت اچھی ہے (اہل اللہ کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے اس لئے یہ فرمادیا فخر کی نیت نہ تھی کیونکہ وہ آپ سے زیادہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں ان کو فخر کی کہاں مہلت ہے کبھی تحدث بالنعمہ کے طور پر کچھ کہہ دیتے ہیں جو صورت دعویٰ میں ہوتا ہے مگر واقع میں دعویٰ نہیں ہوتا) سرمد اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب می خورد می گذرد
در بادۂ ناب میخورد میگذرد

یعنی کباب وشراب کھانے والے بھی مریں گے اور فاقہ کرنے والے بھی مرینگے جس کا آگے ذکر ہے ؎

سرمد کہ بکاسۂ گدائی ناں را
ترکردہ بآب میخورد می گذرد

(سرمد فقیری کے پیالہ میں روٹی کو پانی میں ترکرکے کھاتا ہے اور ایام گذارتا ہے)
غرض سلف کے پیش نظر یہ باتیں تھیں ان کو حکومت میں مزا کہاں تھا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

(منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

واقعی جس کو یہ فکر ہو کہ یہاں سے ایک دن جانا ہے وہ کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کو سخت گرمی میں سر پر چادر ڈالے ہوئے ایک اونٹ کی تلاش میں جارہے تھے۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے

بالاخانہ پر بیٹھے تھے دور سے دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید امیر المومنین جا رہے ہیں جب قریب آئے تو پکارا اے امیر المومنین آپ اس دھوپ اور لو میں کہاں جا رہے ہیں فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں عرض کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھی تلاش ممکن تھی اس دھوپ میں کیوں تکلیف کی فرمایا جہنم کی آگ اس سے بھی سخت ہے حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ اچھا میں اپنے غلام کو بھیجے دیتا ہوں آپ یہاں آرام کیجئے۔ فرمایا کہ قیامت میں تم سے یا تمہارے غلام سے باز پرس نہ ہوگی بیت المال کے متعلق باز پرس تو مجھی سے ہوگی اس لئے میں اپنی رہائی کی فکر خود ہی کرنا چاہتا ہوں یہ فرما کر تشریف لے گئے اور دوپہر کی دھوپ ہی میں اس کو تلاش کیا عرب کی گرمی اور دھوپ مشہور ہے اندازہ کر لیجئے کیسی سخت دھوپ ہوگی مگر امیر المومنین اس وقت خود تلاش کے واسطے نکلے دوسروں پر بھی بھروسہ نہ کیا تو حضرت جن کو حکومت میں جہنم سے بچنے کا خیال ہے وہ ایسی ایسی تکالیف برداشت کر کے حکومت کرتے ہیں آپ نے اس کو منہ کا نوالہ سمجھا ہے اور باوجودیکہ حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف و جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فخر تھا کہ میں نے ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے چنانچہ جب حضرت صدیقؓ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے تو ایک شخص نے کہا اے ابو بکر تم نے مسلمانوں پر ایک سخت مزاج شخص کو خلیفہ بنا دیا خدا کو اس کا کیا جواب دو گے تو حضرت صدیقؓ نے فخر کے ساتھ فرمایا کہ تو مجھے کیا ڈراتا ہے اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں حق تعالیٰ سے عرض کر دوں گا کہ میں نے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا تھا کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی نہ تھا۔

صاحبو! خدا کے یہاں ایسی ویسی بات تو نہیں چل سکتی خدائے تعالیٰ کے سامنے پکی ہی بات کوئی کہہ سکتا ہے۔ پس حضرت صدیقؓ کو کوئی وثوق تھا جو وہ حضرت عمرؓ کے متعلق حق تعالیٰ کے سامنے شہادت دینے کو تیار تھے مگر اس پر بھی کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کو وصال سے دس یا پندرہ سال بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ

پوچھتے ہوئے آرہے ہیں پوچھا اے امیر المومنین آپ کا کیا حال ہے فرمایا عمر قریب بہلاکت ہوگیا تھا۔ مرنے کے بعد سے جو حساب شروع ہوا ہے تو آج حساب سے فراغت ہوئی ہے۔ الحمد للہ کہ خدا تعالےٰ نے مجھے بخش دیا تو حضرت حکومت کوئی مزہ کی چیز نہیں ہے جس کو جتنی بھی حکومت حاصل ہے اسی قدر اس کے ذمہ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے پس حکام پر لازم ہے کہ جو شخص ان سے ملنے آئے اس کو جائے امن تک خود پہونچائیں تاکہ عملہ والے اس کو پریشان نہ کریں یہ تو جان و مال کے حقوق تھے۔ ا

ایک حق آبرو کا ہے یہ بھی حق العباد کی ایک فرد ہے جس کے ضائع کرنے میں ہم لوگ بہت مبتلا ہیں خصوصاً علماء و مشائخ کیونکہ عوام تو عوام ہی کی آبروریزی اور غیبت کرتے ہیں اور یہ لوگ اولیاء اللہ اور مشائخ کی غیبت اور آبروریزی کرتے ہیں تاکہ لوگ ادھر سے ہٹ کر ان کی طرف آدیں یاد رکھو یہ خلوص کے بالکل خلاف ہے خلوص کی پہچان تو یہ ہے جو شیخ علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بستی میں دین کا ایک کام کر رہا ہو پھر اس سے اچھا کام کرنے والا آجاوے تو اس کام کو چھوڑ کر اس دوسرے ہی شخص کے سپرد کردے اور اپنے متعلقین کو خود اس کے یہاں بھیجدے اور آپ کسی دوسرے کام میں لگے اور اس سے خوش ہو کہ الحمد للہ دین کا کام کرنے والا اس بستی میں دوسرا آگیا جس سے میرا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اب مجھے خلوت ذکر کا خوب موقع ملے گا ہائے عارفین اہل اللہ تو ہر وقت اس کو ترستے ہیں کہ کوئی وقت فراغت اور خلوت کا ملے جس میں یہ محبوب حقیقی کے ساتھ مشغول ہوں ان کا تو مذاق یہ ہے کہ ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی عاشق اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)
حضرت گو شغل علمی بھی دین ہے اور ثواب کا کام ہے مگر پھر بھی عارفین خلوت کے لئے تڑپتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے مشاغل میں کوئی نہ کوئی بات دین کے خلاف سرزد ہو ہی جاتی ہے تو ان سے قلب کی پوری اصلاح نہیں ہوتی اصلاح قلب کے لئے ایک وقت خلوص کا ضرور ہونا چاہیئے اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

از قیل وقال مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمت معشوق میکنم

(مدرسہ کی قیل وقال سے میرے دل کا حال گرفتہ ہو گیا کچھ زمانہ خدمت محبوب بھی کرتا ہوں)
بھلا اور عارفین تو کس شمار میں ہیں جب سید العارفین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ خلوت کا امر فرما رہے ہیں " فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (تو جب آپ فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھئے)
جن لوگوں کو خلوت کا لطف حاصل ہو چکا ہے ان کے دل سے اس کی قدر پوچھو حضرت نواب شیفتہ کا ایک شعر اس کے متعلق مجھے بہت ہی پسند آیا ہے ؎

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن
در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا اچھا ہو کہ تو محفل میں اکیلا ہو گھر کا دروازہ ہو اور شراب کا شیشہ کھلا ہوا ہو)
اس میں بنہفتہ ساز کردن عجیب تعبیر ہے (ایسے ہی سر شیشہ باز کردن میں حضور قلب کی کیفیت کا فوٹو کھینچ دیا ہے ۲) غرض مخلص کی شان یہ ہے کہ وہ محض ضرورت دینی کی وجہ سے کسی منصب کو ادا کرتا ہے خواہ وہ درس و تدریس ہو یا تعلیم وتربیت باطن ہو یا وعظ و امامت ہو اپنے نفس کی بڑائی کے لئے کسی منصب پر پیش قدمی نہیں کرتا

اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا آجاتا ہے اور یہ دیکھ لیتا ہے کہ دینی ضرورت اس سے پوری ہوگئی تو اب وہ اپنے کو اس منصب سے علیحدہ کر لیتا ہے اور خود خلوت وذکر میں مشغول ہو جاتا یا دین کا کوئی دوسرا کام لے لیتا ہے جس کا کرنے والا اس بستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کسی جگہ پڑھا جاتا ہے وہاں دوسرا پڑھانے والا آجائے تو یہ اس سے جلتا ہے کوئی واعظ ہے اور اس کی بستی میں کوئی دوسرا واعظ آجائے تو یہ اس سے حسد کرتا ہے۔ کسی جگہ ایک مدرسہ ہے وہاں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو پہلے مدرسہ والے اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شیخ ایک مقام میں تربیت باطن کر رہا ہے وہاں دوسرا شیخ آجاوے تو اس کو گراں گذرتا ہے پھر ایک دوسرے کی آبروریزی اور غیبت میں مشغول ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ یہ نہ رہے یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ رہے۔ صاحبو! کیا اسی کا نام دین ہے کیا اسی کو خلوص کہتے ہیں۔ پھر تماشا ہے کہ باوجود اس بد دینی کے ہر اک بجائے خود نازاں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا سے الگ ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں حالانکہ اس کے دل میں سراسر دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا مصداق بنا ہوا ہے اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور وہ اس خیال میں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں) غرض کیا خاص کیا عوام سبھی نے آبرو کے حق سے غفلت کر رکھی ہے اور غیبت وشکایت کو کچھ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اس تقریر سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ حقوق العباد صرف اموال ہی میں منحصر نہیں بلکہ مال کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے پس باہم ایک دوسرے کا بھی حق ہے پس باہم ایک دوسرں کی اتلاف جان اتلاف مال اتلاف آبرو سے بچو۔

اور ایک چوتھی چیز اور ہے جو ان تینوں سے بھی اہم ہے مگر لوگ اس کو بہت کمتر اور معمولی بات سمجھتے ہیں وہ کیا چیز ہے اتلاف دین ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ اس کی دین کی ضرر نہ کرے یعنی اپنی وجہ سے کسی کا دین ضائع نہ کرے

یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد آبرو کا درجہ ہے پھر جان کا پھر مال کا کیونکہ شریف آدمی جان کو مال سے مقدم سمجھتا ہے اور جان بچانے کے لئے مال کو خرچ کر دیتا ہے مگر آبرو کو جان سے بھی مقدم سمجھتا ہے، چنانچہ شریف آدمی آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے اور جو شریف دیندار ہوگا اور مسلمان سب ہی دیندار ہیں وہ آبرو اور جان سے زیادہ دین کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ دین دار آدمی حفاظت دین کے لئے آبرو کی پروا نہیں کیا کرتا۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت (مجدد زماں) سید احمد صاحب بریلوی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے ہیں ایک مرتبہ لشکر کے ساتھ جا رہے تھے اور خود امیر عسکر تھے کہ راستہ میں نماز کا وقت آگیا تو آپ نے اپنی بی بی صاحبہ کو برقعہ اڑھا کر نماز کے لئے سب کے سامنے بہلی سے اُتارا اور بلند آواز سے فرمایا کہ صاحبو! دیکھ لو یہ عبدالحیؒ کی بیوی ہے جو نماز کے واسطے سب کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ حضرت دیندار کی تو یہی حالت ہوگی کہ وہ عزتی آبرو کو دین کے لئے فدا کر دیگا مگر اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ آبرو کو دین سے زیادہ سمجھتے ہیں، اسی واسطے تقریبات میں محض اپنی آبرو کے لئے دین کے خلاف بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ آبرو سے دین مقدم ہے اور آبرو جان و مال پر مقدم ہے مگر بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کو آبرو سے مقدم کرتے ہیں جیسے بعضے رذیل بھیک مانگ کر مال جمع کرتے ہیں اور آبرو کی پروا نہیں کرتے، بعضوں نے مسجد اور مدرسہ کے چندہ کی آڑ پکڑ لی ہے کیونکہ ویسے بھیک مانگنے میں تو کون دیتا ہے مسجد اور مدرسہ کے نام سے کچھ مل ہی جاتا ہے پھر جو کچھ ملتا ہے وہ اسی مانگنے والے کے پیٹ کو لگ جاتا ہے نہ مسجد کو لگتا ہے نہ مدرسہ کو۔ کسی مقام میں ایک صاحب تھے وہ مسجد کے لئے چندہ کیا کرتے تھے اور چند روز کے بعد پھر آدھمکتے اور قسمیں کھاتے کہ میں سارا چندہ مسجد ہی کو لگا آیا ہوں، ایک شخص اس کے حال سے واقف تھا اس نے کہا کمبخت جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر تو مسجد کو کہاں لگاتا ہے سارا خود ہی کھا لیتا ہے کہنے لگا کہ واللہ میں سب مسجد کو لگا دیتا ہوں آؤ تم کو دکھا دوں۔ چنانچہ روپیوں کی تھیلی کو مسجد کی

دیوار سے رگڑ کر دکھا دیا کہ میں اس طرح لگایا کرتا ہوں اس لئے میری قسم جھوٹ نہیں ہوتی یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی ایک دودھ والے نے کی تھی وہ بھی قسم کھایا کرتا تھا کہ واللہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ایک شخص نے کہا کمبخت تو نے میرے سامنے پانی ملایا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے دودھ میں پانی نہیں ملایا پانی میں دودھ ملایا تھا۔ وہ یہ کرتا تھا کہ ایک برتن میں پانی پہلے سے بھر لیا اور اس میں دودھ ڈالدیا تو اس صورت میں پانی میں دودھ ملایا گیا نہ کہ دودھ میں پانی اس لئے اپنے نزدیک وہ اس قسم میں سچا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا آجکل لوگ ایسی ایسی استادیاں کرتے ہیں اور چندہ والے اس میں زیادہ مبتلا ہیں مگر ان کو تو مال سے غرض ہے چاہے دین اور آبرو ضائع ہو یا رہے۔ ایک محصل چندہ سفر کانپور میں مجھ سے ملے اور شکایت کرنے لگے کہ فلاں رئیس نے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر مجھے بہت مارا اب میں کیا کروں۔ میں نے کہا تم اس نوکری پر لعنت بھیجو کوئی اور کام کرو کہنے لگے یہ تو دین کا کام ہے اسے کیونکر چھوڑ دوں میں نے کہا پھر جاؤ ایسی تیسی میں اگر یہ دین کا کام ہے تو شکایت کیوں کرتے ہو ماریں کھاتے رہو اور صبر کرو۔ کوئی قسم لے کر ان سے پوچھے کہ وہ دین ہی کے لئے تو محصل چندہ بنے ہوئے تھے یہ بھی محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل مقصود تنخواہ ہے اگر پچاس ساٹھ روپے ان کو گھر بیٹھے مل جایا کریں تو پھر ہم دیکھیں کہ وہ پھر بھی دینی خدمت کے لئے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں مگر اب کیا کریں پیٹ کو بھی کسی طرح دیں اس واسطے یہ ساری ذلت گوارا ہے۔ دین کی حالت تو یہ تھی کہ وہی محصل چندہ اس رئیس کے یہاں بھی آئے تھے جہاں میں مقیم تھا ان سے چندہ مانگا تو انھوں نے دس روپے دیدیئے تو محصل صاحب کہتے ہیں کہ جناب آپ تو ہر سال بیس روپے دیا کرتے تھے اب کے دس کیوں دیئے۔ یہ طریقہ تھا ان کے چندہ کا جس میں سب کے سامنے وہ دینے والے کو ذلیل کرتے تھے، بس کسی رئیس کے ساتھ یہی حرکت کی ہوگی اس نے مارا پیٹا ہوگا ورنہ محض مانگنے پر کون مارتا ہے۔ ہاں ان کے مارنے کے بعد اگر دوسرا عذر کر دے یا تھوڑا سا دیدے اور اس پر اس کو ذلیل کیا جاوے تو بیشک کوئی دل جلا مار بھی دیتا ہے۔ چندہ کا یہ طریقہ بالکل خلاف شریعت ہے اور

حرام ہے اور آجکل زیادہ تر چندہ کے طریقے حرام ہی ہیں مگر مخلصین چندہ اس کو دین سمجھتے ہیں کچھ نہیں اس کا نام تو بے حسی ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہ ہے نہ دین کی ہاں چندہ کا ایک طریقہ جائز بھی ہے کہ مسلمانوں کو اطلاع کردو کہ فلاں جگہ مدرسہ ہے اور فلاں شخص کے پاس اس کے لئے چندہ جمع ہو رہا ہے جس کا جی چاہے وہاں اپنی رقم جمع کردے پھر دیکھیں کتنے آدمی دینے آتے ہیں غرض بعضے ایسے بے حس بھی ہیں جو آبرو کو مال کے واسطے ضائع کر دیتے ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان بھی دیدیتے ہیں۔

تھانہ بھون کا قصہ ہے کہ ایک میانجی کے پاس دو سو روپے جمع ہو گئے تھے جن کو ایک لوٹے میں رکھ کر زمین کے اندر گاڑ رکھا تھا مگر محبت مال کی حالت یہ تھی کہ روزانہ ان کو گنتا کرتا تھا، کسی دن لڑکوں نے بھانپ لیا وہ موقع کے منتظر رہے آخر ایک دن ملاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے پیچھے لڑکوں نے وہ روپیہ نکال لئے اور خوب عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور ملاجی کے حال پر اتنا رحم کیا کہ ان کی بھی دعوت کر دی ملاجی خالی الذہن تھے خوشی خوشی دعوت کو چلے گئے انھیں ایسے عمدہ کھانے کب ملے تھے بڑے خوش ہوئے کھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ بھائی آج کیا تقریب تھی جو ایسے کھانے پکوائے گئے لڑکوں نے کہا حضور یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے تھوڑی دیر کے بعد ملاجی نے پھر کہا کہ آج کیا بات ہے کون مہمان آگیا ہے جس کے لئے یہ اہتمام ہوا ہے، پھر بھی لڑکوں نے وہی جواب دیا کہ سب حضور ہی کا طفیل ہے اس پر ایک لڑکے کو ہنسی آگئی تو ملاجی کھٹک گئے کہ شاید میرے روپیوں پر ہاتھ پڑ گیا ہے جبھی یہ بار بار اس کو میرا طفیل بتلاتے ہیں بس اب تو کھانا پینا سب بھول گئے اندھے باؤلوں کی طرح سیدھے حجرے میں آئے اور کھودا تو روپے ندارد بس فوراً ہی جان نکل گئی، لوگ دوڑے کہ یہ قصہ کیا ہے معلوم ہوا کہ روپے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوا تو اس وقت تھانہ بھون میں ایک عالم مولانا سعید الدین علی صاحب موجود تھے انھوں نے فرمایا کہ یہ روپیہ منحوس ہے جس نے ایک مسلمان کی جان لے لی اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بلکہ جنازہ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اہل محلہ نے اس کی تعمیل کی اور کسی نے ان روپیوں کو

ہاتھ نہیں لگایا بلکہ سب کو ایک تھیلی میں باندھ کر قبر میں میانجی کے ساتھ دفن کر دیا کفن چوروں کو خبر لگ گئی۔ انھوں نے کہا مولوی کی تو عقل جاتی رہی خواہ مخواہ اتنا روپیہ زمین میں گاڑ دیا چلو اس کو نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ رات کو ایک شخص نے قبر کھودی تو دیکھا کہ سب روپئے کفن سے باہر سینے کے اوپر ترتیب وار رکھے ہوئے ہیں اور خوب چمک رہے ہیں یہ خوش ہوا کہ اب تو اور آسانی ہوگئی اوپر ہی سے سب سمیٹ لوں گا پس انگلی ہی روپیوں سے لگی تھی کہ چیخ مارتا ہوا بھاگا وہ روپئے عالم برزخ کی آگ سے دہک رہے تھے جن سے میت کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ پھر اس کفن چور کی عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہر وقت ایک آبخورہ ہاتھ میں لئے پھرتا تھا جس میں وہ انگلی ہر وقت ڈوبی رہتی تھی اس طرح کچھ تسکین رہتی اور جہاں پانی بدلنے کو انگلی آبخورہ سے نکالی فوراً چیخیں مارتا تھا۔ کہ ہائے میں جلا، ہائے مرا تو بعض ایسے بے حس بھی ہیں جو مال کے واسطے جان دیدیتے ہیں مگر ایسے کم ہیں۔ زیادہ حالت تو یہی ہے کہ مال سے جان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جان سے زیادہ آبرو کو سمجھتے ہیں مگر دین کو سب سے کمتر کر رکھا ہے۔ اسی لئے کسی کے اضرار دین سے کچھ باک نہیں کسی کو خوشامد میں آکر غلط فتویٰ دیدیا جیسا ہمارے یہاں ایک جاہل نے دنیوی خوشامد میں مطلقۃ الثلاث کو حلال کر دیا دنیا دار مولوی اس مرض میں بہت مبتلا ہیں اور ان کے غلط فتوے سے عوام کے لئے حرام چیز حلال نہیں ہوجاتی کیونکہ فتوی کی غلطی چھپی نہیں رہا کرتی۔ ایک اضرار دین یہ ہے کہ کسی کو دین کا راستہ معلوم نہیں تربیت کا طریقہ جانتا نہیں اور خواہ مخواہ شیخ و مرشد بن کر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی راہ مارتا ہے ایک اضرار دین یہ ہے جس میں اہل مدارس مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ لیا کہ میں کون سے مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسہ والا اپنے ہی مدرسہ کا مشورہ دیتا ہے گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسہ میں زیادہ ہے۔ افسوس آجکل اہل علم بھی غلط مشورہ دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورہ نہ دیتے تھے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے ایک لڑکی تھی جس کے شادی کے پیام جابجا سے آرہے تھے، تو انھوں نے اپنے ایک پڑوسی سے جو کہ یہودی تھا مشورہ کیا کہ میری لڑکی کے

فلاں فلاں جگہ سے پیام آرہے ہیں تمہاری نزدیک کونسی جگہ اچھی ہے اس نے اول تو عذر کیا کہ آپ کو مجھ سے مشورہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ میں دین میں آپ کا مخالف ہوں مخالف کے مشورہ کا کیا اعتبار تو بزرگ نے فرمایا کہ شریف تو ہو گو مسلم نہیں ہو اس لئے غلط مشورہ نہیں دوگے۔ اس لئے تم بے تکلف مشورہ دو تو وہ یہودی کہنے لگا میں نے سنا ہے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَجَمَالِهَا وَحَسَبِهَا وَدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ عورت سے نکاح کرنے میں چار باتوں کو دیکھا جاتا ہے مال کو اور جمال کو اور حسب کو اور دین کو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم دیندار سے نکاح کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب اسلام میں سب سے زیادہ دیکھنے کی چیز دین ہے تو میرے خیال میں جتنے لوگوں نے بھی پیام بھیجا ہے دین پورا پورا کسی میں بھی نہیں ہے میرے نزدیک تو ایک طالب علم جو آپ کی مسجد میں رہتا ہے وہ بڑا دیندار ہے ہر وقت خدا کے کام میں لگا رہتا ہے۔ پس آپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیں ان شاء اللہ تعالےٰ بہت برکت ہوگی۔ چنانچہ ان بزرگ نے ایسا ہی کیا اور عمر بھر ان کی لڑکی راحت سے رہی۔

حدیث میں آتا ہے "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اسکو امانت دار سمجھا جاتا ہے، پس مشورہ غلط دینا خیانت ہے اس سے بہت احتراز کرنا چاہیئے۔ ہماری بستی میں ایک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ پہلے مجھے بھی اس کے خریدنے کا خیال تھا۔ مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی پھر کچھ ایسے واقعات بستی میں ان کے ساتھ پیش آئے جن سے گھبرا کر انہوں نے باہر ملازمت کرلی اور گھر بیچنے کا پھر ارادہ کرلیا۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ اگر یہ فروخت کریں گے تو میں ضرور لے لوں گا کیونکہ اس مکان کے نہ لینے سے مجھے گونہ تکلیف ہے لیکن اس دفعہ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں گھر بیچنا چاہتا ہوں اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس وقت اگر میں اپنی غرض کا لحاظ کرکے ان کو یہ مشورہ دیدیتا کہ

ضروری اصلاح: خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

ہاں فروخت کردو تو وہ فوراً بیچ دیتے کیونکہ ان کی زیادہ رائے اسی طرف مائل تھی مگر جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے اپنی مصلحت پر نظر کرنا اور ان کی مصلحت کو نظر انداز کر دینا خیانت سمجھا اور وہی رائے دی جو ان کے لئے مناسب تھی میں نے کہا کہ آپ گھر کو ہرگز فروخت نہ کریں کیونکہ دوسری جگہ چاہے کیسی ہی راحت ہو مگر کسی وقت پھر وطن یاد آتا ہے اور جب باہر جا کر ٹھوکریں لگتی ہیں تو اس وقت اپنے وطن سے زیادہ کوئی جگہ نہیں ہوتی چنانچہ اس رائے کی وجہ سے انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اس پر بعض لوگوں نے مجھے بیوقوف بھی بنایا کہ تم نے یہ رائے دیکر سارے عمر کی مصیبت پھر اپنے سر لی میں نے کہا کچھ بھی ہو یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ ایک شخص اپنی سمجھ کر مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دوں مجھے دین سب سے مقدم ہے اب چاہے مجھے راحت ہو یا کلفت ہو اور ان شاء اللہ اس نیت کی برکت سے راحت ہی ہوگی " جامع) مگر عموماً آجکل مشیروں کی یہ حالت ہے کہ جان جان کر غلط مشورہ دیتے ہیں جس میں ان کے نزدیک صراحۃً دوسرے کا نقصان ہوتا ہے ۔

بگھرہ[1] میں ایک شخص ملازمت سے گھر آیا اور ساتھ میں بہت کچھ نقد اور سامان وغیرہ بھی لایا پھر اس کی لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو بستی کے بھائیوں نے اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور یہ رائے دی کہ ذرا شادی میں خوب دھوم دھام کرو تاکہ لوگوں کی نگاہ میں تمہاری عزت ہو اور خاندان کا نام ہو چنانچہ اس نے ایسی دھوم دھام کی کہ جو کچھ باہر سے کما کر ساتھ لایا تھا سب غارت کر دیا بعد میں ان مشیروں میں سے ایک نے فخراً کہا کہ یہ بہت بڑھ گیا تھا یہ رائے دیکر ہم نے اس کو اپنے برابر کر لیا آجکل برادری کے بھائیوں کی عام حالت یہی ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھ نہیں سکتے ۔

بس جہاں کوئی بڑھا اور انھوں نے اس کو ایسی پٹیاں پڑھانی شروع کیں جس سے چار دن میں وہ ان کے برابر بلکہ کم ہو جائے اور برابر دو غرض سے کرتے ہیں کبھی حسد سے اور کبھی اس لئے کہ وہ ہم کو گھٹانے کی فکر نہ کرے کیونکہ آجکل جہاں کوئی ذرا بڑھتا ہے وہ دوسروں کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے اس لئے اپنی جان بچانے کو وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے جیسے ایک گانوں کا آدمی باہر جا کر چار پانچسو روپیہ کا ملازم ہو گیا تھا اس کے گھر پر ایک میانجی بچوں کو پڑھانے کو نوکر تھے وہی سارے گانوں میں خط پڑھنا جانتے تھے اس شخص کا خط آیا کہ میں اتنے کا ملازم ہو گیا ہوں تو گھر والوں نے میانجی کے پاس خط بھیجدیا کہ ذرا اس کو پڑھ دو کیا لکھا ہے میانجی خط کو دیکھ کر رونے لگے

---

[1] یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون سے ۲ تقریباً ۱۵ میل پر ہے ۱۲ منہ

توخط لانے والا گھبرا گیا کہا میاںجی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا ایسی ہی بات لکھی ہے جس پر مجھے رونا چاہئے
اس نے دوڑکر گھر میں خبر کی تو اس کی بیوی نے دروازہ پر بلا کر پوچھا کہ کیا بات ہے خیر تو ہے میاںجی نے کہا
بتلاؤں گا مگر تو بھی رو وہ بھی رونے لگی اتنے میں محلہ والے آگئے کہ یہ کیا معاملہ ہے میاںجی نے کہا کہ تم
بھی رو وہ بھی رونے لگے پھر پوچھا کہ میاںجی آخر بتاؤ تو سہی کیا لکھا ہے کوئی مرگیا ہے یا بیمار ہوگیا ہے
کہا نہیں اس میں یہ لکھا ہے کہ میں پانچسو روپیہ کا نوکر ہوگیا ہوں لوگوں نے کہا لاحول ولا قوۃ پھر یہ رونے
کی کیا بات ہے یا خوشی کی میاںجی نے کہا یہ رونے ہی کی بات ہے مجھے تو اس لئے رونا چاہئے کہ اب یہ مجھے اپنے
بچوں کی تعلیم کے لئے کیوں نوکر رکھے گا کسی انگریزی جاننے والے ماسٹر کو بلا دے گا اور بیوی کو اس واسطے
رونا چاہیئے کہ اب وہ اس گانوں کی عورت کو کیوں اپنے نکاح میں رکھے گا بس اسے طلاق دیکر کوئی
شہر کی تعلیمیافتہ عورت لائیگا اور گانوں والوں کو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب وہ سال بھر کے بعد آتے
ہی اپنا گھر بہت عالی شان بنائیگا جن میں غریبوں کے مکانات جبراً معمولی داموں میں خرید خرید کر
ملائے جائیں گے پھر زمین جائداد بہت سی خریدے گا جس میں غریبوں کے حصے دبائے جائیں گے واقعی بات
تو میاںجی نے سب معقول کہیں آجکل زیادہ مال و دولت حاصل کرکے لوگ یہی حرکتیں کرتے ہیں اس واسطے بھی
دوسروں کو فکر ہوئی ہے کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے خیر یہ تو وہ ظلم ہے جو انسان اپنی غرض کیواسطے
دوسروں پر کیا کرتا ہے اور بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنی غرض سے بھی نہیں محض دوسروں کے آرام کیواسطے مخلوق کا
گلا دبایا کرتے ہیں جیسے بعض زمیندار حکام کو خوش کرنے کے واسطے گانوں والوں سے چندہ جبراً وصول کرتے
ہیں اور خوشامد کے لئے چندہ کی رقم سے ان کے سامنے ڈالی پیش کرتے ہیں اور اسی طرح بہت سے قصے کئے جاتے
ہیں فروع کو کہاں تک بیان کروں میں نے بطور قاعدہ کلی کے یہ حقوق بیان کردیئے ہیں فروع
انہی سے سمجھ میں آسکتی ہے اب یہ سمجھئے کہ جو کچھ حقوق میں نے ابتک بیان کئے ہیں یہ تو حقوق عامہ
ہیں ان کے بعد کچھ حقوق خاصہ ہیں جب کسی صاحب حق میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے تو اس کے
کچھ خاص حقوق ان حقوق عامہ پر بڑھ جاتے ہیں یہ حقوق مذکورہ تو ہر انسان کے دوسرے انسان پر
بحیثیت عبد ہونیکے ہیں اب اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہے تو اسلام کی وجہ سے اس کا حق اور بڑھ جائیگا
مثلاً مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ بیمار ہو تو عیادت کرو جب ملے تو سلام کرو، اس کو
چھینک آوے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو مرجاوے تو جنازہ کی نماز پڑھو دفن کفن میں شریک ہو

وغیرہ وغیرہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص ہمارا پڑوسی ہے جوار کی وجہ سے اس کا حق بڑھ جائیگا ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ہمارا محسن بھی ہے جیسے استاد یا پیر یا کوئی دوست وغیرہ سو احسان کیوجہ سے ان کے حقوق عام مسلمانوں کے حقوق سے زیادہ ہوں گے محسن ہونے میں باپ ماں کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے ان کے حقوق سب سے زیادہ ہیں اسی طرح بعض اور رشتے بھی بواسطہ احسان میں داخل ہیں مثلاً سسرالی رشتہ جیسے بیوی کی ماں اس کا باپ وغیرہ کہ وہ بیوی کے محسن ہیں اور بیوی سے دوستی کا رشتہ ہے تو دوست کے محسن گویا اپنے ہی محسن ہیں ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے زیادہ ہیں غرضکہ خصوصیا کی وجہ سے حقوق عامہ پر حقوق خاصہ کا اضافہ ہوجاتا ہے اس وقت نہ میں اس کی تفصیل کرسکتا ہوں نہ اتنا وقت ہے علماء کی کتابیں موجود ہیں جن میں سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں اہل قرابت واہل خصوصیت کے حقوق تو سب جانتے ہی ہیں احکام کی کتابوں میں رعایا اور حکام کے حقوق بھی لکھے ہوئے ہیں غرض اسلام میں سب انسانوں کے لئے کچھ نہ کچھ حقوق ہیں ۔ میری ایک کتاب مختصر اس بارہ میں طبع ہوچکی ہے جس کا نام حقوق الاسلام ہے اس کو دیکھو اس میں مختصراً سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں ایک مسلمان ڈپٹی نے وہ کتاب ایک انگریز کو دکھائی تھی اس نے جو دیکھا تو اس میں رعایا اور حکام کے بھی حقوق تھے کہ رعایا کو حکام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیئے اور حکام کو رعایا کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ایک حق تو حاکم مسلم کا ہے وہ الگ ہے اسلام میں مطلق حاکم کا بھی بوجہ معاہدہ کے نیز بوجہ احسان انتظام راحت کے ایک حق ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم تو وہ انگریز بڑا متعجب ہوا کہ اسلام میں حکام کے بھی حقوق ہیں اس کو اسی پر تعجب ہوا اُسے یہ خبر نہ ہوئی کہ اسلام میں بہائم کے بھی حقوق ہیں تو اور زیادہ تعجب ہوتا صاحبو قانون خداوندی ہی کی خصوصیت ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہیں کفار حالانکہ خدا تعالیٰ کے باغی ہیں اور ان کے بارہ میں ارشاد ہے اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (یعنی یہ لوگ اگرچہ چاپایوں کیطرح بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں) مگر اس کے ساتھ ان کے کچھ حقوق بھی رکھے ہیں۔ بہرحال خصوصیت محل وغیرہ سے یہ حقوق بڑھ جاتے ہیں اور مخصوص ان انسانوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں جو کسی سے کچھ نہ کہہ سکیں وہ کون ہیں وہ بیویاں ہیں یہ بیچاری عموماً ایسی بے کس اور بے بس ہوتی ہیں کہ کسی سے کچھ شکایت کر ہی نہیں سکتیں اور اگر کسی کے ماں باپ زندہ بھی ہوں جب بھی شریف

لـــه موقعہ بیان پر اس کی سخت حالت محسوس ہوتی تھی ۱۲

عورتیں اپنے خاوند کی شکایت کسی سے نہیں کرتیں پھر مردوں کی یہ حالت ہے کہ اپنی بیوی کے سوا اور جگہ بھی ان کی نظر اُٹھ جاتی ہے اور بعضے ایسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں مگر ہندوستان کی عورتیں عموماً اپنے شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں گو شوہر کیسا ہی ہو ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مرد بدصورت بھی ہوتے ہیں مگر ان کی بیویاں بجز شوہر کے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں حوریں ہیں حق تعالیٰ نے حوروں کی تعریف میں جہاں حسن وجمال کو بیان فرمایا ہے وہاں قاصرات الطرف بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو شوہر ہی پر منحصر کرنے والی ہوں گی کسی غیر پر نظر نہ ڈالیں گی واقعی ہندوستان کی عورتیں اس صفت میں تمام ممالک کی عورتوں سے ممتاز ہیں یہ تو نکاح کر کے شوہر کے ساتھ ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اپنے باپ ماں کو بھی بعض دفعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ اگر اس کے باپ ماں یا اور کسی عزیز کے ساتھ کبھی شوہر کی اَن بن ہو جائے تو عورت عموماً شوہر کا ساتھ دیتی ہے باپ ماں کا ساتھ نہیں دیتی مگر اس پر بھی بعضے مردان پر بہت زیادتی کرتے ہیں باوجودیکہ وہ ان پر ایسی فدا ہیں مگر بعض لوگ ان کے ستاجوتے ہی سے بات کرتے ہیں باندی اور غلام سے بھی ان کی اوقات بدتر رکھتے ہیں بعضے ایسے بے مروت ہیں کہ ان کی آمدنی ہزاروں کی ہے مگر بیوی کو دس ہی روپیہ کا روزینہ دیتے ہیں اور بعضے تو کھانے کپڑے کی بھی خبر نہیں لیتے۔ نہ ہوا عرب یا بعض ہندوستانی ریاستیں کہ وہاں عورت فوراً قاضی کے یہاں جا کر نالش کر دیتی ہے۔ اب یا تو قاضی کی تجویز کے موافق نان ونفقہ دینا پڑتا ہے ورنہ جبراً طلاق دلوائی جاتی ہے جس کے بعد فوراً عورت کی طرف سے مہر کی نالش ہو جاتی ہے۔ اور بعض ممالک میں مہر نکاح کے وقت ہی پیشگی دھروا لیتے ہیں۔ یہ بیچاری ہندوستان ہی کی عورتیں ہیں کہ جو مہر بھی معاف کر دیتی ہیں اور عمر بھر نان نفقہ کی تکلیف بھی سہتی ہیں خیر کسی کے پاس ہو ہی نہیں تو اس کی شکایت نہیں۔ اس صورت میں تو عورتیں خود محنت مزدوری کر کے شوہر کو بھی کھلاتی ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہو وہ بیوی کو تنگ رکھے یہ نہایت بے غیرتی اور بے حمیتی ہے سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

یہ بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز   نخواہد دید روئے نیک بختی

تن آسانی گزیند خویشتن را   زن و فرزند بگذارد بہ سختی

(اس بے غیرت کو دیکھو کہ وہ نیک بختی کا منہ نہ دیکھے گا اپنے تن آسانی اختیار کر کے بی بی

بچوں کو سختی میں ڈالے)

حالانکہ عورتوں کا ایک حق تو اس واسطے ہے کہ وہ بے کس بے بس ہیں دوسرے اس واسطے بھی حق ہے کہ وہ تمہاری دوست ہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دوستی کی وجہ سے حق بڑھ جاتا ہے پھر وہ تمہاری دین کی محافظ بھی ہیں اسی لئے صوفیہ نے تقلیل وقاع کو مجاہدہ میں داخل نہیں کیا باوجودیکہ وہ تمام لذات میں الذ ہے مگر صوفیہ نے اس کی تقلیل کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا اور نہ کثرت وقاع سے منع کیا ہے گو اور وجہ سے منع کیا ہے مگر مجاہدہ کی حیثیت سے منع نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ محض ترک لذات نہیں کراتے بلکہ اصلاح قوت بہیمیہ کراتے ہیں اگر ان کا مقصود ترک لذات ہوتا تو کثرت وقاع سے پہلے منع کرتے غرض بیوی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس سے دین کی حفاظت اور خیالات فاسدہ کی روک ہوتی ہے اس درجہ میں وہ بڑی محسن ہے۔ جو لوگ دیندار ہیں وہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں۔ مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس مظاہر العلوم کی یہ حالت تھی کہ ان کی بیوی بوڑھی ہو گئی تھیں مگر مولانا کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ جب وہ ذرا بیمار ہوتیں تو مولانا فوراً مدرسہ سے رخصت لیکر خود اپنے ہاتھ سے ان کی خدمت کرتے تھے آجکل تو بعض لوگ بوڑھی بیوی سے نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ تم نے ہی تو اس کو بوڑھی کیا ہے۔ مگر مولانا کی یہ حالت تھی کہ نوکروں اور ماماؤں پر اپنی بیوی کی خدمت کو نہ ڈالتے تھے بلکہ مدرسہ سے رخصت لے کر خود خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے تو علماء کو لوگ بیوی کا مرید کہتے ہیں۔ مگر جی ہاں ان کا مرید ہونا تمہاری طرح پیر ہونے سے اچھا ہے تم بیویوں کے پیر ہو مگر ڈاکو پیر ہوا در اصل یہ ہے کہ مولوی بیویوں کے مرید نہیں ہیں بلکہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ حقوق العباد کو ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بیوی کے حقوق نصوص میں ان کی نظر سے گذرے ہوئے ہیں۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کا حال انھوں نے پڑھا ہے اس لئے وہ بیوی کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتے ہیں ان کو راحت پہنچاتے ہیں۔ بلکہ جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے اتنا تو کوئی مولوی کر بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی ویسا کرنے لگے تو نہ معلوم لوگ اس کو زن مرید سے بڑھ کر اور کیا خطاب دینے لگیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے

ساتھ ایک بار دوڑے تو اس وقت وہ ہلکی پھلکی تھیں آپ سے وہ آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ میں دوبارہ پھر آپ ان کے ساتھ دوڑے اس وقت حضرت عائشہؓ بھاری پڑ گئی تھیں تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا تِلْكَ بِتِلْكَ یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔ میں نے ایک مولوی سے جو بڑے وقار و تمکنت سے رہتے تھے کہا تھا کہ تم نے جس چیز کا نام وقار رکھا ہے یہ تکبر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہا[illegible] وقار سے نہ رہتے تھے بتلاؤ کیا تم بھی کبھی اپنی بیوی کی ساتھ دوڑے ہو۔ بس چپ ہو گئے اس کا کچھ جواب نہ تھا میں نے کہا بس رہو وقار وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کے موافق ہو اور جو اس کے خلاف ہو وہ وقار نہیں بلکہ تکبر ہے غرض مولوی اس واسطے اپنی بیویوں کی خاطر زیادہ کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے پھر بیوی کی خاطر کرنے میں دنیا کی بھی تو بڑی مصلحت ہے اول بات تو یہ ہے کہ اسکی زندگی لطف سے گذرتی ہے ایک دوسرے کی راحت و رنج کا شریک ہوتا ہے اور اگر میاں بی بی میں موافقت اور بے تکلفی اور انشراح ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف ہے جہاں ہر وقت جوتی پیزار رہو وہاں کوئی خوشی نہیں ؎

در خرمی بر سرائے بہ بند کہ بانگ زن از وے برآید بلند

(اس گھر پر خوشی کا دروازہ بند کہ کہ اس سے عورت کی آواز بلند آئے)

لطف تو اسی میں ہے کہ آدمی دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں جائے تو گھر والوں کی باتوں سے جی خوش کرے وہ اس کو راحت دیں یہ ان کی راحت کا خیال کرے اور یہ کیا زندگی ہے کہ دن بھر تو کام میں تھکے اب شام کو گھر جا کر بھی رنج و غم ہی کی باتیں کی جائیں مگر آجکل لوگوں کے مذاق بگڑ گئے ہیں بے حسی چھا گئی ہیں وہ اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں مگر جن کو ذرا بھی حس ہے وہ تو اس کو دنیا ہی میں دوزخ سمجھتے ہیں اور جن کی معاشرت گھر والوں کے ساتھ عمدہ ہے واقعی ان کو دنیا ہی میں جنت نصیب ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ کسی کو کسی سے کوئی کام نہ ہو) (یعنی کار ایذا نباشد[۱] (تکلیف کا کام نہ ہو) اور سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

زن خوب فرماں برد پارسا کند مرد درویش را بادشاہ

ہمہ روز اگر غم خوری غم مدار   چو شب غمگسارت بود در کنار

(اچھی عورت فرمانبردار پارسا فقیر کو بھی بادشاہ کر دیتی ہے تمام روز اگر تکلیف اٹھائے غم کر جبکہ رات میں تیرا غم گسار بغل میں ہو)

صاحبو! یہ راز ہے اہل اللہ کی دلجوئی میں وہ اس لئے اپنے گھر والوں کو راحت پہنچاتے ہیں تاکہ زندگی لطف کے ساتھ گذرے اور واقعی خدا تعالیٰ نے یہ تعلق ہی ایسا بنایا ہے کہ بیوی سے زیادہ کوئی بھی انسان کو راحت نہیں دے سکتا۔ بیماری میں بعض دفعہ سارے عزیز الگ ہو کر ناک منہ چڑھانے لگتے ہیں خصوصاً اگر کسی کو دستوں کی بیماری ہو جائے مگر بیوی سے یہ کہیں نہیں ہو سکتا کہ وہ شوہر کو اس حال میں بھی چھوڑ دے وہ بیماری میں سب سے زیادہ راحت پہنچاتی ہے۔

شاہجہانپور میں ایک رئیس نے بڑھاپے میں شادی کی تھی اُن کے لڑکوں نے اعتراض کیا کہ تمکو اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی خدمت کے لئے تو آپ کی اولاد بہت تھی کہا تم نہیں جانتے بیوی کے برابر مجھے کوئی راحت نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے ایک بار وہ بیمار ہوئے اور دست لگ گئے تو سارے لڑکے اور بہو بیٹیاں چھوڑ کر الگ ہو گئے اور بدبو کی وجہ سے کوئی بھی پاس نہ آتا تھا مگر بیوی اس وقت بھی خدمت گذار تھی وہ بیچاری ہر وقت سہارا لگا کر بٹھلاتی کپڑوں کو دھوتی صاف کرتی تھی پھر وہ بیماری سے شفایاب ہوئے تو لڑکوں کو بلایا اور کہا تم نے اپنی خدمت کا حال دیکھ لیا اسی کے بھروسہ پر مجھے کہتے تھے کہ تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم نے ضرورت دیکھ لی اگر اس وقت میری بیوی نہ ہوتی تو تم چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے میں اکیلا پڑا سڑتا رہتا حقیقت میں بیماری کے اندر بہو بیٹیاں ہرگز وہ کام نہیں دے سکتیں جو بیوی دے سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ راحت اسی تعلق میں رکھی ہے۔ اسی لئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب نے پہلی بیوی کے انتقال پر اخیر عمر میں پھر شادی کی تھی حالانکہ اس وقت مولانا کی عمر سو برس سے اوپر تھی یہ تو بیوی سے دنیا کی راحت پہنچتی ہے۔ اور دین کی راحت یہ ہے کہ گھر کے انتظام سے بے فکری ہو جاتی ہے جس سے قلب کو فراغ و اطمینان حاصل ہوتا ہے تجربہ ہے کہ بدون بیوی کے گھر کا انتظام درست نہیں ہو سکتا بس مرد کا کام تو اتنا ہے کہ یہ مادہ جمع کر دیتا ہے پھر ہیئت عورتوں ہی سے بنتی ہے۔ میں نے بعض رؤسا کو دیکھا ہے کہ مال و دولت ان کے پاس بہت کچھ تھا مگر بیوی نہ تھی تو ان کے گھر کا کچھ بھی ڈھنگ نہ تھا

لاکھ باورچی رکھو نوکر رکھو وہ راحت کہاں جو بیوی سے ہوتی ہے باورچی تو تنخواہ کا ملازم ہے ذرا ایک دن تم نے کوئی سخت بات اس سے کہدی اور وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوا پھر مصیبت کا سامنا ہے پکاؤ روٹی اپنے ہاتھ سے اور چولھا جھونکو برتن دھوؤ اور بیوی سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ مرد کو اپنے ہاتھ سے پکانے دے پھر تجربہ ہے کہ اگر بیوی کے سامنے بھی نوکروں سے کام لیا جائے اور بغیر بیوی کے بھی ان سے کام لیا جائے تو دونوں صورتوں میں آسمان زمین کا فرق ہوگا گھر کی مالک کے سامنے ماماتیں اور نوکر زیادہ چوری نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر تو گھر کا پٹرا ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی مرد گھر کا کام خود بھی جانتا ہو تو اس سے نوکر ذرا دبتے ہیں گو عورت جیسا تو انتظام تو پھر بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی زیادہ سرکشی نہیں کر سکتے۔ اس پر مجھے اپنے والد صاحب کا قصہ یاد آگیا کہ جب میرٹھ میں والد صاحب ملازم تھے تو ایک بار سفر میں باورچی کو کھانا پکانے کے لئے ساتھ لے گئے ایک دفعہ والد صاحب اس پر کچھ خفا ہوئے اور کھانا پکانے والے کو جواب دیدیا وہ بھی بیچ میں کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ لیجئے میں جاتا ہوں اپنے نزدیک تو اس نے یہ سوچا تھا کہ اب منشی جی میری خوشامد کریں گے اور کم از کم اس وقت کے لئے کھانا پکا دینے کو تو ضرور کہیں گے مگر والد صاحب نے اسی وقت اس کا حساب کر دیا اور کہا جاؤ رخصت وہ باورچی تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کھانا پکانے کا اس وقت کیا انتظام کرتے ہیں والد صاحب نے اسی وقت آستین چڑھا اور ہاتھ دھو چولھے پر جا بیٹھے اور روٹیاں پکانی شروع کیں تو بہت عمدہ پکائیں نہ معلوم کہاں سیکھ لیا تھا بس یہ دیکھ کر تو باورچی قدموں میں گر پڑا کہ میری خطا معاف ہو والد صاحب نے فرمایا کہ نالائق تو نے یہ سمجھا ہوگا کہ اب میں تیری خوشامد کروں گا خدا کا شکر ہے مجھے سارے کام آتے ہیں میں صرف آسانی کے لئے دوسروں سے کام لیتا ہوں نہ اس لئے کہ مجھے کچھ آتا نہیں۔ والد صاحب کو بقدر ضرورت سینا پرونا بھی آتا تھا اور اپنے سب کام خود کر لیا کرتے تھے کسی بات سے عار نہ تھا۔ ایک بار والد صاحب تھانہ بھون میں تشریف لائے تو برسات کی وجہ سے گھر کے چھتوں پر گھاس بہت کھڑا تھا والد صاحب نے گھر پلا اپنے ہاتھ میں لیا اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور مجھ سے بھی کہا کہ آؤ میاں اشرف علی ہم خود گھاس اکھاڑیں گے۔ غرض تھوڑی دیر میں سب چھتیں صاف کر دیں تو کوئی شخص ایسا صاحب ہمت

ہو جو سب کام کر سکتا ہو وہ تو شاید بیوی بغیر پریشان نہ ہو مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ وہی ہیں جو نوکروں کے جواب دینے پر پریشان ہو جاتے ہیں اس لئے بیوی کی قدر کرنا چاہیئے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کی معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں چونکہ آج کل لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔ اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔

بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ عبارۃ النص اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃً ابتدار ظلم کو بھی شامل ہے خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں تعمیم پر تنبیہ کر دی ہے بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالۃً بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتدار ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہذا دلالۃ النص سے بھی یہ آیت ابتدار ظلم کو شامل ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں یہ اس لئے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے یَبْغُوْنَ میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے

لہذا اس کا علاج بھی ضروری ہوا آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اس کا علاج بتلایا ہے حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں۔ تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلا دیا ہے بس وہ شان ہے کہ ؎

دل فدائے او شد و جاں نیز ہم   درد از یار است و درماں نیز ہم

(مرض بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی)

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے، ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف زائل ہوگئی اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو ذرا سوچو تو کہ تمہاری اصل کیا ہے یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدمی اور جانور چلتے پھرتے ہگتے موتتے ہیں یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بن کر رہنا چاہیئے۔ ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے۔ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى (اس سے ہم نے تمکو پیدا کیا اور اسی میں تمکو پھر لوٹائیں گے اور اسی میں سے دوبارہ تم کو نکالیں گے) اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے سارا بدن گل سڑ جائے گا پھر کس بات پر تکبر کرتے ہو واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیئے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیئے اسی کو سعدیؒ نے کہا ہے ؎

پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک   ز خاک آفریدت خداوند پاک

(خداوند تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا پس اے بندہ مثل خاک فروتنی کر)

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ

آسمان پر چڑھے جاتے ہیں۔ صاحب یہ سارا ناز اسی وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے آخر مجنون میں کس بات کی کمی ہو جاتی ہے جو اس کو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہو بس دماغ میں کمی ہو جاتی ہے مگر دیکھ لیجئے پھر کیا حشر ہوتا ہے ہمارے ایک دوست کو فالج ہو گیا تھا حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے مگر دماغ پر فالج پڑنے سے سارا علم خبط ہو گیا الحمد تک بھول گئے تھے افاقہ کے بعد بچوں کی طرح ان کو الحمد یاد کرائی گئی تو ان کے بھائی کو بڑی خوشی ہوئی اور مٹھائی بانٹی گئی جیسے بچوں کی بسم اللہ میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے پھر انسان کا ہے پر تکبر کرتا ہے یہ سب چیزیں خاک میں ملنے والی ہیں۔ فی الارض میں اسی پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ہیں زمین پر رہ کر تکبر کرتے ہو تم کو شرم نہیں آتی۔ اس کے بعد بغیر الحق دونوں کے لئے واقعی قید ہے۔ ظلم کے لئے بھی اور بغی کے لئے بھی کیونکہ ظلم اور تکبر دونوں بغیر الحق اور ناحق ہی ہوتے ہیں اس میں تصریحاً یہ بات بتلادی کہ تم کو تکبر اور ظلم کا کچھ حق نہیں ہے پھر ناحق کیوں ظلم کرتے ہو اور گو اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اس کی تصریح اس لئے کر دی کہ بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تکبر کا حق ہے کیونکہ خدا نے ہم کو بڑا بنایا ہے اس لئے تصریحاً بتلا دیا کہ خدا نے تو تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین میں رہنے کا حکم دیا ہے تم کو آسمان پر چڑھنے کا کیا حق ہے آگے اس سبیل کی تعیین فرماتے ہیں کہ ظلم کرنے والوں پر جو الزام ہے اس کی صورت کیا ہو گی فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ صاحبو! یہ ظلم کا معاملہ ایسا سخت ہے کہ جب تک بندہ اپنے حق نہ معاف کر دے اس وقت تک خدا بھی نہ معاف کرے گا۔ خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کر دیتے ہیں مگر بندہ کے حقوق جب تک وہ معاف نہ کرے معاف نہیں کرتے یہ بہت سخت بات ہے۔ سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عادل اور غازی بادشاہ تھے ایک دفعہ انہوں نے خواب میں ایک بڑا عالیشان خوبصورت جنت کا محل دیکھا فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کے واسطے ہے کہا محمود غزنوی کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا پھر مجھے اندر جانے دو میں اپنے محل کو دیکھوں فرشتوں نے کہا ابھی آپ کو اندر جانے کی

اجازت نہیں آپ کے ذمہ ایک مقدمہ ہے اس کا فیصلہ ہوجائے تو پھر اجازت ہوگی پوچھا کیا مواخذہ ہے تو انہوں نے ایک چابک جو دیوار میں لٹکا ہوا تھا کہ تم نے اس کوڑے سے ناحق ایک ملازم کو مارا ہے جب تک اس کا حق ادا نہ ہوجائے آپ جنت میں نہیں جا سکتے۔ بس یہ سن کر محمود رحمۃ اللہ علیہ کانپ ہی تو گئے اور گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی صبح تک بے تابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے جب صبح ہوئی تو اس ملازم کو بلایا اور چابک اس کے سامنے ڈال دیا کہ تیرا جتنا جی چاہے مجھے اس سے مار لے اور آگے ہاتھ جوڑے کہ للہ تو اپنا بدلہ لے لے ورنہ میں جنت سے محروم ہوجاؤں گا۔ اس نے کہا حضور مجھ پر ایک تو وہ ظلم ہوا تھا اس سے بڑھ کر آپ دوسرا ظلم یہ کرتے ہیں کہ مجھ سے انتقام کو فرماتے ہیں وہ قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میں نے جہاں پناہ کو معاف کیا آپ بالکل بیفکر رہیں مگر محمود کی اس سے تسلی نہ ہوئی اس کو بہت سا انعام واکرام دیا جس سے وہ خوش ہوا تب چین پڑا۔ تو صاحب یہ ظلم ہلکی چیز نہیں ساری عبادتیں اس وقت تک ناکافی ہیں جب تک ظلم سے برأت نہ ہوگی درمختار میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے میں جو درہم کا چھٹا حصہ ہے جس کو تین پیسے سمجھ لیجئے سات سو مقبول نمازیں حقدار کو دلائی جائیں گی مجھے اس روایت کی صحت و ضعف کی تحقیق نہیں ممکن ہے فقہا کو تحقیق ہوئی ہو۔ پھر دوسرے نصوص بھی تو اس بارہ میں موجود ہیں۔ غرض ہر حال میں کتنی سخت مصیبت ہوگی اول تو ہماری نمازیں مقبول ہی کتنی ہیں پھر تین تین پیسے کے بدلہ میں وہ بھی جاتی رہیں تو بتلایئے قیامت میں کیسی حسرت ہوگی حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا مَنِ الْمُفْلِسُ فِيكُمْ تم مفلس کس کو سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مفلس وہ ہے جس نے نمازیں بھی بہت پڑھی تھیں روزے بھی بہت رکھے تھے، حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ بھی دی اور صدقات بھی کئے تھے۔ "وَلٰكِنْ قَذَفَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا وَاَخَذَ مَالَ هٰذَا فَجَاءَ رَجُلٌ فَذَهَبَ بِصَلٰوةٍ وَجَاءَ اٰخَرُ فَذَهَبَ بِصِيَامِهِ (لیکن تہمت زنا کی اس پر لگائی، اس کو مارا، اس کا مال لے لیا پس آیا ایک شخص تو اس نے

اس کی نمازیں لے لیں دوسرا آیا اس نے اس کے روزے لے لئے) الحدیث"۔
مگر اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی تھی کسی کو مارا پیٹا تھا کسی کا مال لے لیا تھا۔ اب قیامت میں ایک آیا وہ اس کی نمازیں لے گیا، دوسرا آیا وہ روزے لے گیا، تیسرا آیا وہ حج لے گیا چوتھا آیا زکوٰۃ اور صدقات لے گیا پھر بھی کچھ حقدار بچ گئے اور انکے دینے کو نیکیاں نہ بچیں تو ان کے گناہ اس کے اوپر ڈالدیئے گئے اور یہ طاعات سے خالی ہو کر گناہوں میں لاکر جہنم میں داخل ہوا یہ ہے سب سے بڑا مفلس پہلی روایت میں اگر کچھ کلام ہو تو یہ حدیث تو بالکل صحیح ہے تو کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ذرا ذرا سے حقوق العباد کے بدلہ میں ساری کی کرائی محنت دوسروں کو مل جائے گی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ حقوق العباد من وجہ نماز روزہ سے بھی مقدم ہیں ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیئے مگر افسوس آجکل لوگوں کو ان کا بالکل ہی اہتمام نہیں اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کیا ہو اور کسی سے رشوت لی ہو کسی کی غیبت کی ہو اور اب وہ مر چکے ہیں یا لاپتہ ہیں تو ان کے حقوق کیونکر ادا کئے جائیں اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت میں کوئی صورت لاعلاج نہیں ہے کہنے والا ہونا چاہیئے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ اول تو پوری کوشش کرے ان لوگوں کے پتہ لگانے میں اگر ان کا پتہ لگ جائے تب تو ان کو حق پہنچائے۔
اگر معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں تو مالی حقوق ان کے ورثہ کو پہنچائے اگر ورثاء کا بھی پتہ نہ لگے تو جتنی رقم تم نے ظلم و رشوت سے لی ہے اتنی رقم خیرات کردو اور نیت کرلو کہ یہ ہم ان کی طرف سے دے رہے ہیں یہ تو حقوق مالیہ کا حکم ہے۔ اور غیبت شکایت اور جانی ظلم کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر مظلوم مر گیا ہو یا لاپتہ ہو گیا ہو تو اس کے حق میں دعا کرو نماز اور قرآن پڑھ کر اس کو ثواب بخشو اور عمر بھر اسکے لئے دعا کرتے رہو ان شاء اللہ حق تعالیٰ ان کو تم سے راضی کردیں گے جس کی صورت قاضی ثناء اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ قیامت میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خوبصورت عالی شان محل دکھلائے جائیں گے اور حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان محلات کا خریدار کوئی ہے اور ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت یہ ہے کہ جس کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اسے معاف کردے اس وقت کثرت سے اہل حقوق اپنے حق معاف کردیں گے۔ پھر سرکار کی طرف سے مثل داخل دفتر ہو جائے گی۔

قاضی صاحب اپنے زمانہ کے محدث اور محقق تھے انہوں نے تحقیق کر کے یہ روایت کہیں سے لکھی ہوگی ہم کو ان پر اعتماد ہے۔ غرض معذرت کرنے والوں کی وہاں بڑی قدر ہے ان کے حقوق اللہ تعالیٰ خود ادا کردیں گے۔ وہاں تو اینٹھ مروڑ پر گرفت ہوتی ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے پھر بھی فکر نہ ہوا اور ادائے حقوق کا اہتمام نہ ہوا اب ایک سوال اور رہ گیا وہ یہ کہ کسی نے مثلاً دس ہزار روپئے سود یا رشوت میں لئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کس سے لئے ہیں اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا کرے تو کیونکر کرے اس لئے کہ اس وقت اس کے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں ساری عمر میں جو حرام مال کھایا تھا آج ایک دن میں سب کیسے ادا کر دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کام کا شروع کر دینا اور ادا کا عزم کر لینا بھی مقبول ہے۔ تم اول تو صاحب حق سے معافی کی درخواست کرو۔ اگر وہ خوشی سے معاف کر دے تب تو جلدی ہلکے ہوئے۔ اور اگر معاف نہ کرے یا خوشی سے معاف نہ کرے تو ادا [illegible] تھوڑا تھوڑا جتنا ہو سکے اس کا حق ادا کرتے رہو مگر یہ ضروری ہے کہ اپنے فضول اخراجات کو موقوف کر دو، بس ضروری ضروری خرچوں میں اپنی آمدنی خرچ کرو اور اس سے جتنا بھی بچے وہ حقداروں کو ادا کرو اور اگر وہ مر گئے ہوں تو ان کے ورثا کو دو اور اگر ورثا بھی نہ معلوم ہوں تو ان کی نیت سے خیرات کرتے رہو۔ ان شاء اللہ اول تو امید ہے کہ دنیا ہی میں سارا حق ادا ہو جائیگا اور اگر کچھ ادا ہوا اور کچھ رہ گیا تو اس کو حق تعالیٰ ادا کر دیں گے۔ حق تعالیٰ کے یہاں نیت کو زیادہ دیکھا جاتا ہے جس کی نیت پختہ ہو کہ میں حق ادا کروں گا پھر اس پر عمل بھی شروع کر دے حق تعالیٰ اس کو بالکل بری کر دیتے ہیں اور صاف نیت وہ چیز ہے کہ جنت میں جو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ معلوم بھی ہے یہ کس چیز کی برکت ہے یہ نیت ہی کی تو برکت ہے کیونکہ عمل تو انسان زندگی بھر کرتا ہے اس کا صلہ بہت سے بہت یہ تھا کہ ہزار دو ہزار سال تک بہشت میں رہنا ہو جاتا

عمل محدود کی جزا عقلاً محدود ہوتی ہے مگر یہ غیر محدود جزا آپ کی نیت ہی کی وجہ سے ہے کہ مسلمان گو عمل کرتا ہے محدود زمانہ میں مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر میں ابدالاباد تک بھی زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام و اعمال صالحہ پر جمار ہوں گا اس لئے ان کی جزا بھی دائمی ہے۔ اور یہی راز ہے کفار کے عذاب دائمی کا کیونکہ وہ بھی گو زمانہ محدود تک کفر کرتے ہیں مگر نیت ان کی یہی ہوتی ہے کہ ابدالآباد تک بھی زندہ رہیں گے تو اسی طریقہ پر جمے رہیں گے۔

پس نیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں۔ ثواب ابدی کے مستحق آپ اسی کی وجہ سے ہیں لہذا اسی وقت سے ادا حقوق کا اہتمام شروع کردو اور نیت پختہ کرلو کہ ادا کرتے رہیں گے۔ اور تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہو ان شاء اللہ تعالے پھر آپ اس بوجھ سے ہلکے ہوجائیں گے ورنہ یاد رکھئے کہ حق دار قیامت میں آپ کی بوٹیاں کھالیں گے اور ساری نیکیاں چھین لیں گے۔

نیز حدیث میں آتا ہے " اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ " کہ ظلم کے لئے قیامت میں بہت ظلمتیں ہیں خدا اس سے محفوظ رکھے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ بحمداللہ اس وقت حقوق العباد کی تفصیل اور توضیح کافی ہوچکی ہے اور اشکالات کا حل بھی ہوگیا ہے۔ اب کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

ع "جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے"

حدیث میں ہے کہ حقوق کو دنیا ہی میں ادا کردو یا معاف کرالو پہلے اس دن کے جس میں زر و پیسہ کچھ نہ ہوگا۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالے ہم کو توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں

وصلے اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علےٰ اٰلہ واصحابہ وسلم

تم بحمد اللہ و بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ

التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

اَسْبَابُ الْفِتْنَۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ورحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمیٰ بہ

اسبابُ الفِتنہ

این	کہاں ہوا	موضع سیولی ضلع گڑگانواں
متی	کب ہوا	۲۷ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ بروز شنبہ بوقت شب
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ ۵۰ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	غالباً بیٹھ کر کیونکہ بیان طویل ہوا
لم	کیوں ہوا	اہل موضع کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	محبت اموال و اولاد میں اعتدال کی تعلیم اور تجاوز حدود سے ممانعت
من انتفع	کن لوگوں کو زیادہ نفع ہوا	عوام کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولانا سعید احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ اجمالی لکھا اور ان کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے تفصیل کی۔
المستمعون	سامعین کی تعداد کتنی تھی	مسودہ اجمالی میں تعداد نہیں لکھی۔
الاشتات	متفرقات	مجمع رجال کے علاوہ مستورات کا مجمع بھی پردہ میں تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ اس مسودہ کی تسوید بھی ۲۷ ربیع الثانی کو شروع ہوئی مگر ۳۴ھ میں مکمل ہوئی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ اِنَّمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَ

اَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَ اَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۞ اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَـكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ۞ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۞ (تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے تو جہاں تک تم سے ہوسکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور مانو اور خرچ کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دوگے تو وہ اسکو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا قدردان ہے بڑا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست حکمت والا ہے)

یہ چند آیات ہیں سورۂ تغابن کے اخیر کی جن میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے ایمان والے بندوں کو دو چیزوں کے نقصان پر اطلاع دی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی نہایت شفقت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسا چاہتے ہیں جیسے ماں باپ اولاد کو چاہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنے بچہ کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی حق تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ ہے کیونکہ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ جو کچھ محبت ہے وہ بھی خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور جب وہ بھی خدا کی دی ہوئی ہے تو اس سے سمجھ لیجئے کہ خود خدا تعالیٰ کے پاس کتنی محبت ہوگی کیونکہ جو کوئی ایک چیز کو بانٹا کرتا ہے اس کے پاس وہ چیز دوسروں سے زیادہ ہوا کرتی ہے اور اگر وہ چیز صفت کمال ہو تو ایک درجہ میں اتصاف بھی ہوگا اور دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ کسی چیز کے بانٹنے اور دینے دلانے سے ان کے پاس سے وہ چیز کم ہو جاتی ہے مگر خدا تعالیٰ کے ہاں کمی نہیں ہوتی وہاں کمی کا احتمال ہی نہیں کیونکہ ان کے پاس ہر چیز کا غیر متناہی خزانہ ہے اور غیر متناہی میں کمی نہیں ہوسکتی تو خدا تعالیٰ نے جو اپنے بندوں میں ماں باپ کو محبت دی ہے اس سے خدا کے یہاں یہ صفت کچھ کم نہیں ہوئی کیونکہ اول تو صفت میں کمی کا احتمال نہیں (دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کے اخلاق کا دوسرے پر اثر

اثر ہوتا ہے مثلاً شاگرد میں استاد کی صفت کا کا اثر پہنچتا ہے نیز دوسرے اخلاق حمیدہ بھی صحبت کے اثر سے اس میں پیدا ہو جاتے ہیں مگر اس سے استاد کی صفت میں کمی نہیں ہوتی حالانکہ استاد کی صفات حادث اور ممکن ہیں جب صفت حادثہ ممکنہ میں بھی دوسرے کے افادہ سے کمی نہیں آتی تو حق تعالٰے کی صفات میں جو کہ قدیمہ اور واجبہ ہیں یہ احتمال کیونکر ہو سکتا ہے ۱۲) دوسرے میں ابھی کہہ چکا کہ حق تعالٰے کے یہاں ہر چیز کے خزانے بے انتہا اور غیر متناہی ہیں پس اگر بفرض محال صفت میں افادہ سے کمی کا احتمال بھی ہوتا تو لامتناہی کی وجہ سے وہ احتمال مرتفع ہے بہر حال خدا تعالٰے کی محبت جتنی بندوں کے ساتھ تھی دوسروں کو اس میں سے کچھ حصہ دینے سے اس میں کمی نہیں آئی۔ اور جب ماں باپ کی محبت کا یہ حال ہے جو رات دن مشاہد ہے اور وہ خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو خود خدا تعالٰے کو اپنے بندوں کے ساتھ کیسی کچھ محبت ہو گی اس کا تو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا بہر حال اسی محبت کا مقتضا یہ ہے کہ حق تعالٰے نے ہم کو ہر قسم کے نفع وضرر پر مطلع فرمادیا جو کام کی بات تھی وہ بھی بتلادی اور جو نقصان کی چیز تھی اس پر بھی مطلع فرمادیا۔ چنانچہ اس آیت میں دو چیزوں کا بیان ہے جو انسان کو پیاری تھیں اور ان میں انسان کا کچھ نقصان بھی ہے مگر نقصان کے ساتھ ان میں کچھ نفع بھی ہے اس لئے یہاں ایسا لفظ استعمال فرمایا ہےؔ جو لغۃً نفع کیلئے بھی بولا جا سکتا ہے اور نقصان کے لئے بھی گو عرفاً اس کا استعمال ضرر میں زیادہ ہے پس یا تو یہ کہئے کہ اس جگہ دو محبوب چیزوں کے نفع وضرر دونوں پر مطلع کیا ہے یا عرف کے اعتبار سے یوں کہئے کہ صرف ان کے ضرر پر مطلع کیا ہے اور ایسی چیزوں کے نقصان پر مطلع کرنے کی ضرورت بھی زیادہ تھی جو محبوب ہیں کیونکہ مکروہ اور ناگوار چیزوں کے نقصانات سے تو انسان خود ہی بچا کرتا ہے اور گو کبھی مکروہات میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے مگر محبوب چیزوں میں ابتلا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے طبیب بیمار کو ایسی چیزوں سے زیادہ روکتا ہے

؎ اس لفظ کی تصریح اخیر میں کی گئی ہے یعنی فتنۃ کما فی القاموس الفتنۃ اعجابك بالشئی والضلال والمحنۃ والمشترکۃ بین النفع والضر ۱۲

جو مرغوب ہیں اور ان میں مریض کا نقصان ہے اب سمجھئے کہ وہ چیزیں کیا ہیں جن کا بیان اس آیت میں ہے سو وہ دو چیزیں ایک مال اور ایک اولاد۔ اور ان میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو ان کا مرغوب و محبوب ہونا یہ تو بہت ظاہر ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں مرغوب انسان مال و اولاد کے واسطے کیا کیا کرتا ہے اور ان کے لئے کیسی کوشش کرتا ہے سب کو معلوم ہے جس سے ان دونوں کا محبوب ہونا ایسا ظاہر ہوگیا ہے کہ اس میں کچھ بھی خفا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا میں جتنے محبوب مشاغل اور جس قدر دھندے ہیں سب انہی دو کے واسطے ہیں (درمیان وعظ میں حضرت نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ روشنی کا زیادہ اہتمام کرنے میں مشغول ہیں تو اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ) بقدر ضرورت روشنی کافی ہے زیادہ کی کیا ضرورت ہے اس میں علاوہ اسراف کے ایک کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ سامعین کا دل وعظ میں پوری طرح نہیں لگتا ہر ایک کی نظر اس پر رہتی ہے کہ اب وہ چراغ گل ہوا اور وہ بھڑکا اسی لئے تراویح کے ختم قرآن میں ہم لوگ زیادہ روشنی سے منع کرتے ہیں اس میں بھی علاوہ اسراف کے اتنا حرج تو کھلا ہوا ہے کہ کسی کا دل نماز میں اور قرآن میں نہیں رہتا خصوصاً ان لوگوں کا جو روشنی کے مہتمم ہوتے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ اب فلاں فانوس بھڑک اُٹھا اُسے کم کرنا چاہیئے۔ اب دوسرا گل ہو گیا اُسے جلانا چاہیئے اور جو چیز اصل مقصود ہیں یعنی قرآن سننے میں حارج ہو جس پر ختم قرآن موقوف ہے تو بتلایئے وہ قابل ترک ہے یا نہیں یقیناً یہ سب چیزیں قابل ترک ہیں مگر آجکل رسم پرستی کا طبائع پر اتنا اثر غالب ہے کہ باوجود اُن کے کھلے نقصانات کے پھر بھی ان کو کیا جاتا ہے اور جو شخص منع کرے اس سے خفا ہوتے ہیں۔ اسی طرح مٹھائی کے تقسیم سے منع کرنا بھی لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے۔ مگر ہم اس لئے منع کرتے ہیں کہ اس سے اصل کام میں حرج ہوتا ہے یعنی عقائد کا قصہ تو الگ رہا کہ لوگوں نے اس کو لازم اور ضروری سمجھ رکھا ہے چنانچہ بدون مٹھائی کے ختم قرآن اُن کے نزدیک معیوب ہوگیا ہے اور مباح کا اتنا التزام جو فساد عقیدہ کو مستلزم ہو جائے ناجائز و بدعت ہے مگر) اس سے قطع نظر کرکے میں

لہ اس کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا اس کے بعد پھر مضمون مقصود کی طرف عود ہوا من قولہ تو میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ اس مقام پر الخ وہاں بھی حاشیہ میں یہاں کا حوالہ دیا جاویگا۔

یہ کہتا ہوں کہ اس سے اصل کام میں بھی حرج ہوتا ہے (چنانچہ بارہا دیکھا ہوگا کہ کسی مسجد میں نمازیوں کی تعداد کے موافق مٹھائی گئی مگر درمیان میں نمازی بڑھ گئے اور مٹھائی تھوڑی معلوم ہوئی تو اس وقت ایک دو آدمیوں کو بازار بھیجا جاتا ہے کہ ایک دو روپیوں کی مٹھائی اور لے آؤ پھر یہ آدمی تو جماعت سے بالکل محروم رہے اور جو جماعت میں شریک رہے وہ بھی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ آگئے یا نہیں اگر ان کو کسی وجہ سے دیر ہوگئی تو اب امام صاحب سے کہا جاتا ہے کہ ذرا نماز ٹھہر ٹھہر کر سکون سے پڑھیں جلدی نہ کریں تاکہ ختم تک مٹھائی لانے والے پہنچ جاویں ان کی نماز بھی ساری مٹھائی کے مراقبہ میں ختم ہوتی ہے آخر یہ حرکت خرافات ہے یا نہیں)

ایک دفعہ کانپور میں میرے وعظ کے بعد بعض لوگوں نے مٹھائی تقسیم کرنے کا ارادہ کیا وعظ مغرب کے بعد سے عشا تک ہوا تھا۔ تجویز یہ ہوئی کہ نماز عشا کے بعد تقسیم کی جائے پھر یہ فکر ہوئی کہ مٹھائی تو ہے تھوڑی سی اگر عشا کے بعد تقسیم کی گئی تو آدمی زیادہ ہو جائیں گے (کیونکہ مٹھائی کی خبر سنکر دوسری مسجدوں کے نمازی بھی یہاں آکر نماز میں شریک ہو جائیں گے) تو اس کی یہ تدبیر کی کہ کنڈی تو بند کردی اور ایک آدمی کو پہرہ پر کھڑا کیا کہ جو شخص آوے اس سے پوچھ لو اگر وہ پُرانا نمازی ہے تو کھول دو ورنہ بند رکھو وہ پہرہ دار تو جماعت سے محروم رہا (اور کنڈی بند کرنے کی وجہ سے نہ معلوم کتنے آدمی جماعت سے محروم رہے ہوں گے) نماز کے بعد مجھے اطلاع ہوئی میں نے کہا کہ تم لوگ بدعات سے رد کنے پر ہم لوگوں کو بُرا بھلا کہتے ہو مگر تم نے ان کا نتیجہ دیکھ لیا کہ محض مٹھائی کے انتظام کی وجہ سے ایک مسلمان کو تم نے جماعت سے محروم کیا جس کی حالت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تارکین جماعت کے گھر جلا دوں اسی وعید کی بنا پر اکثر محققین نے جماعت کو واجب کہا ہے گو بعض نے سنت موکدہ بھی کہا ہے اور وہ بھی کوئی تھوڑی بات نہیں۔ سنت موکدہ بھی ایسی چیز ہے جس کی بابت بعض کتبؒ فقہ میں ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

عہ اس کو شامی میں تلویح سے نقل کیا ہے واللہ اعلم بحال صحتہ ۱۲ ظ

کہ اس کے تارک کو میری شفاعت نصیب نہ ہو گی اور صحیحین میں گو یہ لفظ نہیں مگر ایسی ہی سخت وعید وارد ہے فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ (جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرے طریق سے نہیں ہے) غرض ان تکلفات میں وہ اصلی کام رہ جاتا ہے جس کے شکریہ میں یہ تکلفات برتے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ بہت آراستگی کرتے ہیں کہ کہیں قندیل لگاتے ہیں کہیں جھاڑ فانوس کہیں کچھ کہیں کچھ وہ اکثر بیان سننے سے محروم رہتے ہیں جیسا کہ یہاں بھی اسی قسم کا کچھ سامان ہوا ہے چنانچہ نظر آرہا ہے مگر خیر جو حد سے زائد تھا اس کو موقوف کر دیا گیا اور لڑکوں کے خیال سے کچھ تھوڑا بہت رہنے دیا گیا (غالباً یہ تکلفات نوجوان لڑکوں نے کئے تھے اس لئے اُن کی خاطر سے کسی قدر رہنے دیا گیا اور جو حد سے زائد تھے وہ حذف کر دیئے گئے ۱۲ ظ) گو یہ سب کچھ محبت سے کیا گیا ہے مگر یہ محبت ماں کی سی ہے جس کے ساتھ کچھ نادانی بھی ہے (باپ کو تو اولاد کے ساتھ عاقلانہ محبت ہوتی ہے جس پر کوئی بُرا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ اس سے اولاد کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور ماں کی محبت نادانی کے ساتھ ہوتی ہے جس سے اولاد کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو یہاں پر جو محبت ان تکلفات کا سبب ہوئی ہے وہ ماں کی محبت سے مشابہ ہے اس لئے اس میں کچھ نادانی بھی شامل تھی ۱۲) اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زیب وزینت کرنے والے یاد کریں کہ اس انتظام کے درمیان میں اگر جماعت ہونے لگی ہوگی تو بعض نے جماعت کو ترک کر دیا ہوگا اور بعض نے نماز ہی نہ پڑھی ہوگی اور جس نے تنہا پڑھی بھی ہو گی اس کا بھی ترک جماعت سے جی تو بُرا نہ ہوا ہوگا۔ یہ ہے اصلی بات جس کی وجہ سے ان امور کو ہم منع کرتے ہیں اور ہم کیا منع کرتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمایا ہے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی کو دیکھو کہ وہاں کیسی سادگی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کی یہ حالت تھی کہ وضع میں لباس میں مکان میں اٹھنے بیٹھنے میں غرض ہر چیز میں سادگی تھی مجلس میں کسی بات سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بزرگ اور سردار کون ہے حتیٰ کہ اجنبی آدمی کو مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر پوچھنا پڑتا تھا مَنْ مُحَمَّدٌ فِیْکُمْ کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں کیونکہ آپ کے

سر پر کوئی بڑا بھاری عمامہ نہ ہوتا تھا نہ لباس دوسروں سے ممتاز ہوتا تھا نہ کوئی بڑا تخت تھا جس پر آپ بیٹھے ہوں سب کی وضع اور نشست یکساں ہوتی تھی ہاں وعظ کے لئے البتہ آپ ممبر پر بیٹھتے تھے وہ بھی امتیاز کے لئے نہیں بلکہ دینی مصلحت کی وجہ سے۔ کیونکہ زمین پر بیٹھ کر تقریر کرنے سے مجمع کثیر کو برابر آواز نہیں پہنچ سکتی (اور آواز بھی پہنچ جائے جیساکہ آپ کی آواز میں یہ معجزہ تھا کہ قریب و بعید سب کو یکساں پہنچتی تھی تو تمام سامعین آپ کے چہرۂ مبارک پر تو یکساں نظر نہ کر سکتے تھے اور تقریر کے وقت متکلم کے لب و لہجہ کے مشاہدہ سے سامعین پر ایک خاص اثر ہوتا ہے[۱۲] اور کھڑے ہو کر تقریر کرنا بعض دفعہ تعب و مشقت کا سبب ہوتا ہے خصوصاً جبکہ دیر تک بیان کرنا ہو ان وجوہ سے وعظ کے وقت آپ ممبر پر بیٹھتے تھے باقی عام مجالس میں آپ سب کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے کہ کسی وضع سے امتیاز ظاہر نہ ہوتا تھا اس لئے لوگ آکر پوچھتے تھے کہ تم میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کون ہیں جس کا جواب یہ ملتا تھا کہ هٰذَا الْمُتَّكِئُ الْاَبْيَضُ یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ ہیں گورے چٹے جو رہا تھا یا دیوار کا سہارا لگائے بیٹھے ہیں آپ کا حسن تو عجیب و غریب تھا جو ہزاروں لاکھوں میں نہ چھپتا تھا اگر یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب آپ کا حسن ایسا تھا تو پھر نوواردوں کو پوچھنے کی کیوں نوبت آتی تھی حسن تو سب کو معلوم ہوجاتا ہے تو بات یہ ہے کہ حسن بیشک چھپ نہیں سکتا مگر اُس سے اتنا ہی تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سب سے زیادہ خوبصورت اور جمال میں بے نظیر ہے لیکن جو نووارد آپ کو سلطان سمجھ کر آتا تھا اُسے سامان سلطنت و اسباب امتیاز نہ دیکھ کر بلکہ آپ کو سب کے ساتھ ملا جلا دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہی تھی کہ میں ان میں سے کس کو بادشاہ سمجھوں کیونکہ حسن و جمال بدون سامان سلطنت کے کسی کو سلطان سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا (دوسرے یہ کہ) آپ کا حسن ایسا لطیف تھا کہ دیکھنے والے کو فوراً اس کے تمام کمالات کا احاطہ نہ ہوتا تھا بلکہ آپ کے حسن کی یہ شان تھی ؎

يَزِيْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا
اِذَا مَا زِدْتَهٗ نَظَرًا

(تیرے چہرہ میں حسن زیادہ ہی ہوتا ہے جس قدر اس پر نظر زیادہ ڈالتا ہوں)
یہ تو نشست و برخاست کی کیفیت تھی۔ چلنے پھرنے میں آپ کی یہ عادت تھی کہ نہ سب سے آگے چلتے تھے نہ سب کے پیچھے بلکہ ملے جُلے بیچ میں چلتے تھے اور بیچ میں اس طرح کہ کبھی دائیں کبھی بائیں غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ سادگی تھی حالانکہ آپ کی شان یہ ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
(قصہ مختصر آپ کا رتبہ خدا کے بعد بزرگ تر ہے)

اور یہ بزرگی ہی تو وجہ تھی اس حالت کی کیونکہ اہلِ کمال کو تصنع کی ضرورت نہیں ہوتی تصنع اور تکلف وہ کرتا ہے جس میں ذاتی کمال نہ ہو اور جس میں ذاتی کمال ہوتا ہے وہ اسباب کمال سے مستغنی ہو جاتا ہے آپ کا ذاتی کمال خدا کی معرفت و محبت ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی تصنع کی آپ کو ضرورت نہ تھی اور یہ کمال آپ کی برکت سے بحمد اللہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اور جس پر اس کی عظمت منکشف ہو گئی ہے وہ بھی آپ کی طرح سب چیزوں سے مستغنی ہو جاتا ہے چنانچہ ایک کابلی کہا کرتا تھا کہ ہم بڑے امیر ہیں ہم سے بڑھکر دولت کسی کے پاس بھی نہیں ہے ہمارے پاس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی دولت ہے مگر ہم نے اس دولت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اس کے اثر کو دیکھا نہیں اس کی قدر کو جانا نہیں اس لئے ہم تکلف اور تصنع میں مبتلا ہیں واللہ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کو کسی سامان کی ضرورت نہیں مگر ہماری وہ حالت ہے ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر | تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئی میان قعر آب | وز عطش وز جوع گشتستی خراب

(تمہارے سر پر ایک ٹوکرا روٹیوں کا دھرا ہوا ہے اور تم روٹی کے ٹکڑے کو دربدر مارے پھرتے ہو تم دریا میں زانو تک پانی میں کھڑے اور بھوک اور پیاس سے مر رہے ہو)

سر پر روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا رکھا ہے اور تم بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ دوسری قوموں کے طرز اختیار کر کے دولت کے متمنی ہو حالانکہ خود تمہارے پاس اتنی بڑی دولت ہے جس کی قیمت تمام دنیا بھی نہیں ہوسکتی ہمارے پاس واللہ سب کچھ ہے مگر خبر نہیں اور اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی اس دولت کو جو ہمارے پاس ہے چھیننا چاہے تو بعض نادان اس سے بھی دریغ نہیں کرتے اور دنیا کے چار ٹھیکروں کے بدلے اسے دیدے ناگوارا کر لیتے ہیں اور جو کوئی ان سے چار پیسے چھین لے تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک نادان بچہ کے جیب میں پندرہ روپیہ کی گنی پڑی ہو اور کوئی ایک لڈو کے بدلے میں اُسے نکال لے تو وہ اس پر نہ لڑے گا لیکن ایک کانچ کے شیشہ پر لڑے گا اور روئے گا جس کی قیمت ایک پیسہ بھی نہیں تو راز کیا ہے راز یہ ہے کہ اس نادان کو گنی کی قدر و حقیقت معلوم نہیں اور کانچ کے شیشہ کی ظاہری بھڑک اس کو محبوب ہے یہی حال آجکل کے مسلمانوں کا ہے کہ ان کو ایمان کی قدر نہیں اس لئے اُن کاموں سے باک نہیں جو ایمان کو زائل یا ضعیف کرنے والے ہیں ہاں روپے پیسے کی قدر ہے اس لئے نقصان مال کے ذرائع سے ڈرتے ہیں اگر ان کو متاع ایمان کی قدر معلوم ہو جائے تو پھر ان کا بھی وہی حال ہو جو اس کابلی کا حال تھا کہ اپنے کو سب سے زیادہ امیر سمجھنے لگیں غرض ہر مسلمان حقیقت میں صاحب کمال ہے اور کمال کے لئے بے تکلفی و سادگی لازم ہے بناوٹ تو وہ کرے جس میں عیب ہو اسی واسطے گنجا آدمی اپنا سر چھپایا کرتا ہے کبھی سر کھولنا پسند نہیں کرتا اور طرح طرح سے اپنا عیب ڈھانپتا ہے کہیں عمدہ ٹوپی پہنتا ہے کبھی بھڑک دار عمامہ باندھتا ہے اور جو تندرست ہو وہ تو ننگا سر ہونا زیادہ پسند کرتا ہے تا کہ اس کے بالوں کی خوبصورتی ظاہر ہو اس کو بناوٹ کی کیا ضرورت ہے ؎

بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(خوبصورت چہرہ کے لئے آب و رنگ خط و خال کی حاجت نہیں ہے)

غرض صاحب کمال زیادہ زیب و زینت نہیں کیا کرتا ہاں جس میں خود کوئی کمال

نہ ہو وہ زوائد سے اپنا عیب چھپایا کرتا ہے اسی لئے آپ علمار محققین کو ہمیشہ سادہ لباس میں دیکھیں گے ہاں ناقص علمار کو جبہ و دستار کے اہتمام میں مشغول پائیں گے کیونکہ ان میں خود کمال نہیں ہے وہ لباس ہی سے بڑا بننا چاہتے ہیں ۱۲) میں یہ نہیں کہتا کہ میلے کچیلے رہا کرو سادگی سے میرا یہ مطلب نہیں میں نظافت اور صفائی سے نہیں منع کرتا بلکہ تکلف اور تصنع سے منع کرتا ہوں اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے نظافت اور چیز ہے بناوٹ اور چیز ہے نظافت تو شریعت میں مطلوب ہے اور اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں نَظِّفُوْا اَفْنِیَاتِکُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْیَهُوْدِ (اَوْکَمَا قَالَ) اپنے گھروں کے سامنے کا میدان بھی صاف رکھا کرو اور یہود کی مشابہت مت کرو کیونکہ یہود صفائی نہیں رکھتے تھے تو جب گھر کے سامنے کے میدان کی بھی صفائی کا حکم ہے تو خود گھر کی صفائی کا کتنا حکم ہوگا پھر لباس اور بدن کی صفائی کا کس درجہ کا حکم ہوگا اور جب ظاہر کی بھی صفائی مطلوب ہے تو دل کی صفائی تو کیا کچھ مطلوب ہوگی (جس کی صفائی پر آدمی کا آدمی بننا موقوف ہے کیونکہ انسان تو دل ہی سے انسان ہے ۱۲) غرض صفائی تو بڑی اچھی چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت اہتمام تھا آپ بہت صاف رہتے تھے اور مسلمانوں کو بھی صفائی کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جمعہ کے دن کپڑے بدل کر آیا کرو مگر حکم نظافت کے ساتھ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے اَلْبَذَاذَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ کہ سادگی ایمان میں سے ہے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور نظافت دونوں جمع ہو سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تصنع اور تکلف شان ایمان کے خلاف ہے۔ مگر آجکل دونوں طرف افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے بعض لوگ جو صفائی پسند ہیں وہ تو حد تکلف تک پہنچ جاتے ہیں کہ ہر وقت بناؤ سنگار ہی میں رہتے ہیں کپڑا بھی ان کے واسطے قیمتی بھڑکدار ہونا چاہیے سرمہ کنگھی بھی ناغہ نہ ہونا چاہیے۔ کپڑوں پر استری کلف بھی دوسرے تیسرے دن ضرور ہونا چاہیے اور جو سادگی پسند ہیں وہ میلے کچیلے رہتے ہیں غرض اعتدال نہیں ہے۔ سادگی اور صفائی یہ ہے کہ لباس چاہے گھٹیا ہی ہو مگر داغ و دھبہ سے منزہ ہو اگر دھبہ لگ جاتے فوراً اس کو چھڑا دو اگر کپڑا میلا ہو جاتے اس کو

صابون سے دھوڈالو کلف اور استری کے انتظار میں نہ رہو اس کا انتظار تکلف ہے اسی طرح قیمتی بھڑکدار کپڑے کا اہتمام بھی تکلف ہے اور کپڑے پر داغ ودھبہ لگا رہنا یا ویسا ہی میلا کچیلا پہنے رہنا بھی بُرا ہے کہ یہ صفائی اور نظافت کے خلاف ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سادگی اور صفائی کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ پس سادگی کے ساتھ صفائی کا اہتمام بھی کرنا اعتدال ہے۔ ہمارے بزرگانِ دین نے کبھی کسی قسم کا تکلف نہیں کیا ہمیشہ سادگی اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہم کو بھی اپنی معاشرت ایسی ہی سادہ رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسجد میں بھی تکلف کو گوارا نہیں فرمایا چنانچہ نقش ونگار کی ممانعت فرمائی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنا ءِ مسجد کے وقت معمار سے فرمایا تھا اَکِنَّ النَّاسَ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ وَاِیَّاکَ اَنْ تُحَمِّرَ اَوْ تُصَفِّرَ فَتَفْتِنَ النَّاسَ (لوگوں کو گرمی سردی سے بچا سرخ اور زرد رنگ کرنے سے بچ لوگوں کو اس سے فتنہ میں مت ڈال) نقش ونگار کی اس واسطے ممانعت ہے کہ یہ فتنہ ہیں اس تکلف وبناوٹ سے آدمی اصل کام سے رہ جاتا ہے۔ بس انہی کے دیکھنے بھ[illegible]لنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ نماز میں یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ دیکھئے تاج بی بی کے روضہ پر جا کر فاتحہ اور قل ہو اللہ تو شاید ہی کسی کو یاد رہتی ہو بس یہی ہوتا ہے کہ یہ بیل کیا عمدہ ہے یہ پھول پتیاں کیسے خوبصورت ہیں کاریگر نے تراش میں کیسی خوبی رکھی ہے اور ایک جامع مسجد دہلی ہے کہ اس میں خوبصورتی کے ساتھ سادگی بھی ہے دیکھنے میں سیدھی سادی عمارت ہے ہاں اس کی خوبیاں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہیں اور تاج بی بی کے روضہ میں خوبیاں کھلی ہوئی ہیں اس کا حسن بہت کھلم کھلا ہے جو اصل مقصود سے مانع ہو جاتا ہے اسی لئے ہمارے فقہا نے مساجد میں ایسے نقش ونگار اور ظاہری بھڑک کو مکروہ قرار دیا ہے جس سے نمازیوں کا دل بٹنے لگے حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک وہ وقت آوے گا کہ لوگ مسجد بنانے پر باہم فخر کریں گے ایک اپنی مسجد کو اچھا کہے گا تو دوسرا اس سے اچھی بنانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ آجکل اس کا ظہور ہو رہا ہے کہ مسجدیں بھی نام کے واسطے بنائی جاتی ہیں حتیٰ کہ جب کوئی مسجد بنا تا ہے

تو نئی بناتا ہے گو نئی مسجد کی ضرورت نہ ہو پرانی مسجد کی تعمیر میں رقم لگانے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ نام نہ ہوگا یوں سمجھتے ہیں کہ پرانی مسجد کی عمارت سے نام تو اصل بانی کا ہوگا پھر ہم کیوں اس میں رقم لگائیں۔ مگر خوب سمجھ لو کہ شہرت کی طلب سے شہرت نہیں ہوتی شہرت بھی اپنے کو مٹانے ہی سے ہوتی ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

(اگر شہرت کی ہوس ہے گوشہ نشینی اختیار کرو گوشہ گیری سے عنقا کا نام مشہور ہے)

دیکھو عنقا پوشیدہ ہوگیا تو اس کا کس قدر نام ہوا کہ ہر شخص کی زبان پر اس کا نام ہے ہر غائب ہونے والے کو عنقا ہی سے تشبیہ دیتے ہیں ایسی ہی حضرات اہل اللہ کو دیکھو کہ وہ اپنے کو مٹاتے ہیں تو ان کا کتنا نام ہوتا ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی جوتیاں بھی تبرکات میں رکھی جاتی ہیں اور بادشاہوں کے عمدہ عمدہ تخت کی بھی کسی کو خبر نہیں غرض اول تو نام کی طلب ہی فضول ہے نام تو خدا ہی کا ہے اگر ہمارا نام مٹ ہی گیا تو کیا ہوا مٹنے کے لئے تو پیدا ہی ہوئے ہیں اور اگر کسی کو طلب ہی ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ شہرت کے سامان جمع کرے بلکہ اس کا طریقہ بھی اپنے کو مٹانا ہی ہے افسوس تو یہ ہے کہ آجکل لوگوں نے موت کو بھی تفاخر کا موقع بنا رکھا ہے چنانچہ کہیں تیجہ ہوتا ہے کہیں دسواں کہیں چالیسواں اور ان میں بڑا سامان اور تکلف کیا جاتا ہے یہ مسئلہ تو الگ رہا کہ یہ رسوم سنت کے خلاف ہے یا موافق مگر میں اس وقت ایک موٹی سی بات بتلاتا ہوں جس سے ان کا قبح بہت سہولت سے واضح ہو جائیگا وہ یہ کہ حدیث میں ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰی یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے (ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے اس کی نیت کی ہے) تو اب یہ دیکھئے کہ تیجہ، دسواں کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ اور امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ اگر کسی نے اپنے ماں کے ایصال ثواب کے لئے پچاس روپے تجویز کئے ہوں اور ان کی پلاؤ پکوا کر مسجدوں میں یا غریبوں کے گھر بھیجنا چاہتا ہو تو ہم یا آپ اس کو یہ مشورہ دیں کہ

اس رقم کی پلاؤ نہ کھلاوے بلکہ اس کو کسی وقتی ضرورت میں خرچ کردے کیونکہ وقتی ضرورت مقدم ہوا کرتی ہے اور اس میں خرچ کرنے کا ثواب غیر وقتی کاموں میں خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے مثلاً اس وقت ترکوں کی مدد کرنا (اور مجروحین جنگ بلقان کے لئے چندہ دینا) ایک وقتی ضرورت ہے اور اس میں رقم خرچ کرنا پلاؤ پکا کر بانٹنے سے زیادہ نافع ہے علیٰ ہذا اور کوئی ضرورت وقتی ہو تو وہ مقدم ہوگی اب اگر کوئی اس کو یہ مشورہ دینے لگے کہ بجائے پلاؤ کھلانے کے یہ رقم اس مد میں دیدیا فلاں شریف آدمی کی آبرو جاتی ہے اس کو خفیہ طور پر دیدو اور اس طرح رقم خرچ کرکے اپنے باپ ماں کو ثواب بخش دو تو واللہ اس شخص کے دل میں فوراً یہ بات آئے گی کہ واہ میرا اتنا روپیہ خرچ بھی ہوا اور نام کچھ نہ ہوا یہ عجب رائے ہے کہ چپکے سے دیدو اگر وہ مہذب نہیں ہے تو دل کی بات صاف کہدے گا اور اگر مہذب ہے تو صاف تو نہ کہے گا مگر کسی نہ کسی تاویل سے ہیر پھیر کر توجیہات بیان کرکے پلاؤ کھلانے کو ترجیح دے گا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیجہ دسویں سے باپ ماں کو ثواب پہنچانا مقصود نہیں بلکہ محض تفاخر ہی تفاخر اس کا منشا ہے چنانچہ کیرانہ میں ایک گوجر بیمار ہوگیا اس کا لڑکا حکیم کے پاس آکر کہنے لگا کہ حکیم جی اب کی دفعہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کردو، جاہلوں کے محاورات اکثر بے تکے ہی ہوتے ہیں اس قسم کے الفاظ وہ اکثر کہدیتے ہیں (جن سے مخلوق کے مؤثر ہونے کا ایہام ہوتا ہے مگر چونکہ وہ مسلمان تھا اس لئے اس کے کلام کو اسناد مجازی پر محمول کرنا چاہیئے چنانچہ اہلِ بلاغت نے لکھا ہے کہ موحد کے کلام میں اَنْبَتَ الرَّبِيْعُ الْبَقْلَ (ربیع نے ترکاری اگائی) میں اسناد مجازی ہے اور ملحد کے قول میں اسناد حقیقی ۱۲) جس کا منشا قلت مبالات ہے کہ لوگ الفاظ کو معمولی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ الفاظ بڑی چیز ہیں انہی سے نکاح ہوجاتا ہے اور انہیں سے ٹوٹ جاتا ہے الفاظ ہی سے آدمی مسلمان سمجھا جاتا ہے اور الفاظ ہی سے کافر ہوجاتا ہے شریعت میں الفاظ کا اس درجہ اہتمام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ خَبُثَتْ نَفْسِيْ وَلْيَقُلْ لَقِسَتْ نَفْسِيْ یعنی اگر کسی کو متلی ہو تو وہ یوں نہ کہے

کہ میری طبیعت بری ہے بلکہ یوں کہے کہ میری طبیعت مالش کرتی ہے یا مجھے متلی ہو رہی ہے کیونکہ مسلمان کی طبیعت بُری نہیں ہو سکتی جس کے پاس ایمان کی دولت ہے وہ کسی حال میں بُرا نہیں ہے۔ تو دیکھیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی معمولی باتوں میں بھی رعایت الفاظ کی تاکید فرمائی ہے تو الفاظ بہت بڑی چیز ہیں اور یہاں سے ایک بات یاد آگئی میں اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہم لوگوں کو اپنے روزمرہ میں عربی مہینوں کا استعمال کرنا چاہیئے، ہاں ضرورت کے موقعہ میں دوسرے مہینوں کے استعمال کا مضائقہ نہیں (مثلاً منی آرڈر پر دستخط کرتا ہو یا کوئی عدالتی کاغذ ہو وغیرہ وغیرہ) باقی روزمرہ کی بول چال اور باہمی خط و کتابت میں عربی مہینوں ہی کا استعمال چاہیئے کیونکہ اس میں دوسرے مہینوں کے استعمال کی کچھ ضرورت نہیں پھر بلا ضرورت اور بلا وجہ اسلامی طریقہ کو چھوڑ کر دوسروں کا طریقہ کیوں لیا جائے مگر آجکل اس کی ذرا پروا نہیں کی جاتی اور اکثر نوجوانوں نے عربی مہینوں کا استعمال ترک کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ رمضان کب آگیا اور جو کسی کو خبر بھی ہوتی ہے تو وہ بھی انگریزی مہینوں کے ذریعے چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ اب کی بیسویں جولائی کو عید ہوگی حالانکہ عید ایک اسلامی چیز ہے مگر ان حضرات کو اس کا وقت بھی انگریزی ہی مہینوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ ایک مسلمان صاحب انگلستان سے کچھ پاس کر کے آئے تھے ان کے والد صاحب نے ان دوست کو لکھ دیا کہ وہ فلاں وقت فلاں اسٹیشن پر پہونچیں گے تم اُن سے مل لینا چنانچہ یہ ملے اس وقت رمضان کا مہینہ تھا مگر صاحب بہادر بے روزے تھے اور کھانے پینے میں مشغول تھے انہوں نے کہا کہ تم نے روزہ نہیں رکھا تو وہ حیرت سے پوچھتے ہیں کیسا روزہ انہوں نے کہا رمضان کا روزہ کیونکہ آج کل رمضان ہے تو وہ پوچھتے رمضان کیا چیز ہے ان دوست نے کہا ایک مہینہ ہے جس کا روزہ مسلمانوں پر فرض ہے تو وہ انگریزی مہینوں کو گننے لگے جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی الخ اور ان میں رمضان کا مہینہ تو کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ط یہ تو بالکل ہی بے دین ہو کر

آیا ہے کہ اسلامی مہینوں کی بھی خبر نہیں (بس انگلستان سے پاس کیا ہوئے تھے کہ اسلام سے دور ہو گئے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم کو ملاحظہ فرمایئے کہ آپ فرماتے ہیں لَا یَغْلِبَنَّکُمُ الْاَعْرَابُ عَلٰی اِسْمِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَۃِ وَکَانُوْا یُسَمُّوْنَہَا الْعَتَمَۃَ (اَوْ کَمَا قَالَ) مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عشاء کے وقت کو عتمہ کہا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہلا عرب اس لفظ میں تم پر غلبہ نہ کرنے پائیں کہ تم بھی ان کی طرح عشا کو عتمہ کہنے لگو۔ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ شریعت نے جن الفاظ میں اپنی کوئی خاص اصطلاح مقرر کی ہے مسلمانوں کو اسی کا استعمال کرنا چاہیئے اس کو چھوڑ کر کفار کی اصطلاح نہ برتنی چاہیئے ظاہر میں تو یہ معمولی بات ہے کہ بول چال میں اپنے اسلامی الفاظ بولے جائیں مگر اس کے چھوڑنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر اس تعلیم کی قدر معلوم ہوتی ہے واقعی اگر سب مسلمان الفاظ کو معمولی چیز سمجھکر دوسری زبان کے مہینے استعمال کرنے لگیں تو رمضان اور عید اور حج وغیرہ کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کب آئے تھے اور کب چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت الفاظ کی تعلیم فرما کر حقیقت میں محض الفاظ کو نہیں سنبھالا بلکہ دین کو سنبھالا ہے مگر آج کل لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اسی کا اثر یہ ہے کہ وہ گنوار حکیم صاحب سے کہنے لگا کہ اب کے تو میرے باپ کو بچا ہی لو کیونکہ چاول بہت گراں ہیں اگر یہ مرگیا تو برادری کو تیجہ دسویں میں کھانا کھلانا پڑے گا جس کی مجھ میں ہمت نہیں اُس غریب کو باپ کے مرنے کا اس قدر فکر نہ تھا جس قدر کہ اس بات کا فکر تھا کہ اب کے مرگیا تو خرچ بہت ہوگا۔ یہ قصہ تو قصبہ کیرانہ کا ہے اور خود ہمارے قصبہ میں بھی ایک قصہ یہ ہوا کہ ایک دن کوئی بڑھیا عورت ہمارے گھر میں آکر کہنے لگی کہ میں فلانی کے گھر گئی تھی اس کی ساس مرگئی ہے وہ بہت رو رہی تھی اور یوں کہتی تھی کہ مجھے اس کے کفن دفن کا تو زیادہ فکر نہیں مجھے تو زیادہ غم اس بات کا ہے کہ اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مرنے کی خبر سُن کر ساری برادری جمع ہوجاویگی ان کے کھلانے پلانے کا سامان تو بھلا کس سے ہو مگر کہیں سے آٹھ آنہ پیدا ہوجاتے تو میں پان چھالیا منگالیتی آنے والیوں کے سامنے پان ہی رکھے جاتے اور کفن تو ہو ہی رہے گا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

اس کا انتظام تو برادری کے مرد خود کریں گے یہ سن کر میں نے اپنے گھر میں کہا کہ یہ کام تمہارے کرنے کا ہے کیونکہ وعظ کہاں تک اثر کرے گا تم اس رسم کو توڑو اور عورتوں کو سمجھاؤ کہ میت کے گھر جا کر کھانا پینا بہت بری بات ہے۔ ایک تو اُن غریبوں پر موت کا صدمہ ہوا اور دوسرا صدمہ ان پر یہ ڈالا جاوے کہ وہ آنے والیوں کے کھانے پینے اور پان چھالیہ کا انتظام کریں بہت شرم کی بات ہے میرے گھر میں اس سے پہلے کسی شادی غمی میں نہیں جاتی تھیں کیونکہ اکثر جگہ منکرات ہوتے ہیں مگر میں نے اس ضرورت سے ان کو غمی کے مواقع میں جانے کی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ دین کا کام ہے اس لئے تم کو شرکت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کرنا شروع کیا اور عورتوں کو میت کے گھر جا کر کھانے پینے حتیٰ کہ پان کھانے سے بھی روکا زیادہ اثر اس کا ہوا کہ انھوں نے خود اس پر عمل کیا کہ جس کے گھر گئیں اس کے یہاں پان تک نہ کھایا اول اول تو بہتوں نے ناک منہ چڑھایا کہ کیا ہم ایسے گرے پڑے اور مفلس غریب ہیں جو آنے والیوں کے پان چھالیہ کی بھی ہمیں مقدور نہ ہو لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں سب مستورات نے اس پر عمل شروع کر دیا اور اب کوئی میت کے گھر پر پان تک نہیں کھاتی مرد تو بعض دفعہ چوک بھی جاتے ہیں مگر عورتیں بالکل بچتی ہیں غرض رسوم کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان سے تفاخر کے سوا کچھ مقصود نہیں حتیٰ کہ موت کو بھی مایہ فخر بنا رکھا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شریعت میں اعمال کا اعتبار نیت پر ہے جب ان میں لوگوں کی یہ نیتیں ہیں تو بتلایئے ان کو کس طرح جائز کہا جاوے میں نے بعض شہروں میں دیکھا ہے کہ میت کے اوپر دوشالہ ڈالتے ہیں مگر وہ غریبوں کو نہیں دیا جاتا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد اتار کر گھر میں دھر لیا جاتا ہے اور رمز اس کا یہ کہ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مردہ کی ہر چیز منحوس ہو جاتی ہے مگر ہمارا نفس بڑا شریر ہے کہ اپنا نفع کہیں نہیں جانے دیتا چنانچہ گاڑھے اور لٹھے کے کپڑے تو منحوس ہو جاتے ہیں مگر دوشالہ اور روپیہ اور مردہ کا گھر اور جائداد وغیرہ

قیمتی اشیا منحوس نہیں ہوتیں وہ تو ایسا مبارک ہے کہ بے مانگے نہ ملے تو اس کا غصب بھی عوام کے نزدیک جائز ہے چنانچہ میت کے روپے میں اکثر غبن ہوتا ہے جس کے جو ہاتھ لگا دبا لیا دوسروں کو پتہ ہی نہیں دیتے علی ہذا مکان اور جائداد میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اکیلا میں ہی سب کا مالک بن بیٹھوں کاش اگر یہ گانوں بھی منحوس ہو جاتے تو آج ہمیں ترکوں کے جھگڑے ہی میں مل جاتے مگر نفس بڑا عقلمند ہے یہ انہی چیزوں کو منحوس بتاتا ہے جو گھٹیا قیمت کی ہوں (اگر کسی عورت نے اطلس و کمخواب کے کپڑے چھوڑے ہوں تو انہیں کوئی منحوس نہیں سمجھتا گو وہ اس کے ایک دو دفعہ استعمال کئے ہوئے بھی ہوں ۱۲) غرض مردہ پر دوشالہ ڈالنا محض تفاخر کے لئے ہوتا ہے تو کیا ٹھکانا ہے ہماری غفلت کا کہ ہم نے موت کو بھی مایۂ فخر بنالیا ہے (سچ ہے ؎

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

میت تو بیچارہ جان سے گیا اور آپ کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا کہ اس وقت بھی دل کے حوصلے نکالے جاتے اور فخر و نمود کے سامان کئے جاتے ہیں ۱۲) حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند خصوصاً میت کے لئے سفید کپڑا تھا مگر ہم لوگ خلاف سنت رنگ برنگ کے دوشالے ڈالتے ہیں جو محض فخر کے لئے ڈالے جاتے ہیں غریبوں کے دینے کو نہیں ڈالتے اور اگر کسی نے غریبوں ہی کو دے دیا تو یہ دینا بھی فخر ہی کے لئے ہے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں شخص بڑا عالی حوصلہ ہے جس نے اپنے باپ کے اوپر پچاس روپیہ کا دوشالہ ڈالا تھا اور اتار کر اللہ واسطے دے دیا بلکہ غور کر کے دیکھا جائے تو سفید کپڑا بھی جو کفن کے علاوہ مردہ کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ بھی فخر ہی کے لئے ہوتا ہے کیونکہ اوپر کی چادر کفن سے خارج ہے بس کفن تو اسی قدر ہے جس میں مردہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ زائد چادرہ کفن میں داخل نہیں (اس کا منشا کہیں تو اکرام میت ہے اور اکثر محض فخر ہے ۱۲)

اور یہاں سے یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ اکثر لوگ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اوپر کا چادرہ ترکہ میں سے نہ ہو حالانکہ یہ بہت ضروری بات ہے مگر عام دستور یہ ہے کہ چادرہ

بھی ترکہ ہی میں سے منگائی جاتی ہے کیونکہ یہ بات ٹھہری ہوئی ہے کہ تجہیز و تکفین کا خرچ ترکہ میں سب سے مقدم ہے یہ مقدمہ تو صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اوپر کے کپڑے کو کفن میں داخل سمجھ کر اس کو بھی سب سے مقدم کرتے ہیں حالانکہ وہ کفن میں داخل نہیں اور اس کی قیمت ترکہ سے دینا بدون تمام وارثوں کی اجازت کے حلال نہیں اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ورثہ متعدد ہوتے ہیں اور سب سے اس کی اجازت نہیں لی جاتی اور جو ایک دو سے لے لی بھی تو بعض کی اجازت معتبر نہیں سب کی اجازت ہونی چاہیئے بشرط بلوغ (اس لئے اول تو اس چادرہ کی مرد کے لئے ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی کا ایسا ہی دل چاہے تو اس کی قیمت اپنے پاس سے دینا چاہئے ترکہ میں سے نہ دینا چاہئے ۱۲)

ترکہ کے مال میں لوگ بالکل احتیاط نہیں کرتے جو لوگ میت کے گھر جاتے ہیں وہ بے تکلف اس کی چیزیں استعمال کرتے رہتے ہیں حالانکہ مرنے کے بعد فوراً وہ تمام چیزیں میت کی ملکیت سے نکل کر ورثہ کی ملک میں داخل ہوگئی ہیں اب ان کا استعمال بدون تمام ورثہ کی اجازت کے جائز نہیں۔ اہلِ تقویٰ نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ ایک بزرگ رات کے وقت اپنے دوست کی عیادت کو گئے اور ان کے سامنے اس کا انتقال ہوگیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا اور ایک شخص کو اپنے پاس سے پیسے دیئے کہ بازار سے تیل لے آؤ کیونکہ اس چراغ کا تیل میت کے مرتے ہی ورثہ کی ملک ہوگیا ہے جن میں بعض حاضر اور بعض غائب ہیں (اور ممکن ہے کوئی نابالغ بھی ہو) اس سے انتفاع اب درست نہیں، حضرت یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہوگی مگر تعجب کا منشا یہ ہے کہ آپ کو ان امور کا اہتمام نہیں اگر آپ کو بھی حلال حرام کا خیال ہوجائے تو پھر آپ کا بھی یہی معمول ہوگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُن سے ملنے کو آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو اندر بلالیا اور اُن کے آتے ہی چراغ گل کر دیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں گل کر دیا فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اور میں اس وقت بیت المال ہی کا کام کر رہا تھا اب چونکہ ہم اور آپ باتیں کریں گے اور یہ کام بیت المال کا نہیں ہے اس لئے اس تیل سے

بات چیت میں انتفاع نہیں کر سکتے حضرت آپ کو اس پر بھی تعجب ہوگا مگر اس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کو شریعت کے اصول و قواعد معلوم نہیں اور جو معلوم بھی ہیں تو ان پر عمل کا اہتمام نہیں ہے، شاید یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اتنی احتیاط کس سے ہو سکتی ہے یہ تو قدرت سے باہر ہے تو سن لیجئے کہ قدرت سے باہر تو نہیں ہاں دشوار ضرور ہے مگر دشواری اسی وقت تک ہے جب تک آپ نے ہمت نہیں کی ذرا ہمت کر کے عمل شروع کیجئے ان شاء اللہ قدم قدم پر غیب سے اعانت ہوگی چنانچہ میں اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہمت و ارادہ کے بعد حق تعالیٰ کیسی امداد فرماتے ہیں۔

بارہ اکبر پور ایک مقام ہے اس کے قریب ایک چھوٹا سا اسٹیشن لالپور ہے ایک دفعہ میں بارہ سے وہاں پہونچا اور بارش کے سبب وقت سے بہت پہلے پہنچا اتفاق سے جس وقت میں پہونچا بارش ہونے لگی اور اسٹیشن کا سائبان بوچھار سے نہ بچا سکتا تھا۔ اکبر پور میں ایک منصف صاحب میرے جاننے والے تھے ان کو اطلاع ہوگئی تو انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو لکھدیا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ان کی راحت کا کافی انتظام کیا جائے۔ اس غریب نے ہمارے واسطے ایک بڑا کمرہ کھلوا دیا شام ہوئی تو چوکیدار سے کہا کہ کمرہ میں روشنی کر دو اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ غالباً اس وقت ہمارے واسطے سرکاری تیل جلا کر روشنی کی جاوے گی جو شرعاً جائز نہیں کیونکہ سرکاری تیل سرکاری کاموں کے واسطے دیا جاتا ہے نہ کہ رنج کے طور پر مسافروں کی خاطر رات بھر جلانے کے واسطے اب اگر اسٹیشن ماسٹر مسلمان ہوتا تو میں بے تکلف اس سے کہدیتا کہ ہمارے واسطے سرکاری تیل کا جلانا جائز نہیں مگر وہ ہندو تھا میں نے سوچا کہ اس کے سامنے شرعی مسئلہ بیان کر دوں تو یہ کیا سمجھے گا بلکہ عجب نہیں کہ تمسخر کرنے لگے غرض جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اس وقت آپ ہی مجھ کو گناہ سے بچائیے میری کوشش تو بیکار ہے۔ میں دل دل ہی میں دعا ہی کر رہا تھا کہ دفعۃً اسٹیشن ماسٹر نے ملازم سے کہا کہ دیکھو سرکاری تیل نہ جلانا ہماری ذاتی لالٹین

رکھ دینا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر انسان ہمت وارادہ کرے تو خدا تعالےٰ مدد کرتے ہیں اس لئے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ ہمت سے کام لینا چاہئے۔ دنیا کے کاموں میں تو آپ کبھی ہمت نہیں ہارتے بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَاِلْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ (میرا کام کوشش کرنا ہے پورا کرنا اللہ کا کام ہے) چنانچہ اس نیت کی برکت سے کامیاب بھی ہوتے ہیں مگر دین کے کاموں میں ہمت نہیں کرتے۔ صاحبو! ہمت وہ چیز ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو اس مکان کے ساتوں دروازوں پر قفل ڈال رکھے تھے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کا ارادہ معلوم کیا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو یہ دیکھ کر سخت گھبرائے کہ میرے سامنے سات دروازے ہیں اور ہر ایک پر مضبوط قفل لگا ہوا ہے اب دیکھئے اس وقت ہماری ہمت کہاں تک بڑھ سکتی تھی اگر ہم ہوتے تو بھاگنے کا کبھی خیال ہی نہ کر سکتے مگر نبی کی ہمت ہمت ہی ہے یوسف علیہ السلام نے یہ سوچا کہ مجھے قفل تک تو بھاگنا چاہئے اس کے بعد جو چاہے سو ہو مجھے اپنی ہمت کے موافق کام کرنا چاہیئے آگے خدا کا کام ہے چنانچہ وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے اور زلیخا ان کے پیچھے پیچھے پکڑنے کو دوڑی پھر اس ہمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالےٰ نے امداد فرمائی اور جس دروازہ پر یوسف علیہ السلام پہونچتے تھے اس کا قفل خود بخود گر جاتا اور کواڑ چوپٹ کھلتے جاتے تھے۔ لوگ یوسف علیہ السلام کے اس فعل کو (ابتداً میں) خلاف عقل کہتے ہوں گے کہ بھلا جب دروازے مقفل تھے اور کنجی اپنے پاس نہ تھی تو بھاگنا فضول حرکت تھی اس وقت بھاگنے سے کہیں دروازے کھل سکتے تھے مگر صاحبو! ؎

عقل در اسباب می دارد نظر
عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل اسباب کو دیکھتی ہے عشق مسبب کی طرف دیکھتا ہے)

عارف کی نظر اسباب پر نہیں ہوتی وہ مسبب الاسباب کو دیکھتا ہے اور اس پر بھروسہ کرکے وہ کام شروع کر دیتا ہے جو بظاہر قدرت سے باہر ہوتا ہے مگر حق تعالےٰ کی امداد سے ان کو کامیابی ہوتی ہے ہماری اور اہلِ عرفان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گنوار نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ لال جھنڈی کے ہلنے سے ریل رک گئی تھی وہ یہ سمجھا کہ اس لال جھنڈی میں کچھ خاصیت ہے اس نے ڈرائیور کو نہیں دیکھا مگر اس وقت ایک عاقل بھی کھڑا تھا اس نے لال جھنڈی کے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اس میں تو ریل کے روکنے کی طاقت نہیں اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ جھنڈی دکھائی کس کو گئی ہے۔ چنانچہ ڈرائیور پر اس کی نظر پہنچی اور اس نے تاڑ لیا کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر یہ شخص ریل کو روک دیتا ہے اب وہ اس گنوار سے کہتا ہے کہ لال جھنڈی ریل کو نہیں روکتی بلکہ اس کو دیکھ کر ڈرائیور روک دیتا ہے تو وہ اس کو خلافِ عقل سمجھے گا اور یہ کہے گا کہ اگر ڈرائیور روکتا تو ہم کو بھی تو نظر آتا اس سے معلوم ہوتا ہے جھنڈی ہی روکنے والی ہے یہی حالت ہماری ہے کہ ہم نے آگ سے بہت سی چیز۔ وں کو جلتے ہوئے دیکھا ہے پانی سے ٹھنڈک پہونچنے کا احساس کیا تو بس انہی کو فاعل سمجھنے لگے مگر عارف کی نظر مسبب پر ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان اسباب کے اختیار کرنے پر جب حق تعالےٰ کا حکم بھی ہوتا ہے اس وقت اثر ہوتا ہے ورنہ کچھ نہیں ہوتا اس لئے وہ خدا تعالےٰ کو فاعل سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ آب و آتش میں کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے مگر ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ... یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

وہ نظر نہیں آتے اس لئے تم نے ظاہری اسباب کو مؤثر سمجھ لیا ہے (اور گو آنکھوں سے تو عارف کو بھی نظر نہیں آتے مگر وہ دل کی نگاہ سے ان کو دیکھتا ہے) بس ہمارا یہ کہنا کہ بدون کنجی کے خود بخود قفل نہیں کھل سکتا ایسا ہی ہے جیسے وہ گنوار کہتا تھا کہ بدون لال جھنڈی کے ریل کبھی نہیں رک سکتی مگر یہاں ہر شخص اس کو بیوقوف بناتا ہے اور کہتا ہے کہ روکنے والا تو

ڈریور ہے وہ بدون جھنڈی کے بھی روک سکتا ہے اسی طرح عارفین اس بات میں ہم کو
بیوقوف کہتے ہیں کہ قفل خود بخود نہیں کھل سکتا وہ فرماتے ہیں کہ کنجی کے بعد بھی کھولنے والے
حق تعالیٰ ہی ہیں وہ اگر چاہیں تو بدون کنجی کے بھی کھول سکتے ہیں اسی خیال سے یوسف
علیہ السلام قفل کی طرف دوڑے گو آپ اس کو خلاف عقل کہیں مگر ان کی نظر خدا پر تھی وہ جانتے
تھے کہ لوہے کی نرمی اور آگ کی گرمی سب خدا کے اختیار میں ہے اگر وہ چاہیں تو آگ سے
بھی لوہے کو نرم نہ کریں اور اگر چاہیں تو بدون آگ کے نرم کر دیں باقی یہ اس کا فضل ہے
کہ اس نے ایک خاصیت کو معتاد غالب کر دیا ہے کہ لوہے میں سختی غالب ہے اور آگ میں
گرمی غالب ہے۔ چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بدون آگ پر گرم کئے لوہا نرم نہیں ہوتا تاکہ
آپ دنیا کے کام کر سکیں اگر ہمیشہ خود بخود لوہا نرم ہو جایا کرتا تو سارے اوزار اور تمام
تالے بیکار ہو جاتے مگر اس سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا
اگر حق تعالیٰ چاہیں تو اس کے خلاف بھی کر سکتے ہیں مگر وہ ایسا کبھی کبھی کیا کرتے ہیں
ہمیشہ نہیں کرتے اس لئے خرق عادت کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اسی واسطے یوسف علیہ السلام
کے دوڑنے سے تالوں کا گر جانا ان کا معجزہ شمار کیا جاتا ہے اور اگر کسی مسلمان کے لئے ایسا
واقعہ ہو جائے تو اس کو کرامت کہا جائیگا جب حق تعالیٰ اسباب کے خلاف بھی کام کر سکتے
ہیں تو پھر آپ ہمت کیوں ہارتے ہیں جو کام آپ کو مشکل نظر آتا ہے وہ خدا کو تو مشکل نہیں
آپ خدا پر نظر کر کے کام شروع کیجئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید

خیرہ یوسف دار می باید دوید

یعنی گو اس جہان میں خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا مگر تم (یوسف علیہ السلام
کی طرح) دوڑو تو سہی ان شاء اللہ تمہارے دوڑتے ہی رستہ نکل آئے گا جیسے یوسف
علیہ السلام کے دوڑنے سے پہلے راستہ بند تھا اور ان کے دوڑتے ہی فوراً رستہ کھل گیا
اور اگر بالفرض تمہاری کوشش کے بعد بھی رستہ نہ ملا تو تم پر ملامت تو نہ ہوگی یہ نفع
کیا کچھ کم ہے کہ تم الزام سے سبکدوش ہو جاؤ گے باقی کام شروع کرنے سے پہلے ہی باتیں

بنانا اور یہ کہنا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کیونکر کریں یہ سب کم ہمتی کے بہلانے ہیں مجھے اس مقام پر ایک حکایت خوب یاد آئی جب حضرت شاہ غلام رسول صاحب کانپوری اپنے شیخ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے تو انھوں نے استخارہ کے لئے فرمایا تھوڑی دیر مسجد میں بیٹھ کر پھر حاضر ہو گئے پوچھا استخارہ کر لیا کہا جی ہاں کر لیا فرمایا تم تو بہت جلدی آگئے تم نے کیونکر استخارہ کیا تھا۔ عرض کیا حضرت میں نے اپنے نفس سے کہا تھا کہ تو جو بیعت ہوتا ہے یہ غلامی ہے تو خوامخواہ آزادی کو چھوڑ کر غلامی کی قید میں کیوں پھنستا ہے میرے نفس نے جواب دیا کہ اس قید سے مجھے خدا مل جائے گا۔ میں نے کہا تیرا کیا اجارہ کہ تجھے خدا مل ہی جائے گا۔ اگر نہ ملا تو اس نے جواب دیا کہ اگر خدا نہ بھی ملا تو ان کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے مجھ کو طلب کیا تھا بس مجھے یہی کافی ہے ؎

ہمینم بس اگر کاسد قماشم | کہ من نیز از خریداران اُو باشم
ہمینم بس کہ داند ماہرویم | کہ من نیز از خریداران اویم

(مجھ کو یہی کافی ہے اگرچہ میرے پاس کھوٹی پونجی ہے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں یہی مجھ کو کافی ہے کہ میرے محبوب کو علم ہو جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں)

سبحان اللہ! یہ وہ مقصود ہے جس میں وسوسہ کا احتمال ہی نہیں کیونکہ حق تعالےٰ کو طلب کی اطلاع تو یقیناً ہوتی ہے اس میں کچھ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اور یہی مقصود ہے تو اب شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا کوئی رستہ نہیں مل سکتا پس ہم کو بھی ذکر و طاعات سے اسی ثمرہ کا قصد کرنا چاہیئے کہ حق تعالےٰ کو ہماری طلب کی خبر ہو جاوے اب آگے ملنے نہ ملنے کا انہیں اختیار ہے۔ خوب فرماتے ہیں ؎

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(اپنا کام کرو دوسرے کے کام کی فکر میں نہ پڑو)

تم اپنا کام کرو یعنی طلب ظاہر کرو آگے وصال و عدم وصال یہ خدا کا کام ہے تم اس کے پیچھے نہ پڑو۔ شیخ نے یہ عجیب استخارہ سن کر فرمایا کہ بھائی تمہارا استخارہ سب سے بڑھا ہوا ہے

آؤ بیعت ہو جاؤ (واقعی جس کو طلب ہوتی ہے اسے حق تعالیٰ خود ہی بڑھا دیتے ہیں ۱۲) مجھے اس استخارہ پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ ہمارے اطراف میں ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ورع اور تقوے میں بے مثل تھے ان کے سامنے ایک صاحب باطل نے اہل حق کی جماعت پر ایک خاص مقصود کے متعلق کوشش کرنے پر جس میں ناکامی ہوئی تھی اعتراض کیا کہ آپ لوگوں کو بھلا کیا ملا۔ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کچھ نہیں ملا مگر ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

خلاصہ یہ کہ مقصود کے لئے ہمت اور سعی کو صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی ہے تو میں کہتا ہوں کہ جو احکام آپ کو دشوار معلوم ہوتے ہیں ان کے بجا لانے میں آپ کو ہمت تو کرنا چاہیے اگر اس کے بعد بھی آپ کامیاب نہ ہوں تو آپ پر ملامت نہ ہو گی۔ صاحبو! دنیا کے کاموں میں آپ کا یہی طرز عمل ہے کہ ہمت وسعی کا صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی شمار ہوتی ہے دیکھئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا کوئی عزیز بیمار ہوا اور طبیب کے کہنے سے اس کی صحت سے مایوسی ہو گئی لیکن باوجود اس مایوسی کے کیا آپ نے کبھی علاج معالجہ کو ترک کیا ہے کبھی نہیں گو بعضے بخیل ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک شخص بیمار ہوئے اُن کے سالے صاحب ان کے مال پر قابض ہونے والے تھے اس لئے ان کا معالجہ نہ کرتے تھے کہ ان کا جلدی خاتمہ ہو تو ہم رئیس بنیں۔ مگر ایسی نظیریں بہت کم ہیں اور جو ایسے ہیں بھی ان کی سب بُرا بھلا بھی کہتے ہیں عام دستور یہی ہے کہ باوجود مایوسی کے بھی سعی کو موقوف نہیں کیا جاتا آپ خود غور کر لیں کہ ایسے وقت طبیعت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا ہو گا کہ کچھ نہ کرو بلکہ جی میں یہ آیا ہو گا کہ علاج معالجہ سے اس کے تندرست ہونے کی امید نہیں مگر کچھ نہ کرنے سے بعد میں ارمان آئے گا کہ شاید ہم ایسا کرتے تو اچھا ہو ہی جاتا اور علاج میں پوری سعی کرنے کے بعد کچھ ارمان نہ رہے گا تو جب دوسروں کے لئے باوجود مقصود سے مایوسی کے

آپ محض اس لئے سعی کرتے ہیں کہ دل میں ارمان نہ رہے تو کیا اپنے واسطے آپ کو اتنا بھی نہ کرنا چاہیئے تو چلئے میں آپ کے کہنے کو تسلیم کئے لیتا ہوں کہ بعض احکام پر عمل میں کامیابی نہیں ہو سکتی مگر آپ محض ارمان نکالنے کے واسطے ہی ان پر عمل کرنے کی ہمت کر لیجئے ان شاء اللہ ہمت کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ سب باتیں آسان ہیں کیونکہ اس وقت آپ کو خدا تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آئے گی وہ قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیں گے۔ اسی پر مجھے اپنا وہ قصہ یاد آیا تھا کہ اس وقت جو مجھ میں ہمت کا ایک چھوٹا سا شعبہ پیدا ہوا کہ میرے دل میں یہ اضطراب ہوا کہ اس وقت میرے واسطے ایک امر خلاف شریعت کیا جائے گا اور بابو ہندو ہے اس سے شرعی مسئلہ بیان کرنا بیکار ہے اس لئے میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی اس ہمت کا یہ اثر ہوا کہ حق تعالےٰ نے فوراً امداد فرمائی اور اس ہندو کے منہ سے یہ بات نکلوادی کہ سرکاری تیل نہ جلانا۔ تو صاحبو! کوئی عمل کر کے تو دیکھو اور یہ قصہ میں نے اس پر کہا تھا کہ شاید لوگوں کو ان بزرگ کے واقعہ پر جنھوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کر دیا تھا یہ خیال ہوا ہو کہ ایسا تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے یہ تو بہت مشکل ہے میں نے اس کا جواب دیا تھا کہ یہ مشکل عمل سے پہلے ہی ہے عمل کے بعد سب آسان ہو جاتا ہے ؎

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

(جس کام کے لئے ہمت باندھ لی جائے اگر کانٹا بھی ہو گلدستہ ہو جائے گا)

غرض اموال میت میں سلف نے بڑی احتیاط کی ہے جب ایک پیسہ کے تیل میں اتنی احتیاط کی گئی تو یہ چادر کفن کے اوپر ڈالنا اور وہ بھی رسم کے طور پر ڈالنا ترکہ میں سے کیونکر جائز ہوگی (بس یا تو ان کو موقوف کر دیا سب ورثہ سے اجازت لے کر ڈالو بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو یا اپنے پاس سے ڈالو ۱۲) اور یہی حکم جنازہ کی جانماز کا ہے کہ وہ بھی کفن سے خارج ہے وہ بھی ترکہ میں سے نہ ہونی چاہیئے۔ ان رسوم کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ان سے اموال میت میں بہت بے احتیاطی ہو جاتی ہے

جس کا گناہ بہت سخت ہے اور تفاخر کا گناہ الگ رہا جو ان سب کا منشا ہے۔ ایک برا نتیجہ ان کا یہ بھی ہوا جو قوم کو بھگتنا پڑا کہ جن لوگوں کو یہ کفن کی چادر اور جا نماز دیجاتی ہے اور جن کو تیجہ دسویں کا کھانا کھلایا جاتا ہے ان کی ہمت پست ہو گئی اور ان میں ذلت اور دنائت پیدا ہو گئی یعنی ان کا یہی پیشہ ہو گیا کہ وہ دن رات اسی خیال میں رہتے ہیں کہ دیکھئے آج کون مرتا ہے جو ہمیں کھانا کپڑا ملے۔ ان رسوم کا قدم نامبارک دنا مسعود ایسا آیا جس لے دینے والوں کا بھی پٹڑا کر دیا اور لینے والوں کو بھی تباہ کر دیا۔ دینے والوں کا ضرر تو اوپر معلوم ہو چکا، لینے والوں کا یہ ضرر ہوا کہ وہ بالکل کم حوصلہ پست ہمت ہو گئے۔ اب یہ لوگ بجائے اس کے کہ کسی کے اچھے ہونے سے خوش ہوں مرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ جیسے ایک طبیب نے مجھ سے دعا کی درخواست کی تھی کہ دعا کر دیجئے میرا کام چل جائے۔ میں نے کہا بھائی تمہارے کام چلنے کی دعا کروں تو مخلوق کے واسطے بد دعا کروں کہ لوگ خوب بیمار رہوں تا کہ تمہاری پوچھ ہو وہ کہنے لگے کہ بیماروں سے تو دنیا کبھی خالی نہیں رہتی میرا کام چلنے کے لئے وبا پھیلنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دعا کر دیجئے کہ لوگوں کو میری طرف توجہ ہو جائے۔ میں نے کہا بہت اچھا دعا کروں گا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر میں کہتا ہوں کہ جن کا یہی پیشہ ہے مردہ کی چادر لینا جا نماز لینا تیجہ دسویں کی دعوت کھانا ان کی تو یہ حالت ہے کہ جب کوئی مؤذن سے کہتا ہے کہ میاں جی فلانا بیمار ہے اس کے اچھے ہونے کی نمازیوں سے دعا کرانا تو وہ ظاہر میں تو کہہ دیتا ہے کہ ہاں دعا کراؤں گا مگر دل میں خدا جانے کیا کہتا ہوگا۔

ہمارے یہاں ایک قوم چارج ہے وہ ہندوؤں کے مردے اٹھایا کرتے ہیں ایک دفعہ طاعون کے زمانہ میں ہمارے ایک ملازم ملے اس قوم کے ایک آدمی سے پوچھا کہو جی آجکل کیا حالت ہے، کہا خوب موج آرہی ہے۔ دنیا تو تباہ ہو رہی تھی مگر اس کمبخت کے یہاں موج آرہی تھی۔ اسی قوم کے ایک شخص کا قصہ ہے اس سے کسی نے اپنا قرض مانگا اس نے وعدہ کیا کہ پرسوں کو ادا کر دوں گا۔ اس نے پوچھا کہ پرسوں کو

تیرے پاس روپیہ کہاں سے آجائے گا تو کہنے لگا کہ فلانا مہاجن سخت بیمار ہے، بس آج ہی کل کا مہمان ہے پرسوں تک توضرور مر جائے گا اس وقت میری آمدنی ہوگی تجھے لاکر روپیہ دیدوں گا تو بھلا ایسا شخص جو کسی کے مرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہو وہ اس کے اچھے ہونے کی کیا خاک دعا کرے گا۔ مردوں کا مال کھا کھا کر ان لوگوں کی طبیعتیں بے حس اور لالچی ہوگئی ہیں۔

اسی لئے تو مولویوں کو یہ مسجد کے موذن وغیرہ بُرا بھلا کہتے ہیں کیونکہ مولوی رسموں سے منع کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہماری روزی ماردی حالانکہ مولوی دینے دلانے اور ثواب پہنچانے سے نہیں روکتے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جمعرات کی تخصیص نہ کرو بلکہ بدھ کو بھی دو اور تیجہ دسویں کی تخصیص نہ کرو بلکہ جب ہمت ہو کھلادو۔ (اب یہ لوگوں کا قصور ہے کہ انہوں نے تخصیص کا چھوڑ کر ایصال ثواب ہی کو بند کر دیا ۱۲)

ان لوگوں کی یہاں تک نیت بگڑ جاتی ہے کہ کیرانہ کا قصہ ہے کہ وہاں ایک مردہ کی چادر تکیہ دار کے سوا کسی دوسرے کو دینے لگے تکیہ دار نے کہا یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا ہاں بھائی حق تو تمہارا ہی ہے مگر اب کے تم ان کو لینے دو تم تو ہمیشہ ہی لیتے ہو تو وہ بے ساختہ کہتا ہے کہ واہ جی خدا خدا کرکے تو یہ دن آتا ہے اسی میں دوسرے کو میں اپنا حق دیدوں لوگوں نے اس کو بُرا بھلا کہا کہ کمبخت تو اس دن کی تمنا میں رہتا ہے کہ کوئی مرے تو مجھے چادرہ ملے وہ عذر و معذرت کرنے لگا مگر جو بات دل میں تھی وہ بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل ہی گئی میں کہتا ہوں کہ اس میں اُس کی خطا نہیں بلکہ خطا ان کی ہے جنہوں نے اسکو حریص بنایا لوگوں کو چاہیئے کہ اماموں اور موذنوں کی معقول تنخواہیں مقرر کیا کریں اور ان کو عزت کے ساتھ رکھا کریں تاکہ مُردوں کے کپڑے کھانے کا ان کو انتظار نہ رہے (بلکہ مردوں کے ثواب کا کھانا کپڑا کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص نہ کرنا چاہیئے بس کیفما اتفق جو غریب سامنے آجائے اس کو دیدیا جائے۔ اس طرح کسی کو اس موقعہ کا انتظار نہ ہوگا۔

افسوس یہ ہے کہ عوام نے علماء کو بھی ملّانوں میں داخل کرلیا ہے اور وہ ان کو بھی مسجدوں کے ملّانوں کی طرح پست ہمت اور لالچی حریص سمجھتے ہیں۔ صاحبو! واللہ آپ نے علماء کو دیکھا نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کو دین کی ضرورت نہیں رہی اور ان کو آپ کی دنیا کی ضرورت نہیں ہے

پھر ملاقات کیسے ہو۔ بس آپ نے مسجدوں کے ملاتوں کو دیکھ لیا ہے چند سیاح واعظوں کو دیکھ لیا ہے جن کو اپنی روٹیوں سے کام ہے اور آپ نے انہی کو علماء سمجھ لیا حقیقی علماء کو انہی پر قیاس کر لیا۔ یاد رکھو جو سچ مچ عالم ہے وہ تمہارے در پر روٹیوں کے واسطے کبھی نہ آئے گا (اور ویسے بھی کسی کام کے لئے بے بلائے نہ آئے گا ہاں محض اصلاح اور تبلیغ کے لئے بے بلائے آسکتا ہے مگر اس صورت میں وہ آپ سے روٹی نہ مانگے گا[۱۲]

دیکھئے میں ایک موٹی سی بات کہتا ہوں کہ علم ایک کمال ہے اور ہر کمال کا خاصہ ہے کہ اس سے غیرت واستغناء کی شان پیدا ہوتی ہے چنانچہ بڑھئی اور معمار کو ایک ادنیٰ سا کمال حاصل ہے گو ان کا کمال خسیس درجہ میں ہے لیکن وہ بھی کچھ غیرت اور استغناء رکھتے ہیں وہ کبھی خیرات کا مال نہ لیں گے نہ مُردوں کی چادرہ اور جانماز پر نظر کریں گے اُن کی غیرت ہرگز اس کو گوارا نہ کرے گی تو کیوں صاحب کیا علمی کمال میں جو سب سے اعلیٰ کمال ہے کچھ غیرت نہ ہوگی ضرور ہوگی بلکہ تمام اہلِ کمال سے زیادہ ہوگی یہ ایک ایسی موٹی بات ہے جس کو ادنیٰ سمجھ والا بھی سمجھ سکتا ہے بس خوب سمجھ لو کہ علمی کمال جس میں ہوگا وہ ایسے ذلیل کام کبھی نہ کرے گا اس کی تو یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ صاحب احتیاج بھی ہو تب بھی سوال پر اپنی غیرت وعزت کو ترجیح دے گا اور ہرگز کسی سے اپنی احتیاج ظاہر نہ کرے گا۔ اہل کمال فقر وفاقہ کی حالت میں بھی مستغنی رہا کرتے ہیں۔

چنانچہ ایران کا ایک شاہزادہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر ہندوستان میں آگیا۔ اتفاق سے لکھنؤ میں وارد ہوا وہاں اتفاق سے علاقہ پنجاب کے ایک نواب بھی وارد تھے۔ شاہزادہ نے ان کی دعوت کی اُنہوں نے مکافات کی نیت سے کہا کہ آپ بھی کبھی میری ریاست میں ضرور آویں اتفاق سے ان اطراف میں بھی اُس کا جانا ہو گیا مگر ایسی حالت میں کہ کچھ نہ رہا تھا وہ دعوت یاد آئی اور اسی ریاست کی طرف رُخ کیا اور باحال خستہ ایک ٹٹو پر سوار وہاں پہنچا نواب صاحب نے شاہزادہ کو

اس حال سے آتا ہوا دیکھ کر براہ تاسف یہ شعر پڑھا ؂

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج

احتیاج ست احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنادیتی ہے وہ احتیاج ہے)

شاہزادہ آگ بگولہ ہوگیا اور فی البدیہہ جواب دیا ؂

شیر نرکے میشود روبہ مزاج

می زند بر کفش خود صد احتیاج

(بہادر شیر کب لومڑی مزاج ہوسکتا ہے سیکڑوں احتیاج کو اپنے جوتے پر مارتا ہے)

اور فوراً لوٹ گیا۔ رئیس نے ہر چند معذرت کی مگر ہرگز نہ ٹھہرا اور کہا تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارے یہاں آئے۔ تو حضرت غیرت وہ چیز ہے کہ شریف آدمی مرنا گوارا کرتا ہے مگر احتیاج کسی کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس شاہزادہ میں صرف شرافت خاندانی کا کمال تھا اس کا یہ اثر تھا کہ اس میں اس درجہ غیرت تھی، تو جن میں علمی کمال ہوگا ان کی غیرت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کس درجہ ہوگی۔ پس علماء کو ملانوں کے عموم میں داخل کرنا زیبا نہیں۔ ہاں جن کا یہ پیشہ ہے وہ البتہ اس کے مصداق ہیں مگر میں ان کی طرف سے بھی کہتا ہوں کہ ان کی زیادہ خطا نہیں ہے بلکہ قوم کی بھی اس میں کچھ خطا ہے مثلاً دیکھئے امام کا اصل رتبہ کیا ہے وہ حقیقت میں سب نمازیوں کی طرف سے باری تعالٰے کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے کے لئے نائب ہے سو چاہئے تھا کہ اس کام کے لئے ایسے شخص کو تجویز کیا جاتا جو علم و فضل و عزت میں سب سے بڑھا ہوا ہوتا اور اس کی تعظیم و تکریم سب سے زیادہ کرتے اور اس کی خدمت ایسی معقول کرتے جس سے وہ بے فکری کے ساتھ گذر کرلیتا مگر اب اس خدمت کے لئے اس شخص کو تجویز کیا جاتا ہے جو اندھا ہو اپاہج ہو اور تنخواہ اتنی دی جاتی ہے کہ جس میں ایک آدمی کا بھی گذر نہ ہوسکے اور کام اتنا لیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے ذمہ امامت کے علاوہ یہ کام بھی ہے کہ مسجد کی ہر چیز کی حفاظت کریں، صفائی کریں، روشنی کریں اور جو کوئی

مرجاوے تو تین رات تک اس کی قبر پر سویا کریں اور دن میں قرآن پڑھ کر بخشا کریں
اور محلہ والوں کا گوشت ترکاری بھی لادیا کریں اور پانی کے گھڑے بھی بھرا کریں غرض
سارا کام امام صاحب کے ذمہ ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تنخواہ دار امام نہ ہو بلکہ متوکل ہو
تو وہ تو شاہی ملازم ہے وہ شاہی تعلق کی وجہ سے معزز ہوگا مگر اس میں آپ کا کیا
دخل ہے میں تو اس کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ جن اماموں کو آپ تنخواہ پر مقرر کرتے ہیں
ان کی آپ کیا گت بناتے ہیں۔ افسوس اگر انگریزی کا ماسٹر رکھا جائے تو اس کے
لئے تو کم از کم چالیس پچاس روپے تجویز کئے جاتے ہیں اور قرآن پڑھانے کے لئے
کسی کو رکھا جائے تو اس کے لئے روپیہ آٹھ آنہ ماہوار تجویز ہوتا ہے مگر خیر سے وہ
معلم بھی روپے آٹھ آنے ہی کے ہوتے ہیں چنانچہ ایسے ہی ایک میانجی مِنَ الْجِنَّۃِ وَ
النَّاسِ کو مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّسُ پڑھتے تھے حالانکہ قرآن غلط پڑھنے پر سخت وعید ہے
میرا یہ مطلب نہیں کہ وعید کے خوف سے قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دو بلکہ یہ مطلب ہے کہ درست
کرکے پڑھنا روپیہ آٹھ آنہ کے معلموں سے نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے کسی مجود اور قاری
کو تجویز کرنا چاہئے۔ اور ایسا شخص تو کچھ رقم خرچ کرنے سے ہی ملیگا۔ اور جو لوگ
انگریزی ماسٹروں کو معقول تنخواہیں دے سکتے ہیں وہ مجود اور قاری کی تنخواہ بھی
ضرور دے سکتے ہیں اس لئے عدم وسعت کا عذر ہر جگہ نہیں چل سکتا مگر آج کل
دین سے ایسی بے پروائی ہے کہ امام ہمیشہ ایسا ڈھونڈا جاتا ہے جو سستا ہو چاہے
وہ سب کی نمازیں غارت کرتا ہو کیونکہ یہ جاہل میانجی بعض جگہ ایسی غلطیاں کرجاتے
ہیں جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور تجوید کی غلطیاں تو بکثرت ہوتی ہیں اور تجوید کی
یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور
جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو
نماز کیسے صحیح ہوئی شاید آپ کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے
عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی
اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے

فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے (مثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں ڑے کا ہونا اور ہائے مخفی کا ہونا ضروری ہے اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ثا سے مرکب ہے وہاں سین یا صاد پڑھ دینے سے یا حا کی جگہ ہا پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جائیں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی (۱۲)

اب صفات کی بابت میں کہتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں نون کو اخفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح رنگ اور سنگ اور جنگ میں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی شخص پنکھا کو باظہار نون پن کھا یا رنگ کو رن گ کہے تو آپ کہیں گے کہ یہ اردو فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہو گیا لیکن اس کہنے سے آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آسکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں۔ اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم۔ اے قاری ہو جاویں ہم لوگ متاع دنیا کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں

محض بہانے ہیں اور تجوید کی ضرورت تو بھلا کیا ہی مانی جاوے گی۔ آج کل تو بہت سے لوگ خود قرآن پڑھانے ہی کو فضول سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب معنی نہ سمجھے تو محض الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کہ بہت لوگ اقلیدس میں امتحان دیتے ہیں حالانکہ سمجھتے خاک بھی نہیں مگر امتحان دینے کے لئے الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اور پرچے صحیح لکھ کر پاس ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ نرے الفاظ کا یاد ہونا بھی کام آجاتا ہے جیسے یہاں اقلیدس کے الفاظ رٹ لینے سے ملازمت مل جاتی ہے اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ یاد کر لینے سے جنت کے درجے ملتے ہیں تو بیکار کیونکر ہوئے مگر دنیا کی وقعت ہے اس لئے اقلیدس کے الفاظ رٹنے کو بیکار نہیں سمجھا جاتا اور دین کی وقعت نہ ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ معلموں اور موذنوں کی تنخواہ بھی کم تجویز کی جاتی ہے مگر یاد رکھئے وہ آپ کو قرآن کا علم بھی ایسا ہی دیں گے جیسی آپ تنخواہ دیں گے۔

ارزاں بعلت گراں بحکمت۔ (ارزاں کی علت ہے اور گراں حکمت سے ہوتا ہے) اور زیادہ تنخواہ دینے میں بھی وہ قرآن کے دام نہ ہوں گے بلکہ یہ تو ان معلموں کے عمل کے دام ہیں ورنہ قرآن کے دام کون دے سکتا ہے۔ قرآن کی تو یہ شان ہے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے۔ نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

قرآن کی قیمت تو دو جہان بھی نہیں ہو سکتے اور کیوں نہ ہو قرآن ہے کیا چیز ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس

رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ لوگوں کی رب کی طرف سے رب کا رونما ہے)

وہ بندوں کو خدا تعالیٰ کا جمال دکھلانے والا ہے یہ تو الفاظ کا رتبہ ہے اور معانی کا

رتبہ یہ ہے ؎

حرف حرفش راست در بر معنے
معنے در معینے در معنے

(اس کا حرف حرف معنی میں درست ہے معنی در معنی اندر معنی کے ہے)

قرآن مجید وہ چیز ہے کہ جب کوئی مسلمان اس کی تلاوت کرتا ہے تو خداوند عالم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ بھی خداوند عالم کی طرف متوجہ ہوتا ہے دنیا میں اتنا ہی مشاہدہ بس ہے کیونکہ اس سے زیادہ کا تحمل نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آدمی آفتاب پر نظر کرنے سے تو چکا چوند ہو جاتی ہے مگر اس کی شعاعوں کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح ذاتِ حق تعالےٰ کو تو ہم دنیا میں بوجہ ضعف قوی کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں اس کی طرف متوجہ ہو کر انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں تو قرآن مجید مظہر صفات الٰہی ہے جس کی تلاوت سے انوار و تجلیات صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں حق تعالےٰ غائب ہیں اور وہ خود نظر نہیں آسکتے بلکہ حق تعالیٰ یہاں بھی ہم سے قریب ہیں اور نظر آسکتے ہیں ان کی طرف سے کوئی مانع نہیں ہے مانع ہماری طرف سے ہے کہ ہم میں یہاں دیکھنے کی طاقت نہیں ہے اسی واسطے حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے لَنْ تَرَانِیْ (مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا) فرمایا تھا لَنْ اُرٰی (میں ہرگز دیکھا نہیں جاتا) نہیں فرمایا چنانچہ جتنے مشاہدہ کی ہم میں یہاں طاقت ہے وہ قرآن کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جب قرآن مجید کی یہ شان ہے تو اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے اور معلموں کو جو کچھ دیا جاتا ہے یہ خود ان کی محنت کی قیمت ہے قرآن کی قیمت نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اگر ہمارے اندر دین کی عظمت و وقعت ہوتی تو حاملان قرآن کی مشقت کی قیمت بھی بڑی ہی تجویز کرتے ہیں لیکن ہم نے دین کی بے وقعتی کر رکھی ہے اس کے معلموں اور موذنوں اور اماموں کی یہ بیقدری کر رکھی ہے کہ ان کی تنخواہیں بہت قلیل مقرر کیجاتی ہیں اور مردوں کے کھانے کپڑے سے ان کی امداد کرتے ہیں ان کے واسطے کفن کی چادر اور جانماز اور تیجہ دسویں کا کھانا مقرر کر لیا ہے اس لئے اُن کی نیتیں بگڑ گئیں لالچ اور

حرص پیدا ہوگئی اب وہ کسی کے اچھا ہونے سے اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا کسی کے مرنے سے خوش ہوتے ہیں گو زبان سے وہ کسی کو نہ کوستے ہوں مگر دل سے ضرور تمنا کرتے ہونگے کہ کوئی مرے تو ہماری آمدنی ہو پس اس میں جس طرح ان کا قصور ہے خود قوم کا بھی قصور ہے کہ ان کو ایسا تنگ کیوں رکھا جس سے ان کی نیت بگڑ گئی۔ پس دیکھ لیجئے کہ ان رسموں سے دینے والوں کو بھی ضرر پہنچا اور لینے والوں کو بھی نقصان پہنچا اور دونوں کو یہ ضرر اس لئے پہنچا کہ یہ طریقہ غیر مشروع تھا اور محض تفاخر کے لئے تھا خلاف شریعت کاموں میں ظلمت ضرور ہوتی ہے گناہ کے علاوہ ان سے دنیا کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ آج کل لوگوں نے موت کو بھی آلہ فخر بنا رکھا ہے یہ تو اوپر والوں کا حال تھا غضب یہ ہے کہ بعض دفعہ خود میت بھی فخر و مباہات کی وصیت کرتا اور یہ فرمائش کرتا ہے کہ ہماری قبر ایسی پختہ ہو جو کبھی شکستہ نہ ہو سکے شاید اس سے یہ مقصود ہو کہ قیامت میں بھی یہ قبر محفوظ رہے اور وہ حساب کتاب سے بچا رہے مگر قیامت میں تو پہاڑ بھی اڑ جائینگے بیچاری قبر کی تو کیا ہستی ہے اس روز تو ہر شخص خود ہی گھبرا کر نکل آئے گا۔

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے، تاکہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان و شوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے غریب زادہ نے کہا بیشک، یہ فرق تو ہے، لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہونچے گا۔ کچھ ٹھکانا ہے اس تفاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ اسی کو تو حق تعالٰی نے فرمایا ہے اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (ترجمہ) (اے لوگو تم کو تفاخر نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہونچ گئے) زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے یا تو یہ معنے ہیں کہ تم اس تفاخر ہی کی حالت میں قبروں میں پہنچ گئے یعنی مر گئے یا یہ کہ تم تفاخر کے لئے قبروں کو دیکھنے گئے۔ جاہلیت میں عرب کی عجیب حالت تھی بعض دفعہ جب دو قبیلے باہم فخر کرتے ایک کہتا کہ ہماری قوم زیادہ ہے دوسرا

کہتا کہ ہمارا جتھا زیادہ ہے اور اس کے بعد مردم شماری ہوتی اور ان میں سے کوئی ایک قبیلہ شمار میں کم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ ہمارے آدمی لڑائی میں زیادہ کام آئے ہیں اس لئے ہم کم ہو گئے ورنہ ہماری شمار زیادہ تھی دوسرا قبیلہ کہتا کہ یہ بھی غلط ہے تمہارے مُردے ہمارے مُردوں سے زیادہ نہیں ہیں اس کے فیصلے کے لئے قبروں کی شمار کی جاتی تھی۔
اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ تو کفار کی حالت تھی مگر افسوس آجکل مسلمانوں میں بھی یہ مرض پیدا ہو گیا ہے تو وہ قبروں کی شمار تو نہیں کرتے مگر ان کی پختگی اور خوبصورتی پر فخر کرتے ہیں چنانچہ اس لئے بعض لوگ خود اپنی قبر کے پختہ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں۔
اس تفاخر ہی کی وجہ سے یہ تمام تکلفات پیدا ہوئے ہیں کہیں زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں جھاڑ فانوس اور قندیل لٹکائے جاتے ہیں۔ مسلمانو! ان تکلفات کو چھوڑ دو اور اپنے سلف کی طرح سادگی اختیار کرو۔ ہمارے سلف کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو پہلی سادگی تو یہ تھی کہ آپ کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ تھا بس ایک اونٹنی تھی اور ساتھ میں ایک غلام اور سواری کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ دور تک آپ سوار ہوتے اور غلام مہار پکڑ کر چلتا تھا اور کچھ دور تک غلام سوار ہوتا تھا اور خلیفہ اپنے ہاتھ سے مہار پکڑ کر پیدل چلتے تھے کیا اس مساوات اور سادگی کی نظیر کوئی قوم دکھلا سکتی ہے ہرگز نہیں۔ اور دوسری سادگی یہ تھی کہ جب آپ بیت المقدس کے قریب اس شان سے پہونچے ہیں تو حضرات صحابہ و امراء لشکر استقبال کے لئے حاضر ہوئے اور سب نے عرض کیا کہ آپ غیر قوموں کے سامنے پیش ہونے والے ہیں مناسب یہ ہے کہ سفر کا لباس اتار کر کوئی عمدہ لباس پہن لیا جائے کیونکہ اس لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے اور پیوند بھی کہیں کپڑے کا تھا کہیں چمڑے کا۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ اس وقت اونٹنی کے بجائے گھوڑے پر سوار ہونا مناسب ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اول تو اس سے انکار کیا اور فرمایا نَحْنُ قَوْمٌ عَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ ہم وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ہم کو اسلام سے عزت دی ہے۔ ہماری عزت لباس یا سواری سے نہیں ہے۔ یہاں سے ہم لوگوں کو اپنے خیالات کی اصلاح کرنا چاہیئے ہم عزت و

شوکت کی حقیقت نہیں سمجھی ہم لباس کے عمدہ ہونے اور سواری کے قیمتی ہونے کو عزت وشوکت سمجھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ اصلی عزت کمال سے ہوتی ہے یہ کیا عزت ہے جو تھوڑی دیر میں اتر جائے کہ اتنے کپڑے بدن پر رہے معزز رہیں اور جہاں کپڑے اتار دیئے ذلیل ہوگئے عزت وہ ہے جو ہر دم انسان کے ساتھ رہے اور وہ کمال سے ہوتی ہے اور مسلمان کا بڑا کمال اسلام ہے آپ اسلام کامل حاصل کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ بدون کسی سامان کے معزز ہو جاؤ گے ۔ دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لباس کیسا تھا مگر عزت وشوکت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ مدینہ منورہ سے بیت المقدس کو روانہ ہوئے ہیں تو تمام دنیا کے اندر زلزلہ پڑ گیا کہ خلیفۂ اسلام پائے تخت سے شام کی طرف روانہ ہوئے ہیں، تمام سلاطین کانپتے (کہ دیکھئے اب کس طرف کو لشکر روانہ فرماتے ہیں سب کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں خود ہی لشکر کی کمان نہ کریں ۱۲) آخر یہ شوکت ورعب کس چیز کا تھا کیا لباس کا رعب تھا ہرگز نہیں، لباس کی کیفیت تو یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے طواف میں حضرت عمر کو دیکھا اس وقت جو کرتہ آپ کے بدن پر تھا اس میں اکیس پیوند تھے۔ آج لوگ شکایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں افلاس زیادہ ہے اس لئے ذلیل ہو رہے ہیں مسلمانوں میں اس وقت افلاس کا ہونا سچ بھی ہے اور غلط بھی ۔ سچ تو اس معنی کر ہے کہ کفار سے ان کے پاس دولت کم ہے اور غلط اس لئے ہے کہ سلف کے اعتبار سے ان کے پاس دولت کم نہیں جس زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی ہے اس وقت وہ آج کل کے مسلمانوں سے زیادہ صاحب افلاس تھے اگر افلاس ہی ذلت کا سبب ہے تو ان حضرات نے عین افلاس کی حالت میں کیونکر عزت وشوکت حاصل کر لی ۔ خوب سمجھ لو کہ عزت لباس یا دولت سے نہیں ہے مسلمان کی عزت اسلام سے ہے ۔ پہلے مسلمان پورے مسلمان ہوتے تھے اس لئے معزز تھے اور ہم برائے نام مسلمان ہیں اس لئے ذلیل ہیں ورنہ آجکل کچھ پہلے سے زیادہ افلاس نہیں ۔ حضرات صحابہ کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام میں پہونچے تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے خیمہ میں اترے کیونکہ وہ عساکر اسلامیہ کے افسر تھے

اوران سے پوچھا کہ اے ابو عبیدہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے انہوں نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے سامنے رکھدیئے اور پانی لاکر رکھدیا۔ اس وقت حضرت سرمد کا کلام یاد آگیا فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب میخورد میگذرد — در بادۂ ناب میخورد میگذرد
سرمد کہ بکاسۂ گدائی نان را — ترکردہ بآب میخورد میگذرد

(منعم کہ کباب کھاتا ہے گذرجاتا ہے خالص شراب پیتا ہے گذرجاتا ہے
سرمد پیالۂ گدائی میں پانی میں سوکھی روٹی ترکرکے کھاتا ہے وہ گذرجاتاہے)

یہ حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ رونے لگے اور فرمایا اے ابو عبیدہ اب تو اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر فتوحات سے وسعت کردی ہے پھر تم ملک شام میں ہوا ب تم اتنی تنگی کیوں کرتے ہو انھوں نے عرض کیا اے امیرالمؤمنین دنیا تو محض زاد ہے۔ آخرت میں پہونچنے کے لئے جس کے لئے یہ بھی کافی ہے توزیادہ کولے کر کیا کریں گے خود حضرت عمر رضہ سے عرض کیا گیا تھا کہ اب فتوحات میں وسعت ہوگئی ہے آپ اتنی تنگی کیوں فرماتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے بہت سے بھائی اسی فقر کی حالت میں شہید ہوگئے انہوں نے خدا کے راستہ میں عمل زیادہ کیا اور دنیا سے تمتع حاصل نہیں کیا ان کا سارا ثواب آخرت میں ذخیرہ رہا اور ہم لوگوں نے فتوحات حاصل کرکے بہت کچھ مال و دولت حاصل کرلی ہے اور ہماری محنت کا کچھ ثمرہ یہاں مل گیا ہے۔ اب مجھے اس مال و دولت سے منتفع ہوتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت میں کہیں یہ نہ کہدیا جائے اِذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ کہ تم نے حیات دنیا میں مزے اڑالئے ہیں اور طیبات سے تمتع حاصل کرلیا ہے اب یہاں (تمہارے واسطے کچھ نہیں بس) تم کو عذاب ذات کی سزادی جائے گی اس لئے کہ تم بڑا بننا چاہتے تھے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا ان کے افلاس کا سبب یہ نہ تھا کہ ان کو کچھ ملتا نہ تھا حق تعالےٰ نے حضرات صحابہ کو بہت کچھ

مال و دولت دیا تھا مگر وہ اپنے پاس رکھتے نہ تھے بلکہ غرباء کو دیدیتے تھے اور خود فقر کی حالت میں رہتے تھے تو کیا اس فقر سے کچھ ان کی عزت کم ہو گئی تھی خدا نے ان کو وہ عزت دی تھی کہ آج مسلمان اس کی تمنا کرتے ہیں پس فقر کی ذلت سمجھنا بڑی غلطی ہے یہ تو بڑی عزت کی چیز ہے اگر کمال کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جیب میں کانپور میں درس دیتا تھا علین حالت درس میں ایک شخص جامع مسجد میں آئے حالت یہ تھی ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا
نے غم دزد و نے غم کالا

(ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے، نہ اسباب کا غم نہ چور کا کھٹکا)

طالب علموں نے اول اول ان کو معمولی آدمی سمجھا اور حقارت سے دیکھا انھوں نے مسجد کی جا نماز پر اعتراض کیا کہ یہ منقش کیوں ہے نماز کی جگہ نقش و نگار نہ ہونا چاہیئے اس سے نماز میں یکسوئی کامل نہیں ہوتی بار بار پھول بوٹوں پر نظر جاتی ہے طلبہ نے اس مسئلہ پر گفتگو کرنا شروع کر دی تب معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اب ان کی سادہ وضع اور خستہ لباس کی بھی قدر ہوئی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اگر لباس معمولی ہو اور کمال زیادہ ہو تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور اگر کپڑے عمدہ ہیں اور لیاقت کچھ نہیں تو علی حزین کا سا قصہ ہو جاوے گا کہ اس کے پاس ایک شخص نہایت شان و تکلف کا لباس پہنے ہوئے آیا اس نے ادب سے اپنا پاؤں سمیٹ لیا اور نام پوچھا تو آپ نام بتلاتے ہیں الیسف (یوسف) علی حزین نے پاؤں بدستور پھیلا دیئے اور کہا بابا اگر تو الیسف ہستی پس چرا من پلئے خود را کشم (اگر تو ایسف ہے تو پھر میں اپنا پاؤں کیوں سمیٹوں) میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے اور وضع بالکل انگریزوں جیسی تھی ایسے لوگ اکثر ذلیل ہو جاتے ہیں جب کوئی شخص ان کو انگریزی داں سمجھ کر انگریزی کا خط یا تار ان کے پاس لاتا ہے اور پڑھوانا چاہتا ہے تو اس وقت وہ بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ اب کیسے پڑھیں اور انکار کریں تو اپنی حماقت ظاہر ہوتی ہے اور جہالت کا اقرار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی انگریز ان کو تعلیم یافتہ سمجھ کر انگریزی میں ان سے باتیں

کرنے لگتا ہے اس وقت یہ لوگ بغلیں جھانکتے ہیں۔ ایک انگریز نے ایسے ہی ایک شخص کو بہت ٹھونکا جو وضع انگریزوں کی بنائے ہوئے تھا اور انگریزی بالکل نہ جانتا تھا، بات یہ ہے کہ ہر وضع کے لئے اس کی قابلیت بھی ضروری ہے ؎

نازرا روئے بباید ہمچو ورد
چوں نہ داری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی مت اختیار کرو)

اور انسانیت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی انگریزی پڑھ کر بھی اپنی ہی وضع پر قائم رہے واللہ ایسے شخص کی زیادہ عزت ہوتی ہے مگر آج کل مسلمانوں کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ سب کے سب وضع اور فیشن کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اس کو سرمایۂ عزت سمجھتے ہیں حالانکہ اس سے خاک بھی عزت نہیں ہوتی یہ لوگ خود ان کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہو جاتے ہیں جن کی وضع اختیار کرتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اس سے عزت ہوتی ہے تو یہ برائے نام عارضی عزت ہے اصلی عزت کمال اسلام سے ہے مسلمانوں کو اس کی کوشش کرنی چاہئے میں یہ نہیں کہتا کہ تم ایسے خراب خستہ رہو کہ بدن پر چیتھڑے لگا لو نہیں لباس صحیح سالم پہنو مگر یہ کیا ضرور ہے کہ قیمتی بھی ہو وضع اور فیشن بھی ہو یہ سب تکلفات ہیں۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صحابہ نے یہ رائے دی تھی کہ عمدہ کپڑے پہن لیجئے تاکہ ظاہری شان و شوکت بھی ہو جاوے تو انہوں نے اس سے صاف انکار فرما دیا کہ ہمارے لئے اسلامی عزت کافی ہے اور کسی عزت کی ضرورت نہیں شاید آپ یہ کہیں کہ حضرات صحابہ کی تو بات ہی اور ہے ان جیسا کون ہو سکتا ہے تو لیجئے میں آپ کو اسی زمانہ کی نظیر دکھاتا ہوں۔

ابھی کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے آپ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا کی وضع کس درجہ سادی تھی مگر اس سادگی ہی میں ان کی وہ عزت تھی کہ بڑے بڑے نواب اور رؤسا وزراء مولانا سے

ملنے آتے تھے اور مولانا جس کو جو جی میں آیا کہہ ڈالتے تھے مگر ان کی باتوں سے برا
کوئی نہ مانتا تھا بلکہ ان کی وہ غصہ کی باتیں بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں جس کی وجہ وہی
سادگی تھی ان کی طبیعت بالکل سادہ بچوں کی سی تھی اس لئے کسی کو کوئی بات ان کی
ناگوار نہ ہوتی تھی جیسے بچوں کی حرکات ناگوار نہیں ہوتیں کیونکہ وہ بھی جو کچھ کرتے ہیں
سادگی سے کرتے ہیں بناوٹ سے نہیں کرتے۔ تھانہ بھون میں ایک شخص گالیاں بہت
دیا کرتے تھے ایک تقریب کے موقعہ پر انھوں نے برادری کو جمع کرنا چاہا تو لوگوں نے
جانے سے انکار کر دیا کہ یہ ہم کو گالیاں دیتا تھا ہم اس کے یہاں نہ جائیں گے۔
جب معلوم ہوا کہ برادری والے اس وجہ سے نہیں آتے تو انھوں نے معذرت کی کہ
آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ اب تو خطا معاف کرو لوگوں نے کہا کہ شاہ ولایت صاحب
کے مزار پر چل کر عہد کرو وہ راضی ہو گئے اور عہد کو چلے وہاں جا کر کہتے ہیں کہ شاہ ولایت
صاحب یہ برادری کے ایسے ویسے لوگ (گالی دے کر ۱۲) مجھ سے عہد کرلتے ہیں کہ کسی کو
گالی مت دینا میں آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب سے کسی ان ایسے ویسے لوگوں کو
(گالی دے کر ۱۲) گالی نہ دوں گا سب لوگ ہنس پڑے کہ ظالم سے عہد کرتے ہوئے تو
گالیاں چھوٹی نہیں آئندہ کیا چھوڑے گا یہ بیچارہ معذور ہے آخر برادری کے سب
آدمی ان کے یہاں آ گئے اور پھر کسی نے ان کی گالی سے برا نہ مانا کیونکہ سمجھ گئے کہ یہ
سادگی سے گالی دیتا ہے قصداً بناوٹ کر کے نہیں دیتا۔ اس حکایت سے میرا یہ مطلب
نہیں کہ میں ان کے اس فعل کا اچھا ہونا ثابت کرتا ہوں بلکہ میں اس سے ایک نتیجہ نکالنا
چاہتا ہوں اور کبھی بُرے فعل سے بھی اچھا نتیجہ نکال لیا جاتا ہے جیسے حضرت جنید بغدادی
رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا پوچھا اس کو پھانسی کیوں دی گئی۔
لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بڑا پکا چور تھا ایک بار گرفتار ہوا تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا
پھر بایاں پیر کاٹا گیا پھر بھی چوری سے باز نہ آیا تو خلیفہ نے پھانسی کا حکم دیا حضرت
جنید نے یہ سن کر اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ چور کے پیر چومتے
ہیں فرمایا میں نے چوری کی وجہ سے اس کے پیر نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم

چوے ہیں کہ یہ اپنے محبوب پر گو وہ مذموم ہی تھا ایسے استقلال کے ساتھ جما رہا کہ اسی میں جان دے دی افسوس ہم اپنے محبوب محمود کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہیں کرتے تو جیسے حضرت جنید ؒ نے برے فعل سے نتیجہ اچھا نکال لیا۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ گو اس شخص کا گالیاں دینا برا فعل تھا مگر سادگی کے ساتھ تھا یہ اس میں خوبی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ لوگ اس کی باتوں کا برا نہ مانتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور بے تصنعی عجب چیز ہے جو تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔ یہی بات مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب میں تھی کہ ان کا غصہ اور تیزی سادگی کے ساتھ تھی اس لئے کسی کو ناگواری نہ ہوتی تھی بعض دفعہ وہ بڑے بڑے عہدہ داروں کو ایسی تیز تیز باتیں فرما دیا کرتے تھے کہ ہم ویسی باتیں کہیں تو ایک دن میں بدنام ہو جائیں۔

ایک مرتبہ وزیر حیدرآباد مولانا کے یہاں حاضر ہوئے تو آپ فرماتے ہیں ارے نکالو ارے نکالو، صاحبزادے نے عرض کیا حضرت حیدرآباد کے وزیر ہیں فرمایا ارے تو میں کیا کروں میں کیا ان سے تنخواہ پاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اچھا رات کے دو بجے تک رہنے کی اجازت ہے اس کے بعد چلے جائیں بیچارے وزیر نے اسی کو غنیمت سمجھا اور اس کی تہذیب دیکھئے کہ رات کے ۲ بجے فوراً چلا گیا خدام نے کہا بھی کہ صبح کو چلے جائیےگا۔ اب تو مولانا سو رہے ہیں انہیں کیا خبر ہوگی کہا نہیں یہ بے ادبی ہے بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے، اب حضرت کی اجازت نہیں ہے میں نہ ٹھہروں گا تو مولانا بڑے سے بڑے کو ایسی تیز تیز کہدیتے تھے اور کچھ ناگوار نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ لفٹنٹ گورنر نے آپ کی زیارت کو آنا چاہا اور اپنے سکرٹری کے ذریعہ سے باقاعدہ اجازت حاصل کی مولانا نے اجازت دے دی اور لوگوں سے فرمایا وہ کہاں بٹھلائے جائیں لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ کو تو سارا زمانہ جانتا ہے پھر فرمایا کہ وہ بیٹھیں گے کہاں ہمارے یہاں تو سونے کی کرسی بھی نہیں۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت وہ لکڑی کی کرسی پر بھی بیٹھ جاویں گے فرمایا اچھا۔ پھر فرمایا کہ کیا ہم لفٹنٹ گورنر کو دروازہ تک لینے جاویں۔ عرض کیا گیا کہ اگر مزاج چاہے تو مضائقہ بھی نہیں یہ باتیں ان کے آنے سے

پہلے ہو رہی تھیں مگر کچھ دیر کے بعد مولانا بھول بھال گئے اور جب وہ تاریخ آئی جس میں لفٹنٹ گورنر آنے والے تھے تو حضرت نے نہ کچھ سامان کیا نہ استقبال کیا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھے تک نہیں جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے لفٹنٹ گورنر تو بیٹھ گئے باقی سب انگریز جوان کے ساتھ تھے کھڑے رہے ایک میم بھی کھڑی رہ گئی تو مولانا نے ایک اولتے گھڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ بی تو اس پر بیٹھ جا وہ اس پر بیٹھ گئی پھر لفٹنٹ گورنر نے عرض کیا کہ حضرت ہمیں کچھ وصیت فرمائیے فرمایا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکومت دی ہے دیکھو ظلم مت کرنا ورنہ تم سے حکومت چھن جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ تبرک عطا فرمایا جائے آپ نے فرمایا مجھ غریب کے پاس تمہارے دینے کو کیا رکھا ہے پھر خادم سے پکار کر فرمایا ارے مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ چورا پڑا ہو تو ان کو دیدے یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ وہ چورا تھوڑا تھوڑا سب کو بانٹا گیا اور سب نے نہایت ادب سے اس کو لیا میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ لفٹنٹ گورنر کو مولانا کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی کیا مولانا حاکم تھے یا نواب اور رئیس تھے کچھ بھی نہیں پھر آخر یہ دل کشی کس چیز کی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم ان کے دروازے پر آتے تھے۔ صاحبو! یہ سادگی ہی کی دل کشی تھی تکلف اور تصنع سے یہ بات پیدا نہیں ہوا کرتی اسی کو فرماتے ہیں ؎

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند ۔۔۔ دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند ۔۔۔ اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(دل فریبان نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے جو درخت پھلدار ہیں وہ زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

حضرت بس آزادی یہ ہے جو ان حضرات میں تھی یہ آزادی نہیں ہے کہ ایسا لباس پہنیں کہ بدون کرسی کے بیٹھ ہی نہ سکیں یہ تو پوری قید ہے بعضی وضع ایسی ہوتی ہے کہ اگر وہ مکمل ہی ہو تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور ادھوری ہو تو بری معلوم ہوتی ہے (مثلاً کوٹ پتلون کے ساتھ دہلی کا جوتہ برا معلوم ہوتا ہے نیز دوپلی ٹوپی بھی اس پر بھدی لگتی ہے اب کوٹ پتلون ہو تو اس کے ساتھ جوتہ اور ٹوپی بھی اُس کے مناسب ہونا چاہیئے) تو بتلایئے

یہ قید ہوئی یا نہیں اور ایک لباس ہی میں کیا میں تو ہر تکلف کو قید سمجھتا ہوں۔ بس آزادی یہ ہے کہ انسان ایک شریعت کی قید کے سوا کسی قید کا پابند نہ ہو۔ یہ قید تو ضروری ہے اس کا باقی رہنا تو مطلوب ہے مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ قید گراں نہیں ہے واللہ اس میں وہ لذت ہے کہ جو اس کا پابند ہے وہ کبھی اس سے خلاصی نہیں چاہتا کیونکہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند
شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا ہے تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا)

یہ تو زلف یار کی قید ہے اور زلف یار کی قید سے کون رہائی چاہتا ہے ہاں جو اس قید کا پابند ہے وہ باقی تمام قیود سے آزاد ہو جاتا ہے ان کے متعلق تو وہ یوں کہتا ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دوسو زنجیر بھی لاؤ میں توڑ ڈالوں گا سوائے اپنے محبوب کی زلف کے زنجیر کے)

وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے خواہ لباس میں پیوند لگے ہوں یا جوتا ٹوٹا ہوا ہو کیونکہ وہ ان سب کو محبوب کی طرف سے سمجھتا ہے اور ہر چہ از دوست میرسد نیکو ست (جو کچھ محبوب کی طرف سے پہونچے وہی بہتر ہے) پس آپ اس قید زلف سے نہ گھبرائیں کیونکہ واللہ یہی عزت کا ذریعہ ہے باقی سب قیدیں توڑنے کے قابل ہیں (اس قید سے آدمی خدا کا غلام بنتا ہے اور باقی قیود سے نفس و شیطان کا غلام بنتا ہے اور خدا کا غلام سب کا بادشاہ ہوتا ہے اور نفس و شیطان کا غلام سب کا غلام ہے وہ ہر جگہ ذلیل ہی ہوتا ہے ۱۲) تو ہماری زندگی ایسی سادہ ہونی چاہیئے جیسی سلف کی زندگی تھی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب لباس تبدیل کرنے کے لئے عرض کیا گیا تو اول آپ نے اپنے مذاق کے موافق انکار کیا اور فرمایا کہ ہم کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے بس یہی عزت ہمارے واسطے کافی ہے، لباس کی عزت ہم کو نہیں چاہیئے۔ بعض

صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں کی دلجوئی ہی کے لئے لباس بدل لیجئے یہ بھی اسلام کا عجیب مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بات اپنی وضع اور مذاق کے خلاف ہو اور شریعت سے ممنوع نہ ہو تو احباب کے اصرار پر ان کی دلجوئی کے لئے کر لینا چاہیئے دلجوئی شرعاً مطلوب ہے بشرطیکہ حد جواز تک ہو افسوس آج ہم میں یہ بات نہیں رہی حالانکہ یہ خاص مسلمانوں کا وصف ہے اور اشاعت اسلام زیادہ تر اسی دلجوئی سے ہوئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیا کرتے تھے کہ شمشیر کے لئے شمشیر زن بھی تو چاہئیں تو وہ شمشیر زن کہاں سے جمع ہو گئے تھے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہی نے جمع کیا تھا پس ثابت ہوا کہ در اصل اشاعت اسلام اخلاق اسلامیہ سے ہوئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ سے طائف تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کے رؤسا نے آپ کو سخت جواب دیا اور قبول اسلام سے انکار کر دیا، اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بستی کے شہدوں کو بھڑکا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھیلے پتھر پھینکیں اس وقت غیرت خداوندی کو جوش ہوا اور بحکم الٰہی حضرت جبرئیل علیہ السلام ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) کو ساتھ لے کر آئے اور عرض کیا کہ حق تعالےٰ نے سلام کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کی قوم کا برتاؤ آپ کے ساتھ دیکھا اور ملک الجبال کو حکم دیدیا ہے کہ آپ جو کچھ اس سے فرمائیں اس کی تعمیل کرے۔ اگر آپ حکم دیں تو یہ اسی وقت طائف کے دونوں پہاڑوں کو باہم ملا دے جس سے ساری آبادی پس کر رہ جائے مگر اللہ رے آپ کی رحمت آپ نے فرمایا کہ چھوڑ دو مجھ کو اور میری قوم کو میں ان کی تباہی نہیں چاہتا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور اگر یہ اسلام نہ لائیں تو مجھے امید ہے کہ شاید ان کی اولاد میں سے کوئی شخص خدا کی توحید کا اقرار کر لے۔ آپ کی دلجوئی کی یہ حالت تھی کہ جب بنو ثقیف کے کفار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اتارا کہ پاس کے پاس ان کی خاطر مدارات اچھی طرح ہو سکے (اور یہ بھی مصلحت تھی کہ وہ مسلمانوں کی عبادات اور نماز وغیرہ کو اچھی طرح دیکھ لیں چنانچہ ان پر اس کا

اثر ہوا اور وہ اسلام لانے پر آمادہ ہو گئے) پھر یہ بھی دلجوئی کی کہ بعض نے اسلام لاتے کے لئے یہ شرط پیش کی تھی کہ ہم زکوٰۃ نہ دیں گے بعض نے کہا کہ ہم جہاد نہ کریں گے آپ نے فرمایا اچھا بہتر ہے تم زکوٰۃ نہ دینا نہ جہاد کرنا۔ صحابہ کو اس شرط کی منظوری پر حیرت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جب یہ اسلام لے آئیں گے تو سب کچھ کریں گے کیونکہ جب اسلام دل میں آجاتا ہے تو یہ حالت ہو جاتی ہے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند

فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

(جس شخص نے تجھکو پہچان لیا وہ جان کو کیا کریگا اہل و عیال مال و اسباب کو لیکر کیا کرے گا)

اسلام کے بعد نہ مال کی محبت رہتی ہے نہ جان کی، اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حسین کسی سے کہے کہ مجھے دیکھو اور دیکھنے والا کہے کہ اس شرط سے دیکھتا ہوں کہ بیوی کو نہ چھوڑوں گا اور وہ اس شرط کو منظور کر لے تو حقیقت میں یہ منظوری محض ظاہری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھ کو دیکھنے کے بعد یہ خود ہی سب کو چھوڑ دے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری بھی محض ظاہری تھی جو حقیقت میں نامنظوری تھی آپ جانتے تھے کہ یہ سب شرطیں اسلام لانے سے پہلے ہی ہیں اسلام کے بعد یہ خود ہی سب کچھ کریں گے چنانچہ یہی ہوا کہ اسلام کے بعد ان لوگوں نے جہاد بھی کیا اور زکوٰۃ بھی دی۔ اس دلجوئی ہی سے لوگ کھینچے چلے آتے تھے اس لئے ہمارے اکثر بزرگوں نے نرمی اور دلجوئی سے بہت کام لیا ہے (مجھے حضرت حاتم اصم کی حکایت یاد آئی کہ ایک شخص نے مجمع میں ان کے سامنے ہدیہ پیش کیا اول تو انھوں نے قبول سے انکار کیا اس نے اصرار کیا تو آپ نے لے لیا۔ لوگوں نے بعد میں پوچھا کہ حضرت اگر آپ کو لینا ہی تھا تو پہلے انکار کیوں کیا اور جو نہ لینا مقصود تھا تو بعد میں کیوں لے لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اصل میں تو مجھ کو لینا مقصود نہ تھا اس لئے انکار کر دیا تھا مگر پھر میں نے دیکھا کہ اس وقت مجمع میں ہدیہ رد کر دینے سے اس شخص کی ذلت ہو گی اور میری عزت

اور لے لینے سے میری ذلت ہوگی کہ انکار کے بعد لے لیا اور اس کی عزت ہوگی تو میں نے اپنے بھائی کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دی اب ہماری یہ حالت ہے کہ دلجوئی کریں گے تو ایسی کہ حرص میں مبتلا ہو جائیں گے پس جو آیا لے لیا چاہے حرام ہو یا حلال واپس کرنا جانتے ہی نہیں یا استغنا برتتے ہیں تو ایسا جو کبر تک پہونچ جاتا ہے استغنا میں چونکہ اپنی عزت ہوتی اور ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے اس لئے اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ پھر کسی کا دل توڑنے کی بھی پرواہ نہیں کرتے غرض ہماری کوئی بات اعتدال کی نہیں بس یہ حالت ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی
چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا جیسا ہو جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو مغرور و متکبر بن جاتا ہے)

مجھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی، بلکہ دو حکایتیں یاد آئیں ایک سے حضرت کی شان استغنار کا پتہ چلے گا، دوسری سے تواضع کا۔ تواضع تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت جب ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو اول اول ایک رباط میں قیام فرمایا ایک دن کوئی شخص رباط میں رہنے والوں کو ایک ایک دوانی تقسیم کرتا پھر رہا تھا جب وہ حضرت کے حجرہ پر پہونچا تو یہاں شاہانہ دربار تھا۔ حق تعالیٰ نے حضرت کو لطیف طبیعت عطا فرمائی تھی اس لئے سب صاف ستھرا سامان رہتا تھا، وہ یہ دیکھ کر رکا اور حضرت کو دونی نہ دی تو آپ خود فرماتے ہیں کہ بھائی تم نے ہمارا حصہ نہ دیا وہ کہنے لگا حضرت آپ کی خدمت میں ایسی حقیر چیز پیش کرنا خلاف ادب ہے۔ فرمایا سبحان اللہ اگر یہ شخص یہی سمجھتا تو پھر یہ سامان کہاں سے ہوتا کیا تم مجھے زمرۂ فقراء سے خارج سمجھتے ہو بھائی میں تو فقیر ہی ہوں اور فقیر سمجھ کر ہی لوگ کچھ دے دلا جاتے ہیں اُسی سے یہ سامان اکٹھا ہو گیا جو تم دیکھ رہے ہو لاؤ تم میرا حصہ لاؤ یہ سن کر تو وہ شخص باغ باغ ہو گیا کہ اللہ اکبر میرے ایسے کہاں نصیب کہ حضرت خود مانگیں اور خوشی خوشی ایک دونی پیش کر دی

یہ تو شان تواضع تھی کہ ایک دونی کے لئے بھی اپنی احتیاج ظاہر فرمائی اور شان استغنا یہ تھی کہ ایک دفعہ حضرت پر کئی دن کا فاقہ تھا ایک میمن نے صورت سے پہچان لیا کہ حضرت فاقہ سے ہیں وہ حضرت کی لنگی مانگ کر لے گیا اور اس میں دو سَو ریال باندھ کر لایا۔ اس وقت حضرت نماز یا ذکر میں مشغول تھے وہ پاس رکھ کر چلا گیا۔ اب استغنا کی یہ کیفیت دیکھئے کہ حضرت نے جب لنگی اٹھائی تو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ یہ ریال اس نے مجھے دیئے ہیں بلکہ یہ سمجھے کہ امانت رکھ گیا ہے، اٹھا کر احتیاط سے امانت کی جگہ رکھدیا دوسرے وقت پھر فاقہ سے رہے۔ اس میمن نے جب دوسرے وقت بھی اسی حال سے دیکھا تو آکر عرض کیا کہ آپ نے وہ ریال خرچ کیوں نہ کر لئے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی امانت کو کیسے خرچ کر لوں کہا حضرت وہ امانت نہ تھی بلکہ وہ تو میں ہدیہ دے گیا تھا۔ فرمایا ہدیہ اس طرح دیا کرتے ہیں کہ پاس رکھ کر چلے گئے کچھ کہا نہ سُنا اُس نے غلطی کی معافی چاہی تب آپ نے ان کو خرچ کیا تو شان استغنا یہ تھی کہ دو سو ریال پر (جو کہ دو سو روپے سے زیادہ ہوتے ہیں) ضرورت و حاجت کے وقت بھی ہدیہ کا گمان نہ ہوا بلکہ امانت ہی سمجھتے رہے ہم سوال ہوتے تو نہ معلوم کتنی تاویلیں کر کے اس کو ہدیہ بنا لیتے اور کوئی دونی لاکر ہم کو دیتا تو اس کو سو سناتے کہ ہم کیا غریب محتاج ہیں تجھ کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ بس دوانیاں بانٹتے چلے تو جو سامنے آیا اس کو غریب سمجھ کر ایک دوانی دیدی یہ کوئی آدمیت ہے۔ ان حضرات میں استغنا بھی تواضع کے ساتھ تھا اس لئے اگر کسی وقت استغنا سے دوسرے کی ذلت ہوتی تو وہاں یہ حضرات صورت استغنا کو چھوڑ کر تواضع کی صورت اختیار کر لیتے تھے جیسا حضرت حاتم اصمؒ نے کیا کہ اپنی عزت کو مسلمان کی عزت پر نثار کر کے انکار کے بعد بھی اس کا ہدیہ قبول کر لیا۔ صاحبو! یہ برتاؤ تھا ہمارے بزرگوں کا وہ استغنا اور دلجوئی دونوں کو جمع کرتے تھے ہمارے حضرات عاقل عالم شیریں دلجو خلیق اور مستغنی سب کچھ ہوتے تھے ان کی وشان تھی ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا رکھتے ہو جو تمام محبوب رکھتے ہیں وہ تنہا تمہارے اندر ہیں)

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

مگر اب یہ حالت ہے کہ ایک طبقہ نے ایک بات لے لی دوسرے نے دوسری بات لیلی کوئی حد سے زیادہ خلیق بن گیا کوئی مستغنی بن گیا اور افسوس ہے کہ باہم اہل حق کے اندر الگ الگ پارٹیاں ہوگئیں۔ جدا جدا طبقے ہوگئے ہماری یہ حالت افسوس ناک ہے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اختلاف حد شرع سے متجاوز ہے تو جس نے تجاوز کیا ہو وہ اپنی اصلاح کرے اور اگر حدود شرعیہ کے اندر ہے تو یہ پارٹی بندی کیسی سب کو یہ تفریق قطع کرکے ایک ہو جانا چاہیئے۔ آخر اختلاف مذاق حد شریعت کے اندر اندر تو سلف میں بھی ہوا ہے مگر وہاں تفریق نہ تھی کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا مگر اب یہ حالت ہے کہ ہر ایک کو دوسرے پر اعتراض کرتا ہے نہ ادھر تہذیب رہی نہ اُدھر۔ ہم کو اپنے سلف کے حالات میں غور کرنا چاہیئے۔ ہمارے بزرگانِ دین کی حکائیتں بھی ایسی ہیں کہ ان سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ سلف کی حکایات کو اصلاح میں بڑا دخل ہے اس لئے حکایات سلف کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس طرح نرمی اور دلجوئی کرتے تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے وعظ میں ایک شخص آیا جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا جب وعظ ختم ہوچکا تو آپ نے اس شخص کو ٹھہرالیا وہ ڈرا کہ اب میری خبر لی جاوے گی مگر مولانا تو ایسے پردہ پوش تھے کہ ایک بار آپ کے درس حدیث میں ایک معمولی طالب علم جنابت کی حالت میں بدون نہلائے چلا آیا آپ کو کشف سے معلوم ہوگیا کہ یہ جنبی ہے فوراً آپ نے درس بند کرکے اس سے فرمایا کہ بھائی وہاں ہی ٹھہرو آج تو جمنا کی سیر کو دل چاہتا ہے آپ اور سب طلبہ تیار ہوگئے اور وہاں جاکر غسل کیا اس نے بھی غسل کیا۔ پھر فرمایا لاؤ کچھ پڑھ لو ناغہ کیوں کیا جاوے۔ تو مولانا کسی کی کیا خبر لیتے۔ چنانچہ اس شخص کو ٹھہرا کر فرمایا کہ بھائی مجھ میں ایک عیب ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا لٹک جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ٹخنوں سے نیچا پائجامہ پہنے وہ جہنم میں جائیگا تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں اس عذاب میں گرفتار نہ ہوں ذرا دیکھنا میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں۔ وہ شخص قدموں میں گر پڑا کہ حضرت خدانخواستہ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا یہ عیب تو میرے اندر ہے میں آج سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسا کبھی نہ کروں گا یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نرمی اور دلجوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیوں چھوڑتے چنانچہ آپ نے احباب کی دلجوئی کے لئے لباس کا بدلنا منظور فرمایا۔ اب دوسرے جوڑے کی تلاش ہوئی اور امیر المؤمنین کی گٹھڑی دیکھی گئی تو اس میں دوسرا جوڑا کہاں تھا وہ کوئی روپیہ پیسہ جمع کرتے تھے نہ جوڑے اور کپڑے بس آپ کے پاس تو وہی ایک جوڑا تھا جو تن پر تھا۔ سید احمد دحلان نے غالباً فتوحات اسلامیہ میں آپ کے زہد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انتقال کے وقت عزرائیل علیہ السلام آئے تو حضرت عمر رضہ کے گھر کو دیکھ کر بولے سبحان اللہ امیر المؤمنین کا گھر ہے جہاں کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا جس گھر میں تم آنے والے ہو اس کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ غرض کسی مسلمان نے ایک جوڑا مانگا دیدیا جس کو پہنکر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے مگر دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے اور فرمایا کہ تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کر دیا تھا یہ کپڑے پہن کر اور اس سواری پر سوار ہوکر تو میری حالت بدل گئی لاؤ میرے وہی کپڑے اور وہی اونٹنی (واقعی حضرت عمر رضہ سے شیطان بالکل عاجز تھا اور عاجز کیا معنے ڈر کر دور بھاگتا تھا اُن پر شیطان کا کبھی قابو نہیں چلا ۱۲) چنانچہ اس حالت سے نصاریٰ کے سامنے پیش ہوئے اور یہی ہیئت سبب ہوئی فتح بیت المقدس کی کیونکہ ان کی کتابوں میں آپ کی یہی شان لکھی گئی تھی۔ غرض ہمارے بزرگان دین کا یہ طرز تھا کہ تکلف اور تصنع سے بہت احتراز کرتے تھے سادگی اور بے تکلفی ان کا شعار تھا مسلمانوں کو اپنی معاشرت ایسی ہی رکھنا چاہیئے اور میں بالخصوص اہل علم کو بھی ایک بات کہتا ہوں گو ان کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں مگر خیر بے ضرورت بھی تو بعض باتوں کر لی جاتی ہیں وہ یہ کہ علماء کی سادگی صرف اسی بات میں نہیں کہ وہ کسی خاص موقعہ پر جوڑا نہ بدلیں بلکہ ہماری اصلی سادگی اور بے تکلفی یہ ہے کہ اگر کوئی بات ہم کو معلوم نہ ہو یا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو پچاس آدمیوں کے سامنے کہدیں کہ ہم کو معلوم نہیں یا ہماری سمجھ میں نہیں آیا مدرس کی بے تکلفی یہ ہے کہ اگر اس سے کسی مقام کی تقریر میں غلطی ہو جائے اور شاگرد متنبہ کرے تو

فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلے۔ آج ہم اس صفت کو مفقود پاتے ہیں۔ مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دس مرتبہ کی حکایت ہے کہ جہاں آپ سے تقریر میں کچھ فردگذاشت ہوا اور کسی طالب علم نے عرض کردیا تو فوراً فرما دیتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی اور صحیح تقریر یہی ہے جو تم نے کی اور مولانا کا اس حالت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ اس کو ایک ہی مجلس میں بار بار فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور ہم میں یہ مرض ہے کہ طلبہ کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے اگر وہ صحیح بھی کہتا ہوگا تو گھونٹ گھانٹ کر اسے بند کردیں گے پھر یہ مرض متعدی ہوا کہ ان طالب علموں نے بھی اپنے شاگردوں کو گھونٹنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ سب میں تکلف اور تصنع کا مرض اچھی طرح سرایت کرگیا اور جہل مرکب میں مبتلا رہے سو الگ۔ میں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت اپنے دو بزرگوں سے سنی ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک بزرگ عالم قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اس طرح کہ پہلے آیت پڑھتے اس کے متعلقات ہر فن کے مسائل بیان کرتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان کے حلقہ میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن شیخ نے کسی مقام پر ایک فقہی مسئلہ میں غلطی کی اس وقت تو شاہ صاحب خاموش رہے جب درس ختم ہوچکا اس وقت پاس جاکر چپکے سے متنبہ کیا کہ یہ مسئلہ مجھ کو اس طرح یاد ہے۔ ان بزرگ نے فوراً تمام طلبہ کو واپس بلایا سب جمع ہوگئے تو کہا قَدْ غَلَطْنَا فِیْ ھٰذِہٖ الْمَسْئَلَۃِ وَ نَبَّھَنَا عَلَیْہِ ھٰذَا الشَّیْخ وَالصَّحِیْحُ ھٰکَذَا۔ یعنی ہم نے اس مسئلہ میں غلطی کی جس پر ہمکو اس شیخ (ہندی یعنی شاہ صاحب) نے متنبہ کیا اور صحیح تقریر اس کی یوں ہے پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ تقریر کا اعادہ کیا دیکھئے علماء یہ حضرات ہیں کہ ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہوئی کہ ہم سے یہاں غلطی ہوگئی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یوں بھی کہہ دیا کہ اس شیخ نے ہم کو متنبہ کیا حالانکہ حضرت شاہ صاحب نے خفیہ اسی لئے متنبہ کیا تھا کہ اگلے دن یہ اس مقام کی صحیح تقریر اپنی طرف سے کردیں مگر ان کو اتنا صبر کہاں تھا اسی وقت سبکو

بلاکر صاف اپنی غلطی کا اقرار کیا اور اپنے محسن کو بھی ظاہر کر دیا جس نے غلطی پر متنبہ کیا تھا اگر ہم سوال ہوتے تو اول تو اپنی غلطی ہی کو تسلیم نہ کرتے اُسی میں بحث شروع کر دیتے اور جو تسلیم بھی کرتے تو اس طرح صاف صاف اقرار نہ کرتے اور جو کرتے بھی تو یہ ظاہر نہ کرتے کہ اس غلطی پر ہم کو کسی دوسرے نے متنبہ کیا ہے بلکہ اگلے دن اس طرح تقریر کرتے کہ طلبہ پر یہ ظاہر ہوتا کہ شیخ کو خود ہی تنبہ ہوا ہے۔ آخر یہ کبر اور تصنع نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

صاحبو! کسی بات کے متعلق لاعلمی ظاہر کر دینا کوئی نقص نہیں نہ کوئی عیب ہے ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سوال پر لَا اَدْرِی (میں نہیں جانتا) فرمایا ہے چنانچہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے اچھی جگہ کونسی ہے اور سب سے بُری جگہ کونسی ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا۔ چنانچہ حضرت جبرئیل سے پوچھا انہوں نے کہا مجھے بھی معلوم نہیں، حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتلاؤں گا حق تعالیٰ سے پوچھا تو ارشاد ہوا خَيْرُ الْبِقَاعِ الْمَسَاجِدُ وَشَرُّ الْبِقَاعِ السُّوقُ۔ سب سے اچھی جگہ مسجد ہے اور سب سے بدتر بازار ہے۔ دیکھئے بعض دفعہ انبیاء اور ملائکہ نے بھی لَا اَدْرِی (مجھے معلوم نہیں) فرمایا ہے تو پھر آپ کی اس میں آپ کی کیا شان گھٹتی ہے مگر افسوس ہم سے کبھی یہ نہیں ہو سکا۔ پس اگر کسی عالم میں یہ وصف موجود ہو تو بیشک فخر کی بات ہے اور واقعی اس میں تصنع و تکلف نہیں ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے باقی یہ کوئی فخر نہیں کہ ہم نے عمامہ نہیں باندھا جبہ نہیں پہنا ننگے پیر چل لئے کیونکہ ان باتوں سے تو تعریف ہوتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ فلانا بہت بے نفس اور متواضع ہے اور جس بات سے تعریف ہوتی ہو اس کا اختیار کرنا بڑا کمال نہیں اور اگر یہ کہو کہ لَا اَدْرِی (مجھے معلوم نہیں) کہنے میں بھی تو تعریف ہوتی ہے۔ تو یہ سچ ہے مگر اس وقت تو ذلت ہی ہوتی ہے گو بعد میں تعریف ہو۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے بعض صاحبوں کو

روشنی زیادہ کرمے کے اہتمام میں دیکھا تھا اس پر میں نے یہ سب باتیں عرض کی ہیں کہ ہم میں بے تکلفی اور سادگی ہونا چاہیئے گو اس مضمون آیت سے کوئی تعلق نہ تھا ویسے ہی درمیان میں ایک ضروری بات پر متنبہ کرنا چاہا تھا۔ اور دیر تک اس کو ممتد کرنے کا قصد نہ تھا یہ خدا سازبات ہے کہ اس پر گفتگو بڑھ گئی ممکن ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو اپنی طرف سے تو میں بیان میں ارتباط کا لحاظ رکھتا ہوں لیکن جب حق تعالیٰ کسی خاص مضمون کو بیان کرانا چاہتے ہیں تو پھر ربط وغیرہ کا خیال نہیں رہتا اس وقت وہی کہنا پڑتا ہے جو وہ کہلواتے ہیں جیسا کہ مولانا رومی نے بیان فرمایا ہے ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ مت سوچ)

مثنوی پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس میں بعض مقامات پر قافیہ کی رعایت نہیں ہے کوئی کوئی شعر بے قافیہ ہو گیا ہے تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ میں تو قافیہ کی رعایت کرنا چاہتا ہوں مگر دلدار کا یہ اشارہ ہے کہ میرے دیدار کے سوا کسی چیز کی طرف توجہ مت کرو اس لئے جہاں بے تکلف قافیہ بن جاتا ہے بنا دیا جاتا ہے اور جہاں سوچنا پڑتا ہے وہاں سوچتا نہیں ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعر میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ شاعری میں قافیہ ہونا چاہئے مگر یہ بھی نہیں کہ اس کا ایسا پابند ہو کہ مضمون کو قافیہ کے تابع کیا جائے جیسا کہ اکثر شعراء کی عادت ہے کہ وہ بعض اشعار محض قافیہ کی رعایت سے تصنیف کرتے ہیں بلکہ بلاغت اس کا نام ہے کہ قافیہ کو مضمون کے تابع کیا جائے اور جہاں مضمون کے موافق قافیہ نہ ملے وہاں مضمون کی رعایت کرنا چاہئے نہ کہ قافیہ کی کیونکہ یہ بھی تکلف میں داخل ہے مگر ایسا بھی بے تکلف نہ ہو جیسا ہمارے ایک دوست نے جو خورجہ کے رہنے والے ہیں ظرافت میں ایسا کیا وہ ایک عربی خواں بددماغ نیچری سے ملے جن کو انہوں نے ایک دیوان کسی استاد کا پیش کیا تھا اُس نے غایت بددماغی سے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس کا دیوان ہے۔ پوچھتے ہیں یہ کس کا دیوان ہے انھوں نے کہا میرا وہ بولے آپ

شاعر بھی ہیں انہوں نے کہا جی ہاں۔ بولے آپ کوئی شعر فی البدیہہ کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں بولے کہ اچھا کوئی شعر کہیے انہوں نے یہ شعر پڑھا ؂

گر مصور تیری تصویر اینچے اُس کے اس کام کو دو مہینے چاہئیں

انہوں نے کہا یہ شعر کیسا جس میں نہ وزن نہ قافیہ تو کہنے لگے حضور میں نے آپ کی ایک تحریر میں پرانے فیشن کی مذمت دیکھی تھی جب سے سب پرانی چیزیں چھوڑ دیں اور یہ بھی پرانا فیشن ہے کہ وزن بھی ہو بحر بھی ہو قافیہ بھی ہو اس لئے میں نے اس کو بھی حذف کر دیا۔ ہمارے قصبہ میں ایک شاعر تھے وہ ناپ کر شعر کہا کرتے تھے۔ یعنی شعر کہہ کر ہر مصرع کو تاگے یا تنکے سے ناپ لیا۔ اگر دونوں برابر ہو گئے تو بس شعر بن گیا اور اگر کوئی مصرع بڑھنے لگا تو اس کو باریک قلم سے لکھ کر برابر کر دیا۔ جب ان کا دیوان چھپنے لگا تو لوگوں نے کہا اس میں ردیف ضاد تو ہے ہی نہیں آپ نے پوچھا کہ کسی ردیف میں کئی غزلیں بھی ہیں لوگوں نے بتلایا کہ ہاں فلاں ردیف میں کئی غزلیں ہیں تو آپ نے کہا کہ ان میں سے ایک غزل کے ہر شعر کے اخیر میں مقراض بڑھا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ضاد کی ردیف تیار ہو گئی جس میں ہر شعر کے ختم پر مقراض ہے واہیات چاہے تُک ہو یا نہ ہو مگر مقراض موجود ہے (واقعی وہ سارا دیوان ہی مقراض سے کترنے کے قابل ہے") تو میں ایسی بےتکلفی کو نہیں کہتا۔ اس پر مجھے غالب کی حکایت یاد آئی کہ اس نے اپنے ایک دوست کی دعوت کرنا چاہی تو اس نے انکار کیا اور کہا تم تکلف بہت کرتے ہو، غالب نے کہا اس مرتبہ تکلف نہ کروں گا اس نے اس وعدہ پر دعوت قبول کی اب آپ نے بےتکلفی کا یہ ڈھنگ اختیار کیا کہ بھنگی سے کہہ دیا کہ محلہ بھر کا کوڑا ہمارے گھر میں جمع کر دینا وہ کمبخت ایک ٹیلہ سا ہو گیا اس پر آپ ایک لنگوٹہ باندھ کر اور حقّہ سامنے رکھ کر بیٹھ گئے جب وہ دوست کھانے کو آئے تو غالب کو اس حلیہ سے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، کہا کچھ نہیں آج میں نے تکلف نہیں کیا۔

تو مولانا کے کلام میں بےتکلفی ضرور ہے مگر خدانخواستہ ایسی نہیں ہے مولانا کا کلام شاعری کے اعتبار سے بھی بہت بلند پایہ ہے ہاں کہیں کہیں تسامحات بھی ہیں

(اور اتنے طویل کلام میں اگر دو چار جگہ تسامحات ہو جائیں تو یہ کوئی نقص نہیں آخر چھ دفتر کچھ تھوڑے نہیں ہیں ۱۲) پھر ان کی وجہ بھی مولانا نے بیان فرما دی ہے کہ ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من　　　گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ کو سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے علاوہ اور کچھ مت سوچ)

اسی طرح گو بیان میں بھی ربط کا ہونا ضروری ہے مگر درمیان میں جب کوئی دوسرا ضروری مضمون ذہن میں آجاتا ہے تو میں اس کو چھوڑتا نہیں ربط کی ایسی پابندی بھی نہ چاہئے کہ ضرورت کا بھی لحاظ نہ کیا جائے اس لئے درمیان میں تکلف اور بے تکلفی پر یہ مضمون ایک ضرورت سے بیان ہو گیا گو ظاہر میں یہ اجنبی کلام تھا مگر بحمد اللہ یہاں تو بے ربطی میں بھی ربط باقی ہے کہ درمیان میں ایک ضرورت سے دوسری بات آگئی تھی اس کو ختم کر کے پھر اپنے اصل کلام کی طرف عود کر آیا ہوں تو میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالٰے نے ہماری دو محبوب چیزوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے بعض مفاسد پر ہم کو مطلع فرمایا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مضمون اس وجہ سے بھی قابل ذکر ہے کہ ہماری بدحالیوں کا زیادہ سبب انہی دو چیزوں کی محبت ہے چنانچہ محبت مال کی بدولت باہم بغض و عداوت ہو جاتی ہے مسلمانوں میں جو آئے دن مقدمہ بازی ہوتی ہے اس کا منشا یہی محبت مال ہے نیز محبت مال ہی کی وجہ سے دوسروں کا حق دبا یا جاتا ہے۔

صاحبو! آپ اپنے امراض کو اچھی طرح جانتے ہیں میں کوئی دقیق بات نہیں بیان کر رہا ہوں یہ تو کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کو ہر شخص اپنے اندر غور کر کے جان سکتا ہے۔ صاحبو! کیا آپ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ اکثر بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے زیادہ تو یہ ہے کہ خود باپ ہی ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے ہی سب جائداد لڑکوں کو دے جاتے ہیں اور اگر باپ نے ایسا نہ کیا تو بعد کو بھائی ایسا کرتے ہیں کہ بہنوں کو حصہ

؎ ربط کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۸ سطر ۸ قولہ جس قدر دھندے ہیں سب ان ہی دو کے واسطے ہیں ۱۲

نہیں دیتے۔ دنیادار تو ان کا حق ہی نہیں سمجھتے مگر وہ اس میں یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ بہنوں نے ہم کو معاف کر دیا۔ میں کہتا ہوں اول معافی کی حقیقت تو سمجھ لیجئے پھر میں پوچھوں گا کہ کیا بہنیں اسی طرح معاف کرتی ہیں۔

معافی کی حقیقت یہ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا. حق تعالےٰ مردوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ اگر عورتیں اپنے مہر میں سے کچھ حصہ دل کی خوشی سے تم کو دیدیں تو اُسے کھاؤ خوش گواری اور لذت کے ساتھ اس سے معلوم ہوا کہ معافی یا عطا کے لئے خوش دلی ضروری ہے مگر یہاں اس کی ذرا پروا نہیں کی جاتی کہ بہن نے خوشی سے دیا ہے یا اوپرے دل سے۔ بس جہاں اس کی زبان سے اتنا نکلا کہ میں نہیں لیتی اور بھائی جان نے اس کو معافی سمجھ لیا۔ پھر الٹ کر اس سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو یہ بات دل سے کہہ رہی ہے یا محض زبان سے۔ اور یہیں سے میں اس پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ آجکل جو چندہ لیا جاتا ہے اس میں بھی اکثر خوش دلی کا اہتمام نہیں کیا جاتا گو اس میں دینے والوں پر بھی ملامت ہے کہ وہ دین کے کاموں میں خوشی سے کیوں نہیں خرچ کرتے لیکن اگر وہ یہ کوتاہی کرتے ہیں تو اس سے لینے والوں کو وہ چندہ حلال نہ ہو جائے گا حدیث میں صاف حکم موجود ہے اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (یاد رکھو کسی مسلمان آدمی کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہوتا) اگر کسی نے محض شرم و لحاظ سے چندہ دیا ہو تو اس کا لینا ہرگز جائز نہیں اگر یہ کہا جائے کہ صاحب اتنی احتیاط کی جائے تو چندہ بہت کم آئے گا جس سے کام نہیں چل سکتا تو اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ کام نہیں چل سکتا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ ضروری کام میں تو اتنا ہی روپیہ صرف ہوتا ہے جو حدود شریعت کے موافق آتا ہو اور جو ایسا ویسا چندہ ہوتا ہے وہ کام میں صرف نہیں ہوتا بلکہ بے تکا خرچ ہوتا ہے کہیں بے ضرورت عمارات میں کہیں مہمانوں کی فضول خاطر مدارت میں وغیرہ وغیرہ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ قلیل چندہ سے کام نہیں چل سکتا تو میں پوچھتا ہوں کہ کام چلانے سے غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ یہی غرض ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوں تو اگر وہ راضی نہ ہوئے تو بتلائیے کام

چلا کر کیا کیجئے گا بس سہل صورت یہ ہے کہ حدود شریعت کے موافق چندہ لو اور جتنا
کام اس میں چل سکے اتنا چلاؤ زیادہ کا قصد ہی نہ کرو اگر کسی وقت زیادہ چندہ آجاوے
اس وقت اور کام بڑھادو اور اگر پھر کم ہو جائے تو تم کام کو بھی کم کردو کیونکہ آپ
اتنے ہی کام کے مکلف ہیں جتنا کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کے مکلف نہیں تو جتنا
کام حلال چندہ میں آپ کر سکیں اس سے زیادہ ہرگز نہ کریں تاکہ حرام چندہ کی ضرورت ہی
نہ ہو مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ابتدا ہی سے بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا جاتا ہے اور اس کیلئے
حلال چندہ کافی نہیں ہوتا تو پھر حدود سے آگے بڑھتے ہیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے
کہ کون خوشی سے دے رہا ہے اور کون دباؤ یا لحاظ سے یہی معاملہ بہنوں کے حق میں ہو رہا
ہے کہ اہل علم نے تاویل کر لی ہے کہ اس نے تو اپنا حق معاف کر دیا میں پوچھتا ہوں کہ ذرا
انصاف سے کہنا کیا بہنوں نے خوشی سے اپنا حق چھوڑا ہے ہرگز نہیں بلکہ محض بدنامی کے
خوف سے کیونکہ بہنوں کے لئے یہ بات عیب شمار کی جاتی ہے کہ وہ باپ کی جائداد
حصہ لیں۔ نیز وہ اس خیال سے بھی نہیں لیتیں کہ اگر ہم حصہ لے لیں گے تو پھر شادی
بیاہ کے موقعہ پر بھائی ہمیں پوچھیں گے نہیں اور نہ چھوٹ چھٹاؤ ہو جائے گا تو یہ دینا
کچھ خوشی کا دینا نہ ہوا۔ دوسرے دینا اس شخص کا معتبر ہوتا ہے جسے شئے موہوب
کی حقیقت بھی معلوم ہو یعنی جس چیز کو دے رہا ہے وہ اس کی حقیقت بھی سمجھتا ہو اور جسے
اپنے فعل کی حقیقت بھی معلوم نہ ہو اس کا دینا معتبر نہیں یہی وجہ ہے کہ نابالغ اور معتوہ
پر حجر کیا جاتا ہے یعنی اس کو تصرفات سے روک دیا جاتا ہے اور اس کی جائداد کورٹ
ہو جاتی ہے کہ اس میں وہ کچھ بیع و شرا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے تصرفات کی حقیقت
سے بے خبر اور نفع و ضرر سے ناواقف ہے اب دیکھئے کہ بہنیں جو اپنا حق چھوڑ دیتی ہیں
کیا ان کو اپنے اس فعل کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، ہرگز نہیں لڑکیوں کو یہ معلوم ہی نہیں
کہ جائداد کیا چیز ہوتی ہے اور وہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ رہی ہیں اس لئے بدون تجربہ
کے ان کی معافی معتبر نہ ہو گی بلکہ اس بارہ میں وہ مثل معتوہ کے شمار ہوں گی سچی معافی
کی صورت یہ ہے کہ وہ تین چار برس تک اپنی جائداد پر قابض رہیں، ہر فصل کی پوری

آمدنی وصول کرتی رہیں جب اس عرصہ میں ان کو جائداد کی حقیقت اور اس کا نفع اور لذت خوب معلوم ہو جائے اس کے بعد بھی اگر وہ نہ لیں تو بیشک یہ دینا کچھ شمار کے قابل ہوگا۔ بعض لوگ یہ کہدیتے ہیں کہ صاحب ہم نے بیاہ شادی اور بیلالے رکھنے میں بہنوں کو اتنا دیدیا ہے جس سے ان کا حق ان کے پاس پہنچ گیا سو یہ دینا بالکل قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس کو جائداد کی قیمت کہکر نہیں دیا جاتا اور نہ بہنیں اس کو قیمت سمجھ کر لیتی ہیں بلکہ یہ تو محبت کا برتاؤ سمجھ کر دیا جاتا ہے عقد بیع کے لئے ایجاب وقبول اور بدل کی تعیین اور اس پر تراضی طرفین ضروری ہے، یہاں ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوتی۔ پھر تمہاری ان سب باتوں کے مان لینے کے بعد بھی یہ بات ہے کہ بہن جو یہ کہدیتی ہے کہ میں نے اپنا حق معاف کر دیا اس سے تو کسی طرح بھی بھائی کے لئے بہن کا حق حلال نہیں ہو سکتا چاہے وہ خوشی ہی سے معاف کرتی ہو کیونکہ معافی کی حقیقت ابراء ہے اور ابراء دیون سے ہوتا ہے نہ کہ اعیان سے اور اگر اس کو ہبہ کہا جائے تو اول تو اس لفظ کے یہ معنی نہیں اور اگر ہوں بھی تو ہبہ کے لئے موہوب کا مقسوم ومفرز ہونا شرط ہے مشاع کا ہبہ درست نہیں اور عموماً بہنوں کی یہ معافی تقسیم وقبضہ سے پہلے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی حال میں اس لفظ سے بہن کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اگر کسی بہن کو اپنا حق خوشی سے دینا ہی منظور ہو تو اس کی بے خلجان صورت یہ ہے کہ معافی کا لفظ نہ کہے بلکہ بھائی سے یوں کہے کہ میں نے اپنا حصہ تمہارے ہاتھ اتنے روپیہ میں بیع کیا اور وہ کہے میں نے قبول کیا اب زمین بہن کی ملک سے نکل گئی اور بھائی کے ذمہ زر ثمن واجب ہو گیا اس زر ثمن کو یہ بہن اگر چاہے معاف کر دے۔ اب بتلایئے اس طرح کون کرتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ طریقہ معلوم ہونے کے بعد بھی کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ بہن کی گذشتہ معافی معتبر نہ تھی لاؤ اب اس سے دو بول پھر کہہ لیں ذرا سی سستی اور غفلت میں عمر بھر حرام کھاتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ زبان ہلانے میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوتا ہے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ وہ معاملات میں قانونی رعایات تو بہت جلدی کر لیتے ہیں مگر شرعی رعایات نہیں کرتے اس کی پرواہ ہی نہیں کہ اس معاملہ میں شرعاً سقم ہے لاؤ اس کی اصلاح کر لیں اگر کوئی یہ عذر کرے کہ

بہن سے زبانی کہتے ہوئے شرم آتی ہے تو خط میں لکھ بھیجو اور اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو آپ کی وہی مثال ہوگی جو واجد علی شاہ کے احدیوں کی تھی کہ دو احدی ایک جگہ جمع تھے ایک لیٹا ہوا ایک بیٹھا ہوا سامنے سے ایک سوار گذرا تو لیٹے ہوئے احدی نے اس کو پکارا بھائی سوار بھائی سوار ذرا یہاں آنا وہ آیا پوچھا کیا کہتا ہے کہا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے اٹھا کر میرے منہ میں ڈالدے اس نے کہا کمبخت تو نے اتنے ذرا سے کام کے واسطے میرا راستہ کھوٹا کیا اتنا کام تو خود نہیں کر سکتا کہنے لگا اللہ کے واسطے تو ہی منہ میں ڈالدے اب میں کہاں ہاتھ ہلاؤں پھر سینہ پر لاؤں پھر منہ تک لیجاؤں سوار نے اس کے دوسرے ساتھی سے کہا ابے تو اس کے پاس بیٹھا ہے تو نے ہی ڈالدیا ہوتا اس نے کہا بس جناب ایسی بات نہ کہئے گا میں کھلاؤں گا اسے بیر سنو کل میں لیٹا تھا اور یہ بیٹھا تھا میں نے جمائی لی تو اس وقت کتا میرے منہ کے اندر موتنے لگا تو اس سے اتنا نہ ہوا کہ اس کو ہٹا دیتا تو میں اسے بیر ضرور کھلاؤں گا۔

مجھے اس پر اپنے طبقہ کی بھی ایک حکایت یاد آئی کہ ہماری جماعت میں بھی ایک طبقہ اس قسم کا ہوتا ہے یعنی طالبعلموں کا طبقہ چنانچہ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم کے حجرے میں چوہے نے بہت سی مٹی نکال کر ایک ڈھیر جمع کر دیا اور وہ حضرت روز اس کو دیکھتے تھے مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ یا ہر اٹھا کر پھینکدیتے یا سوراخ بند کر کے وہیں دبا دیتے بس جیسی چوہے نے نکالی تھی اسی طرح ڈھیر لگا رہا۔ ایک دن ہمارے بھائی صاحب کے کارندے جو حاجی بھی ہیں ان کے حجرہ میں آگئے تو ان کو ڈھیر لگا ہوا بُرا معلوم ہوا انہوں نے مٹی سوراخ میں بھر کر درست کر دیا اور حجرہ کی صفائی کر دی اس کے بعد پھر چوہے نے مٹی نکالدی کسی نے کہا میاں اس کو درست کر دیا ہوتا تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی آکر کریں گے۔ بس حاجی جی نے ایک دن صفائی کر کے ایسی خطا کر دی تھی کہ عمر بھر کے لئے وہی اس کام کے ملازم ہوگئے۔ خیر طلبہ کی اس کاہلی سے کوئی دینی ضرر تو ہوتا نہیں مگر نظافت کے خلاف ضرور ہے اور اس میں ان کو کچھ عذر بھی ہے کہ وہ پڑھنے میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ دوسرے کاموں پر توجہ نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے اکثر مولویوں کا

خط بھی صاف نہیں ہوتا کیونکہ وہ مقصود میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ زوائد پر توجہ نہیں ہوتی ۔ ملا جیون کے طالب علموں کا قصہ مشہور ہے کہ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ طالب علم بڑے کاہل ہوتے ہیں ۔ ملا جی نے کہا نہیں تم غلط کہتی ہو اس کا ثبوت دو تو اس نے شوربے کے پیالہ میں ایک تنکا ڈالدیا اور کہا کہ دو طالب علموں کو اس میں شریک کر دینا ۔ چنانچہ دو طالب علموں نے کھانا شروع کیا اور جس کے سامنے وہ تنکا جاتا تھا وہ اپنے سامنے سے دوسرے کی طرف کھسکا دیتا تھا بالآخر کھانے سے فراغت ہوگئی اور تنکا پیالہ ہی میں رہا، تب ملا جی کی بیوی نے ان کو دکھایا کہ دیکھو تمہارے طالب علم ایسے کاہل ہیں کہ ایک تنکے کو نکال کر نہ پھینکا گیا سالن کھا لیا اور تنکا پیالہ ہی میں رہا ممکن ہے کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہو مگر ایسی نظیریں اب بھی موجود ہیں گو طالب علم کسی درجہ میں معذور بھی ہوں مگر مجھے یہ طریقہ پسند نہیں ۔ انسان کو اتنا اپاہج بھی نہ ہونا چاہئے بلکہ ایسا ہونا چاہیئے ؂

چو باز باش کہ صیدے کنی ولقمہ دہی طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پروبال

(باز کی مانند ہو کہ شکار کرکے خود بھی کھاؤ اور دوسرے کو بھی کھلاؤ جنگلی کوّے کی طرح بے پروبال کے طفیلی خوارہ مت ہو)

خیر یہ تو احدیوں کی حکایت پر ایک تفریح تھی آپ نے طالب علموں کے اپاہج پنا تو سن لیا اب دنیا داروں کا سنئے مگر دونوں میں اتنا فرق ہے کہ طالب علم دنیا کے کاموں میں اپاہج ہیں دین میں سست نہیں ہوتے اور دنیا کے کاموں میں اپاہج ہونا گناہ یا عذاب کا سبب نہیں اور دین دار دین کے کاموں میں اپاہج ہیں جس سے گناہ اور عذاب کو اپنے سر مول لیتے ہیں چنانچہ ان سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بہنوں سے شریعت کے موافق زبانی بیع وشراء کے الفاظ کہہ لیں یا خط ہی میں لکھ بھیجیں ۔ اور آجکل کے مناسب میں ایک نظیر بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اب آم کی فصل آوے گی اور اکثر مسلمان پھل آنے سے پہلے ان کی بیع کر دیتے ہیں شرعاً یہ بیع حرام ہے اور اس پھل کا کھانا دوسروں کو بھی حرام ہے ۔ باغ والوں کی ذرا سی کاہلی سے ساری دنیا حرام کھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے قلوب میں نور نہیں پیدا

ہوتا اور جو کچھ نماز وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے وہ اس حرام غذا کی ظلمت سے زائل ہوجاتا ہے۔ میں نے اس کی اصلاح کا ایک آسان طریقہ بتلایا تھا۔ اصل طریقہ تو وہی ہے کہ ایسے وقت میں پھل فروخت ہی نہ کیا جائے بلکہ جب اچھی طرح پھل نمودار ہوجاتے اس وقت بیع کیا جائے اس میں باغ والے یہ عذر نکالتے ہیں کہ صاحب اس وقت تک کون حفاظت کرے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے گورنمنٹ کا یہ قانون ہو جاوے کہ پھل خوب نمودار ہونے سے پہلے کوئی بیع نہ کرے تو اس وقت کوئی عذر نہ کرے گا بلکہ سب کو حفاظت کے طریقے خود بخود سوجھ جائیں گے اور اس وقت اگر کوئی کہے بھی کہ تم میرے ہاتھ پھل آنے سے پہلے باغ کی بیع کردو تو مالک کہے گا کیا تم مجھے مجرم بنانا چاہتے ہو یہاں کے مجرم بننے کا تو اتنا ڈر ہے لیکن آخرت کے مجرم بننے کو سب کے سب تیار ہوئے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ طریقہ تو لوگ کیا ہی اختیار کرتے مگر ایک آسان ترکیب بتلائی گئی تھی جس سے دنیا حرام کھانے سے محفوظ ہو جاتی مگر افسوس وہ بھی نہ ہوسکی۔ میں نے کہا تھا کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے بیع کرچکے ہوں وہ پھل آنے کے بعد دوبارہ بیع کرلیا کریں۔ بائع خریدار سے یہ کہے کہ بھائی ہم نے جو پہلے بیع کی تھی وہ شرعاً درست نہ تھی اب ہم اسی قیمت پر اس پھل کی بیع تمہارے ہاتھ دوبارہ کرتے ہیں۔ خریدار کہدے میں قبول کرتا ہوں اب اس پھل کا کھانا سب کو حلال ہوجائے گا۔ بتلایئے اس میں کیا مشکل تھی صرف زبان ہلتی تھی مگر بات یہ ہے کہ اس کی کوئی قانونی ضرورت نہ تھی قانون سے ایسی بیع جرم نہ تھی صرف خدا نے منع کیا تھا اس لئے پرواہ نہیں اور اس کے لئے ذرا سی آسان بات بھی گوارا نہیں بعبارت دیگر یوں کہیے کہ نعوذ باللہ ہم کو خدا ہی کی ضرورت نہیں۔ تو اے صاحبو! خدا تو بڑی چیز ہے ہم کو تو بیوی بچوں کی بھی ضرورت ہے۔ بیوی بچوں کے بدون تو صبر نہیں آتا خدا کو چھوڑ کر کیسے صبر آگیا ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن	صبر چوں داری ز رب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں	صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

(اے شخص تجھ کو بیوی بچوں سے صبر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے کیونکر تجھ کو صبر آگیا
اور تجھ کو ذلیل دنیا سے صبر نہیں ہے تو خدا تعالےٰ سے کیونکر صبر رکھتا ہے)
اے صاحبو! ہمارا کیسا مذاق بگڑا ہے کہ جو چیز قانوناً ضروری نہیں بس اس کی فکر ہی نہیں
تو میں کہتا ہوں گو میرے منہ سے یہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام
نے فرمایا تھا اَلْقُوْا مَا اَنْتُمْ مُلْقُوْنَ (ڈالو جو کچھ ڈالنا چاہتے ہو) اور امر مقصود نہ
تھا بلکہ جانتے تھے کہ القار تو ہو ہی گا اسی طرح میں بھی کہتا ہوں عدم مبالاۃ سے
نہیں کہتا کہ اگر آپ کو پھل آنے سے پہلے ہی بیع کرنا ہے تو خیر ایسا کرلیا کرو مگر بعد میں
پھل آنے پر تو عقد دوبارہ کرلیا کرو اور زبان ہلاکر ایجاب و قبول کا اعادہ کرلیا
کرو مگر مجھے اس کی بھی امید نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی وقعت ہی دل
میں بسی ہوئی نہیں اور دل میں بسی ہوئی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ایمان نہیں ہے۔
ایمان تو ہے مگر دل پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ پردے اٹھ جائیں تو ہر حکم کی وقعت
ہونے لگے۔ اس لئے سب سے پہلے اُن پردوں کو اٹھانا چاہیئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ
اپنا دستور العمل یہ رکھئے کہ اول تو بقدر ضرورت احکام کا علم حاصل کیجئے جس کی آسان
صورت یہ ہے کہ جو دینی رسائل محققین کی تصنیف سے ہیں ان کو مطالعہ میں رکھئے
مگر ہر زید و عمر کی تصنیف کا مطالعہ نہ کیجئے کیونکہ آجکل آزادی کا زمانہ ہے ہر شخص کا
جو جی چاہتا ہے لکھ مارتا ہے آجکل ایسے ایسے مصنف بھی ہیں کہ میں نے ایک رسالہ میں
یہ مضمون لکھا ہوا دیکھا کہ ربوا حرام نہیں ہے مسلمانوں کو سود کے ذریعہ سے ترقی حاصل
کرنا چاہیئے اور قرآن میں جو آیا ہے وحرم الربوا (ربوٰ حرام ہے) تو وہ رُبا (بضم راء)
ربودن سے ہے مطلب یہ ہے کہ خدا نے غصب کو حرام کیا ہے اور راء کو جو کسرہ پڑھا جاتا
ہے یہ اعراب بعد میں مولویوں نے لگائے ہیں جو حجت نہیں ہیں۔ اس احمق نے یہ بھی نہ
دیکھا کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور ربودن فارسی مصدر ہے اس سے کوئی لفظ
مشتق ہو کر قرآن میں کیونکر آسکتا ہے۔ پھر یہ لفظ رُبا مفرداً بو فارسی میں بھی مہمل ہے
کسی نے اس کو استعمال نہیں کیا۔ تو صاحبو آجکل یہ بھی تحقیقات ہیں۔ بس میں تو ایسے

مجددوں کی نسبت یہ شعر پڑھا کرتا ہوں ؎

گربہ میر و سگ وزیر موش را دیواں کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی امیر کتا وزیر چوہے کو دیوان جی بنا دیں یہ اراکین سلطنت ملک کو برباد ہی کر دیں گے)

اگر یہی تحقیقات ہیں اور ایسے ہی محقق ہیں اور یوں ہی اسلام کے پرتوڑے جائیں گے تو پھر اسلام کی خیر نہیں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر کتاب کے دیکھنے میں کیا حرج ہے اگر ہم اپنے مسلک پر جمے رہیں تو کسی کی کتاب کے دیکھنے کا کیا مضائقہ ہے۔ سو بات یہ ہے کہ میں ہر شخص کی تصنیف کا مطالعہ سے نہ روکتا اگر اس کا برا اثر نہ دیکھتا مگر جب میں لوگوں کو متاثر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں تو منع کرتا ہوں بس آپ کی خیر اسی میں ہے کہ صرف محققین کے رسالے دیکھئے اور نئے نئے خودرو مصنفوں کے رسالے ہرگز نہ دیکھئے اور میں عنقریب محققین کو بھی بتلا دوں گا کہ وہ کون لوگ ہیں غرض جو پڑھے لکھے ہیں وہ تو یہ رسائل دیکھیں اور پورا نصاب دیکھیں ایک دو رسالہ کا مطالعہ کافی نہیں اور وہ نصاب بھی کوئی محقق ہی بتلا دے گا اور اثنا مطالعہ میں جہاں شبہ رہے اس پر وہاں نشان بناتے رہیں اور بعد میں ان مشتبہ مقامات کو کسی محقق سے زبانی حل کرلیں اور جو اَن پڑھ ہیں وہ ان رسالوں کو سن لیا کریں اگر تم کو طلب ہوگی تو ان شاء اللہ کوئی سنانے والا بھی مل جائے گا۔ ایک تو اس کا التزام کرلیں دوسری بات یہ کرو کہ جو کام کرنا ہو خواہ نوکری یا ملازمت یا تجارت یا شادی یا غمی سب کے متعلق پہلے کسی محقق سے حکم شرعی دریافت کرلو اگرچہ عمل کی بھی توفیق نہ ہو دریافت کرلینے میں کم از کم یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے جائز ناجائز ہونے کا تو علم ہوجائے گا ممکن ہے کہ یہ علم کسی وقت اس سے بچنے کی ہمت پیدا کر دے اور جو مبتلا ہی رہے تو حرام کو حلال سمجھ کر تو نہ کروگے اب آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی واسطہ نہ پڑے یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہوسکے چنانچہ رامپور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے میں نے کہا کہ آپ امتحان کے لئے پوچھتے ہیں یا عمل کے لئے۔ اگر عمل کے لئے پوچھتے ہیں تو

اس کے لئے مسؤل سے اعتقاد کا ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے ہو گئے اور محض نام سننا کافی نہیں نام تو نہ معلوم کتنوں کا سنا ہوگا اور جو امتحان کے لئے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے بس وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کے سوال کا اُس کی مرضی کے موافق جواب دیا کروں جہاں میں دیکھتا ہوں کہ سوال سے مقصود عمل نہیں وہاں کبھی جواب نہیں دیتا غرض آجکل لوگ اس قسم کے مسائل دریافت کرتے ہیں حالانکہ اس طرح کام نہیں چل سکتا ہر کام قاعدے سے ہوا کرتا ہے۔ پس سب سے پہلے کسی شخص کی حالت کو جانچ لو خوب امتحان کر لو جب اس کے علم و عمل پر کافی اطمینان ہو جائے اب اُس سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو اور فضول باتیں نہ پوچھو یہ یاد رکھو کہ بدوں اچھی طرح جانچے ہوئے کسی کو اپنا بڑا نہ بناؤ کیونکہ دین بڑی قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے ہر کس و ناکس کو رہنما نہ بناؤ لیکن جب کسی کا محقق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس سے حجت نہ کرو جو بتلادے تو اس پر عمل کرو اور ایک اس کا التزام کرو کہ جب کبھی فرصت و مہلت ہوا کرے تو ایسے بزرگوں سے ملتے رہا کرو اور ان سے ڈرو نہیں کہ ہمارے افعال پر لتاڑیں گے۔ ہرگز نہیں وہ تمہارے سامنے منہ توڑ کر کوئی بات نہ کہیں گے (مگر ہاتھ جوڑ کر بھی نہ کہیں گے ۱۲) ایسے بزرگوں کی برکت صحبت سے تمہاری حالت ان شاء اللہ تعالیٰ خود بخود درست ہوتی چلی جائے گی یہ ہے وہ دستور العمل جو دل پر سے پردے اٹھاتا ہے جس کے چند اجزاء ہیں ایک تو کتابیں دیکھنا یا سننا۔ دوسرے مسائل دریافت کرتے رہنا تیسرے اہل اللہ کے پاس آنا جانا اور اگر ان کی خدمت میں آمد و رفت نہ ہو سکے تو بجائے ان کی صحبت کے ایسے بزرگوں کی حکایات و ملفوظات ہی کا مطالعہ کرو یا سُن لیا کرو اور اگر کچھ تھوڑی دیر ذکر اللہ بھی کر لیا کرو تو یہ تو اصلاح قلب میں بہت ہی معین ہے اور اسی ذکر کے وقت میں سے کچھ وقت محاسبہ کے لئے نکال لو جس میں اپنے نفس سے اس طرح باتیں کرو کہ اے نفس ایک دن دنیا سے جانا ہے موت بھی آنے والی ہے اس وقت یہ سب مال و دولت یہیں رہجاویگا بیوی بچے سب تجھے چھوڑ دیں گے اور خدا تعالیٰ سے واسطہ پڑے گا اگر تیرے پاس نیک اعمال

زیادہ ہوئے تو بخشا جائے گا اور گناہ زیادہ ہوئے تو جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا جو برداشت کے قابل نہیں ہے اس لئے تو اپنے انجام کو سوچ اور آخرت کے لئے کچھ سامان کر یہ عمر بڑی قیمتی دولت ہے اس کو فضول رائگاں مت برباد کر مرنے کے بعد تو اس کی تمنا کرے گا کہ کاش میں کچھ نیک عمل کر لوں جس سے مغفرت ہو جائے مگر اس وقت تجھے یہ حسرت مفید نہ ہوگی پس زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس وقت اپنی مغفرت کا سامان کر لے۔ اگر ذکر بھی نہ ہو سکے تو دستور العمل سابق کے ساتھ یہ محاسبہ تو روزانہ ضرور کر لیا کرو۔ نہ میں آپ سے نوکری چھوڑاتا ہوں نہ بیوی بچوں کو چھوڑاتا ہوں آپ دنیا کے سارے دہندے کیجئے اور گناہ در گناہ رہئے مگر یہ کام بھی ساتھ ساتھ کئے جایئے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ ہوگا کہ یہ عمل آپ کی دنیا اور دین دونوں کو سنوار دے گا۔ دنیا کو تو اس طرح کہ دنیا سے جو مقصود ہے یعنی راحت قلب بخدائے لایزال وہ بڑھ جاوے گی اس وقت تو آپ کی یہ حالت ہے کہ آپ روٹی کو نہیں کھاتے بلکہ روٹی آپ کو کھاتی ہے۔ دنیا کی حالت یہ ہے کہ یہ کسی کے پاس سے جاتی ہے تب بھی پریشانی کرتی ہے اور آتی ہے تب بھی پریشان کرتی ہے۔ اگر روپیہ پاس نہیں تب تو فکر ظاہر ہے کہ ہر وقت اسی کی ادھیڑ بن رہتی ہے آج کہاں سے کھاؤں گا، کہاں سے پہنوں گا۔ اور جو روپیہ پاس ہے تو اس کی حفاظت کی فکر ہے کہ اسے کہاں رکھوں کہاں دابوں کہیں چور نہ لے جائیں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ بعض دفعہ اس پریشانی میں بہت لوگوں کو نیند نہیں آتی۔ سچ کہا ہے ؎

وَمَنْ يَحْمَدِ الدُّنْيَا لِعَيْشٍ يَسُرُّهٗ　　فَسَوْفَ لَعَمْرِيْ عَنْ قَلِيْلٍ يَلُوْمُهَا
إِذَا أَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً　　وَإِنْ أَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

(جو شخص تھوڑے سے عیش کی وجہ سے دنیا کی تعریف کرتا ہے مجھے قسم ہے اپنی جان کی کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ملامت کرے گا جب دنیا پیٹھ پھیرتی ہے تو آدمی کو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت غموں کو لاتی ہے)

یعنی جب دنیا نہ ہو تو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غموں کو ساتھ لاتی ہے

تو اس وقت دنیا آپ کے لئے باعثِ راحت نہیں بلکہ آلۂ تعذیب ہے جیسا کہ ارشاد ہے ۔ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (تم کو ان کے اموال و اولاد تعجب میں نہ ڈالے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں ان کو عذاب دیں) واقعی دنیا داروں کے لئے دنیا کا جمع ہونا عذاب ہی ہے ان کو تو چین کی نیند بھی میسر نہیں ہوتی ۔ صاحبو! خدا کی طرف متوجہ ہو کر دیکھو اس وقت یہ دنیا آپ کے لئے راحت کا ذریعہ ہوگی ۔ اب آپ کو قورمہ میں وہ مزہ نہیں آتا جو اس وقت خالی چٹنی میں آئے گا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر آپ کسی پر عاشق ہو جاویں اور وہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز کھانے کو دے جو آپ کو مرغوب نہیں تو ذرا سوچ کر بتلایئے کہ آپ کو اس میں لذت آئے گی یا نہیں یقیناً اس وقت وہ نا مرغوب چیز آپ کو تمام مرغوبات سے زیادہ لذیذ معلوم ہوگی کیوں اس لئے کہ وہ محبوب کے ہاتھ سے ملی ہے ۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ اس وقت جو آپ قورمہ کھاتے ہیں اس میں اس لئے مزا نہیں آتا کہ آپ کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے اور اگر اعتقاداً علم بھی ہے تو خدا کی ساتھ آپ کو پوری محبت نہیں ہے اس لئے پورا مزا نہیں آتا اور اس دستور العمل پر عمل کر کے آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی اس وقت آپ ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھیں گے اور یوں کہیں گے

مصرع :۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ دوست کی جانب آئے وہ بہتر ہی ہے)

اس وقت اس انتساب سے اس میں وہ لذت ہوگی جس کے سامنے تمام لذتیں گرد ہوں گی پھر آپ کو ہر حالت میں راحت ہوگی کبھی بے چینی نہ ہوگی ۔ اور یہی بات تو ہے جس کو ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کے جواب میں کہا تھا ؎

پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقۂ پشمین ما

(تیرا لباس ریشم و اطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمین بخیہ زدہ ہے)

اسی طرح بہت سی چیزیں دل میں موازنہ کر کے اخیر میں کہتے ہیں ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید یا ایں ما

(ذرا صبر کرو قیامت میں معلوم ہو جائیگا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا یہ ہماری محنت)

یعنی اس وقت تو تو ہر چیز میں خوش حال ہے اور ہم خستہ حال ہیں مگر ٹھہرا رہ ابھی قیامت
آنے والی ہے اُس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ بادشاہ کون ہے اور مفلس کون ہے صاحب خدا کے
تعلق سے قلب میں ایسی راحت اور چین ہوتی ہے جس سے انسان فقر میں بھی بادشاہ ہوتا
ہے۔ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کو ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ
کی خانقاہ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں تو آپ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد (چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو)

اس زمانہ میں چتر شاہی سیاہ ہوا کرتا تھا اس لئے فرماتے ہیں ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد   در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب   من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو مجھے
جب سے نیم شب کی سلطنت حاصل ہوئی ہے میری نظر ملک نیمروز کی سلطنت
ایک جو کی برابر نہیں ہے)

فرماتے ہیں کہ جب سے مجھ کو ملک نیم شب کی خبر ملی ہے یعنی جب سے آدھی رات کی مناجات
و عبادات میں لذت حاصل ہوئی ہے اس وقت سے مجھے ملک نیم روز کی جو برابر بھی قدر نہیں ہے
تو صاحبو! یہ حلاوت ہوتی ہے خدا کے تعلق میں اور یہ لذت ہوتی ہے اس انتساب میں
جو دنیا بھر سے مستغنی کر دیتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس دستور العمل سے آپ کی
دنیا بھی باحلاوت ہو جائے گی اور کھانے پینے میں بھی وہ لذت آئے گی جو اس وقت
خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ اس وقت آپ کو تنبیہ ہوگا اور خدا کی ناراضی کسی طرح گوارا نہ ہوگی
اور سب گناہ ایک ایک کر کے چھوٹ جائیں گے تو دین بھی درست ہو جاوے گا اور اس
وقت آپ ہمارے پیچھے پیچھے پھریں گے اب ایک بات قابل بیان رہی وہ یہ کہ اس
دستور العمل کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ محققین کے رسائل دیکھو اور محققین سے مسائل پوچھو
اور اُن کے پاس آمد و رفت رکھو اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ محققین کون لوگ ہیں
یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ

علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اس کو بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہٰذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنونِ دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے کوئی کچھ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے وہاں آپ ایک حکیم کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر ترجیح کیوں دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔ لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں جو ایک گہری بات ہے وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں

جان اور ایمان کے۔ جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت وحفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے اس سے گھبرانا نہ چاہیئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیرخواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کرلیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔

تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلادوں گا کہ اُن میں سے خطا کن کی ہے، مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہوجانا چاہیئے نااتفاقی بُری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہوجاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعوے پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں کو سزا کردیا کرے کیونکہ دعوے اور انکار سے دونوں میں نااتفاقی کا ہونا ثابت ہوگیا اور نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے تو مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مجرم ہوئے اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچادیں گے کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنادیا گیا اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیئے تھا تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ میں جو باہم مخالفت و

نا اتفاقی ہے تو ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوتا اور اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلہ سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو اور جو نا اتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جا سکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔ پس علماء کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کر لو غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیے کہ حق پر کون ہے ناحق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائیے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کر لینے پر مجبور کیجئے ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق پر مجبور کرنے کے تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں۔ اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے، تو جناب ایسا اختلاف تو اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا اختلاف ہے۔ مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت و طعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کو آج یہ پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی روپیہ ہو اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہ مقرر کر دیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے کوئی فاتحہ پر کوئی تیجہ دسویں پر ایک عالم سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم تو مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو اُن سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے

کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں خواہ وہ کسی خیال کے ہوں، چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں" تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے۔ میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و مولود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ دیا نہ جائے اُن سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ مٹھائی کا دُہرا حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آکر ایک فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک ہی کافی ہے میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہوہی گا صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کردو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ سب فضول قصہ ہے یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون بہت زور کا ہوا تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا اور فاتحہ دلوانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہوگیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ کہاں گئے اور اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوئے۔ کہنے لگے اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی۔ میں نے کہا بھلا اس عدیم الفرصتی میں کسی نے جنازہ کی نماز بھی چھوڑی اور کفن دفن بھی چھوڑا کہا نہیں۔ میں نے کہا بس سمجھ لو جو کام حذف ہوگئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے یہ کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہوگئے۔ اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردوں کو پہونچ جاتا ہے، میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہوسکتا ہے پھر کبھی اللہ نام کے روپئے پیسے اور کپڑے پر بھی فاتحہ پڑھی کہنے لگے

کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا سورتوں کا بھی ثواب پہنچ جاتا کہنے لگے۔ اجی بس سمجھ میں آگیا تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بندکردی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہنے لگیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں میں نے سنت وبدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کردی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو باسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگرچہ بحمد اللہ سنت وبدعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلادیں گے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہوسکتا بلکہ پہلے آپ حق کو متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو جائے گی جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو لکھے پڑھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہوکر انصاف کے ساتھ دیکھیں پہلے سے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے خالی الذہن ہوکر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے خدا کے ساتھ معاملہ ہے اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق پر ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو مگر دوسرے کو بھی برا نہ کہو کیونکہ کسی کو برا بھلا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائیگا۔ بس تم اپنی یہ حالت رکھو ؎

ہمہ شہر پرز خوبان منم وخیال ماہے　　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر محبوبوں سے بھرا ہوا میں ہوں اور خیال ایک محبوب کا ہے کیا کروں کہ چشم بدخو کسی کیطرف دیکھتی ہی نہیں ہے)

دیکھو اگر کوئی شخص کسی حسین پر عاشق ہو جائے تو وہ دوسرے حسینوں کو گالیاں بھی نہیں دیا کرتا بس یہ کہتا ہے کہ کوئی اور بھی حسین ہو مگر میں تو اپنے محبوب ہی کا عاشق ہوں اور یہ حال ہونا چاہیئے ؎

دل آرامیکہ داری دل دروبند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام (محبوب سے) تمہارا دل گرفتار ہے تو پھر تمام عالم سے آنکھ بند کرلو)

اگر کوئی بُرا بھی ہو تو تم اس کو بُرا نہ کہو وہ اگر بُرا ہے تو تم کو کیا اور اگر دوسرا تم کو بُرا کہے جب بھی تم اُسے کچھ نہ کہو ذوق نے خوب کہا ہے ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا لے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے

اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے پھر بُرا کہنے سے کیوں اُس کے برا مانتا ہے

کان پور میں ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید کو بُرا کہنا جائز ہے کہ نہیں میں نے کہا جائز ہے اگر یہ اطمینان ہو کہ تم اس سے اچھی حالت میں مروگے اور ظاہر ہے کہ مرنے سے پہلے یہ اطمینان ہو ہی نہیں سکتا پس اپنا انجام دیکھنے سے پہلے اس کو بُرا نہ کہنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یزید ہی ہم پر ملامت کرے کہ تم مجھے کس منہ سے بُرا کہتے تھے ذرا اپنی حالت تو دیکھو اور ظاہر ہے کہ زندگی میں خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ اب تو یہ حالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکئ ما گہ خندہ زند دیو زناپاکئ ما

ایمان چو سلامت بلب گور بریم احسنت بریں چستئ و چالاکئ ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے۔ ایمان جب گور کے کنارے پر سلامت لیجائیں تو ہماری چستی و چالاکی پر آفریں ہے)

جب یہ حالت ہے تو کیوں کسی کو بُرا کہے۔ کیا تبرا کرنے سے کچھ ثواب ملتا ہے میاں اپنی خیر مناؤ کسی سے تم کو کیا لینا اور یاد رکھو کہ کسی کو بُرا بھلا وہی کہے گا جسے کوئی کام نہ ہو اور جو کام میں لگا ہوتا ہے اس کو اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ایک حکیم نے کسی درویش کو ایک آدمی سے لڑتے ہوئے دیکھا اور فیصلہ کیا ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو | جو بگذشت بر عارف جنگ جو
گر ایں مدعی دوست بشناختے | بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ عارف جنگ جو پر گذرے
اگر اسی مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

حکیم نے کہا کہ اگر اس درویش کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی تو اسے لڑنے کی فرصت کہاں ہوتی۔ دیکھو اگر ہم اپنے کسی مجازی محبوب کو دیکھ لیں تو اس وقت اس کی صورت دیکھیں گے اور خدمت میں مشغول ہوں گے یا لوگوں سے کشتم کشتا ہوں گے۔ غرض محقق کا پتہ لگانے کے بعد اتباع تو اسی کا کرو مگر بُرا بھلا دوسروں کو بھی نہ کہو یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت اُن کی فرصت کا ہو (دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا) اس میں اُن کے پاس بیٹھیں اور اُن کی باتیں سنیں اور دیکھیں کہ جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو، عبادتِ الٰہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اس کو اختیار کر لیں اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں (اور یہ طریقہ پڑھے لکھے کو بھی بہت مفید ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی جیسی پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے ۱۲) ان کی صحبت سے آپ کو اموال و اولاد کے حقوق معلوم ہوں گے اس وقت آپ کو بھی میت کے مال میں بدون ورثہ کی اجازت کے تصرف کرنا گوارا نہ ہوگا اور ان بزرگ کی حکایت پر تعجب نہ ہوگا جنہوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کر کے بازار سے ایک پیسہ کا تیل منگایا تھا بلکہ آپ خود بھی ایسی ہی احتیاط کیا کریں گے اور پھر آپ کو آم وغیرہ کی بیع میں

بھی اس طریقہ کی ضرورت معلوم ہو گی۔ جو میں نے بیان کیا ہے غرض ہماری حالت کی خرابی کا زیادہ تر سبب یہ حُبِ مال ہی ہے جس سے دلوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں بزرگوں کی صحبت سے ان شاء اللہ یہ پردے اُٹھ جائیں گے۔ صاحبو ایک تو ہمارا مرض حبّ مال ہے جس سے ہمارے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور حبّ مال ہی سے بعض لوگ دوسروں کی آبرو کے درپے ہوتے ہیں اور حبّ مال ہی کی وجہ سے انسان رشوت لیتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں خدا کی محبت پیدا نہیں ہوتی اور دوسرا مرض حبّ اولاد ہے یہ بھی بہت سے گناہوں کا سبب ہے کہیں اولاد کی صحت و تندرستی کے لئے ٹوٹنے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں جو شرک میں داخل ہیں۔ کہیں اولاد ہونے کے لئے قبروں پر نذرانے چڑھائے جاتے ہیں، غیر اللہ کی منت مانی جاتی ہے اور اولاد ہی کے لئے مال کا ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ جائدادیں خریدی جاتی ہیں پھر اس میں حلال و حرام کی بھی تمیز نہیں کی جاتی۔ کبھی مال بڑھانے کے لئے سود لیا جاتا ہے، کبھی کسی کا حق بلا وجہ دبا لیا جاتا ہے جس سے مقدمہ بازی کی نوبت آتی ہے۔ غرض یہ امراض ہمارے اندر پھیلے ہوئے ہیں جن کا منشا ان دو چیزوں کی محبت ہے۔ مال کی اور اولاد کی۔ اسی کو حق تعالےٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ کہ تمہارے اموال و اولاد محض فتنہ ہیں اس میں فتنہ کا لفظ ایسا عجیب ہے جس سے نفع کی طرف بھی اشارہ ہے اور ضرر کی طرف بھی۔ کیونکہ فتنہ کا لفظ محاورات میں ضرر کے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور شریعت میں بھی ایسے مواقع پر اس کا استعمال موجود ہے۔ چنانچہ احادیث میں اَبْوَابُ الْفِتَنِ کے نام سے ایک باب منعقد کیا گیا ہے جس میں آخر زمانہ کے فتنوں کا بیان ہے اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے ایسے فتنے ہوں گے اور ظہور الفتن علامت قرب ساعت کی ہے۔ ان احادیث میں فتنہ سے پریشان کن واقعات اور بُرے حالات ہی مراد ہیں ۱۲) اس معنے کے اعتبار سے تو اموال و اولاد کو فتنہ کہنا اُن کے مضرت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو مضرت میں مبتلا کرنے

والے ہیں اور لغت کے اعتبار سے فتنہ کے معنے آزمائش اور امتحان کے ہیں جس کا نتیجہ کبھی نفع بھی ہوتا ہے اس لحاظ سے اموال و اولاد کی منفعت کی طرف بھی اشارہ ہو گا کہ یہ چیزیں تم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے دی ہیں تاکہ تمہارا امتحان ہو کہ مال کو طاعات میں خرچ کرتے ہو اور اس صورت میں نافع ہو یا معاصی میں اور اس صورت میں مضر ہو اور ان کے حاصل کرنے میں حلال و حرام کی پرواکرتے ہو یا نہیں۔ اسی طرح اولاد کی پرورش و تربیت میں حدود شرعیہ کا لحاظ کرتے ہو یا نہیں اور ان کی وجہ سے احکام الٰہیہ میں کوتاہی نہیں کرتے چنانچہ مال فی نفسہ بری چیز نہیں بلکہ اس میں بعض فوائد بھی ہیں مثلاً اگر مال اپنے پاس ہو تو اس سے فراغ قلب حاصل ہوتا ہے۔ قلب مطمئن رہتا ہے اور اس صورت میں طاعات بھی اطمینان و فراغ کی ساتھ ادا ہوتی ہیں اور مال نہ ہو تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد بامداد فرزندم

کہ رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو یہ خیالات اور وسوسے دل میں آتے ہیں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ کیونکر ہو گا۔ ایک ایرانی نے اس شعر کی شرح یہ کی کہ شب جو عقد نماز بر بندم بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم کہ رات کو نماز کی نیت میں اس طرح باندھتا ہوں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے گویا یہ الفاظ بجائے نیت و تحریمہ کے کہے جاتے ہیں واقعی اہل زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں مطلب تو اچھا بیان کیا۔ غرض خواہ یہی نیت کے قائم مقام ہو یا نیت کے بعد یہ خیال آوے تنگی اور پریشانی میں عبادات بھی اچھی طرح ادا نہیں ہوتیں تو مال کا یہ بڑا نفع ہے کہ اس سے فراغ حاصل ہوتا ہے۔ نیز مال ہو تو دوسروں کی مدد بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً اس وقت ترکوں کے معاملہ میں مالدار ہی زیادہ مدد کر سکتے ہیں یہ تو فوائد ہیں اور مضرتیں وہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس لئے مال امتحان کی چیز ہے کہ اس کو حاصل کر کے احکام شرعیہ پر قائم رہنا بڑے مرد کا کام ہے اور اگر ذرا ہمت سے کام لیا جائے تو کچھ زیادہ دشواری نہیں پس مال میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ آمد قاعدہ کے موافق ہو دوسرے خرچ قاعدہ کے موافق ہو بعض لوگ آمد میں تو احتیاط کا خیال رکھتے ہیں مگر خرچ میں

اس کی رعایت نہیں کرتے بس یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا مال ہے جس طرح چاہیں خرچ کریں حالانکہ تم تو خود بھی اپنے نہیں ہو بلکہ خدا کے ہو پھر مال تمہارا کدھر سے ہوا بلکہ تم محض امین ہو اور مال تمہارے ہاتھ میں امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا جرم ہے لہذا مال میں تم خلاف مرضیٔ حق کسی تصرف کے مجاز نہیں ہو بس چونکہ مال میں مضرت کی ساتھ نفع بھی ہے اس لئے اسکو فتنہ فرمایا یعنی آزمائش کی چیز۔ اسی طرح اولاد میں منافع بھی ہیں مضار بھی مضرتوں کا بیان تو اوپر ہوچکا اور منافع یہ ہیں کہ اولاد کے نیک اعمال سے والدین کو نفع ہوتا ہے اور وہ مرنے کے بعد دعا یا ایصال ثواب سے والدین کو یاد رکھیں تو ان کے درجات بلند ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی فی نفسہٖ بری چیز نہیں بلکہ امتحان کی چیز ہے اگر آدمی اس امتحان میں کامیاب ہو تو مالدار ہوتا اور صاحب اولاد ہوتا کمال ہے نقص نہیں۔ ایک صاحب نے یہاں فتنہ کے مشہور معنے سمجھ کر اعتراض کیا کہ حق تعالیٰ نے اولاد کو فتنہ فرمایا ہے اور احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دی ہے جو اولاد کے لئے موضوع ہے اور خود ازواج کا نافع ہونا بھی اس سے ثابت ہوتا ہے تو ان دونوں میں اجتماع کیسے ہوگا اور اس سے انہوں نے نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نکاح ہی نہ کرے۔ میں نے کہا جناب آپ کو نکاح تو یاد رہا مال یاد نہ رہا اس پر بھی تو یہی اشکال ہے کہ حق تعالیٰ نے اموال کو فتنہ فرمایا ہے اور حدیث میں کسب مال کی ترغیب ہے بلکہ امر ہے چنانچہ ارشاد ہے کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ (حلال مال کمانا فرض ہے بعد اور فرائض کے) تو مال کے نہ کمانے کا بھی نتیجہ نکالنا چاہیئے اور نوکری چھوڑ دینا چاہیئے (اور یہ شخص نوکر تھے مگر پہلی بیوی کے مرنے پر دوسرا نکاح نہ کرتے تھے) پھر میں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جو اموال و اولاد کو فتنہ فرمایا ہے تو اس میں ان کی مذمت نہیں کی بلکہ ان کو امتحان کی چیز فرمایا ہے اور اگر مذمت ہی تسلیم کی جائے تو علی الاطلاق نہیں بلکہ بعض افراد کے اعتبار سے ہے کیونکہ اسی جگہ اوپر کی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ (تمہارے بعض ازواج اور اولاد تمہارے دشمن ہیں) جس میں مِنْ تبعیضیہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب افراد ضرر رساں نہیں بلکہ بعض ان میں سے معین اور مفید بھی ہیں۔ پس ترغیب نکاح انہی افراد کے لحاظ سے ہے (اسی لئے جس شخص کو نکاح سے ابتلاء بالمعاصی

(گناہوں میں مبتلا ہونے کا) اندیشہ ہو اس کے لئے نکاح مسنون نہیں کما صرّح بہ الفقہاءُ (جیساکہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے) بہر حال مجرد ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں اور مفلس ہونا بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔ کمال تو یہی ہے کہ سب کچھ ہو مال بھی اولاد بھی بیوی اسباب بھی اور پھر احکامِ الٰہیہ کی مخالفت نہ ہو دیکھو سب انبیاء علیہم السلام صاحب ازواج تھے بجز عیسیٰ علیہ السلام کے (اور وہ بھی اخیر میں نکاح کریں گے ۱۲) اسی طرح انبیاء علیہم السلام مفلس نہ ہوتے تھے ہاں زاہد ہوتے تھے کہ حق تعالےٰ نے ان کو دیا سب کچھ مگر جمع نہیں کیا بلکہ حاجتمند لوگوں کو بانٹ دیا کرتے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے اور اگر کسی کو اس کی ہمت ہو تو یہ بہت بڑا کمال ہے مگر میں آجکل مسلمانوں کو خالی ہاتھ رہنے کی رائے نہیں دیتا بلکہ وہ رائے دیتا ہوں جو حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ والوں کو دی تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل اگر کسی کے پاس کچھ دینار ہوں تو ان کی قدر کرے۔ کیونکہ پہلے تو ایسا زمانہ تھا کہ روپیہ پاس ہونے سے دین پر اندیشہ ہوتا تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ روپیہ پاس نہ ہونے سے دین پر اندیشہ ہے اور روپیہ پاس ہو تو دین کی حفاظت رہتی ہے۔ جب حضرت سفیان ثوریؒ کے زمانہ میں یہ حالت ہو چلی تھی تو اب تو اس کی زیادہ ضرورت ہے، اس لئے ہمارے حضرات اپنے متعلقین کو ترک اسباب کی رائے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں ایک خانصاحب کسی جائداد کے مقدمہ میں دعا کرانے آیا کرتے تھے ایک بار آئے اور عرض کیا حضرت اب تو فلاں بنئے نے میری زمین دبا ہی لی حضرت نے فرمایا بھائی جانے دو اور اللہ پر نظر کر کے صبر کرو خدا کچھ اور سامان کر دے گا۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ صاحب نے اپنے حجرہ میں سن لیا اور باہر نکل آئے اور خانصاحب سے فرمایا ہرگز صبر نہ کرنا جاؤ مقدمہ کرو عدالت میں دعویٰ کرو ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ سبحان اللہ آپ اپنی طرح ساری مخلوق سے صبر کرانا چاہتے ہیں چاہے کسی کو ہمت ہو یا نہ ہو۔ آپ کے تو بیوی ہے نہ بچہ ہے۔ اکیلے تھے صبر کر کے بیٹھ گئے۔ اس غریب کے پیچھے بیوی بچے لگے ہوئے ہیں وہ ان کے فقر و فاقہ پر کیسے صبر کرے گا۔ انجام یہ ہوگا کہ پریشان ہوگا اور توکل کی ہمت نہیں ہے

تو کسی کسی کے مال پر نظر دوڑائے گا۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولوی ترک دنیا نہیں
کراتے بلکہ ترکِ بغاوت کراتے ہیں۔ صاحبو! دنیا کماؤ مگر خدا کے حکم کے موافق کماؤ بغاوت
کے ساتھ نہ کماؤ آخر دنیا کمانے میں حکام دنیا کے قوانین کی بھی تو تم رعایت کرتے ہو اور گورنمنٹ
کی بغاوت سے بچتے ہو اسی طرح خدا کی بغاوت سے بھی بچتے رہو اور اگر پابندی احکام شرعیہ
ترقی دنیا کے لئے مانع ہے تو پابندی احکام گورنمنٹ اس سے کیوں مانع نہیں دیکھئے بغاوت
میں تو بہت ترقی ہوتی ہے کہ بدون کچھ کمال حاصل کئے سہولت سے روپیہ مل جاتا ہے چوری
اور ڈاکہ زنی کر کے دولت خوب حاصل ہوتی ہے اور نوکری میں اول تو کمال کی ضرورت ہے
پھر نوکری ملتی مشکل سے ہے اور ملے بھی تو تنخواہ سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تحصیلدار اور
ڈپٹی کو گھوڑا اور سائیس رکھنا بھی ضروری ہے ذرا لباس بھی اچھا رکھنا ہوتا ہے آنے
جانے والوں کی دعوت ضیافت بھی کرنا ہوتی ہے اس لئے میں تو چندوں کے موقعہ پر کہا
کرتا ہوں کہ ان امراء کو مت ستاؤ جیسے ان کی آمدنی زیادہ ہے ویسے ہی ان کا خرچ
بھی بہت زیادہ ہے۔ غرض بظاہر ترقی کا سب سے اچھا ذریعہ ڈکیتی اور چوری ہے جسکو
گورنمنٹ نے جرم قرار دیا ہے۔ لیکن گورنمنٹ سے کوئی نہیں کہتا کہ آپ نے ترقی کے
ذرائع بند کر دیئے ہیں۔ اللہ میاں ہی مفت کے مل گئے ہیں کہ وہ کسی بات کو جرم قرار
دیں تو کہا جاتا ہے کہ شریعت نے ترقی کا راستہ بند کر دیا کہ سود بھی حرام رشوت
بھی حرام، فصل سے پہلے آموں کی بیع بھی حرام میں کہتا ہوں ذرا گورنمنٹ سے
بھی تو پوچھو کہ آپ نے ڈکیتی کو بھی ممنوع، چوری اور رشوت کو بھی ممنوع کر دیا
اور ترقی کا ذریعہ کیا نکالا نوکری اور تجارت، سو تجارت کے لئے تو سب کے پاس
روپیہ نہیں ہے اور نوکری میں خرچ زیادہ ہے۔ سب سے آسان ذریعہ ترقی کا چوری
اور ڈکیتی اور رشوت تھی انہیں کو آپ نے منع کر دیا کیا کسی کو ہمت ہے کہ گورنمنٹ
سے یہ سوال کرے ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو سب یہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ذرائع
ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے روکا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح
شرع نے بھی ذرائع ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے منع کیا اور ترک بغاوت

کی تعلیم کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کر کے دنیا نہ کماؤ خواہ ایک ہی جزو میں نافرمانی ہو پس شریعت کے تابع ہو کر رہو پھر چاہے رئیس ہو جاؤ یا نواب یا ہفت اقلیم کے بادشاہ بن جاؤ ترقی مبارک ہے اور اس سے کوئی نہیں روکتا اور اگر دین کھو کر دنیا کمائی تو میں یوں کہوں گا ؂

مبادا دلِ آں فرومایہ شاد　　　　کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(اس کمینہ کا دل کبھی خوش نہ ہو جو دنیا کے پیچھے دین برباد کر دے)

تو یہ ہے فتنہ کہنے کی وجہ کہ مال و اولاد میں نفع بھی ہے اور ضرر بھی ہے اور ان سے ہماری آزمائش کی گئی ہے اگر امتحان میں کامیاب ہو گئے تو یہ دونوں مفید ہیں اور اگر ناکام ہو گئے تو دونوں مضر ہیں آگے ارشاد فرماتے ہیں وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (اور اللہ ہی اجر عظیم ہے) اوپر یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اموال و اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے احکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے اب فرماتے ہیں کہ جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھیگا تو اللہ کے پاس اُن کے لئے بڑا اجر ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم کو عمل میں کچھ کوتاہی معلوم ہو یا عمل کچھ کم ہوتا نظر آوے تو گھبراؤ نہیں اور یہ مت سمجھو کہ اس عمل قلیل سے کیا فائدہ کیونکہ خدا تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے وہ تھوڑے سے عمل پر بہت اجرت دے سکتے ہیں اس لئے خدا کی ذرا سی اطاعت کو بھی حقیر نہ سمجھو اللہ اکبر کیسی بشارت اور کتنا بڑا وعدہ ہے۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں تو میں لے آئیں تو کئی پڑھی تھیں اور بیان سب کا نہیں ہو سکا بلکہ صرف ایک آیت کا بیان ہوا ہے مگر اصولاً بحمد اللہ سب کے مضامین قریب قریب اسی میں آگئے ہیں اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ عمل خیر کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۂ

التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

تعمیم التعلیم

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبدالمنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کیا کریں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعمیم التعلیم

این	کہاں ہوا	سروٹ مظفر نگر مدرسہ محمودیہ
متیٰ	کب ہوا	۲۱ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ
کم	کتنا ہوا	۴½ گھنٹے
کیف	کیسے ہوا	بیٹھ کر
لِمَ	کیوں ہوا	بدرخواست اہل مدرسہ بوجہ غلبہ اشتیاق کہ عرصہ سے وعظ کا سلسلہ بند تھا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	تعلیم کو عام اور وسیع کرنا چاہیئے محض عربی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیئے۔
من ای شان	کس طبقہ کے لئے زیادہ مفید تھا	طبقۂ علماء وطلبہ ونو تعلیم یافتہ حضرات کو زیادہ مفید تھا۔
من ضبط	کس نے لکھا	ظفر احمد عثمانی تھانوی عفا اللہ عنہ
المستمعون	تعداد سامعین	تقریباً ۶۰۰ مرد تھے
اشتات	متفرقات	مستورات کا مجمع بھی تھا جن کی تعداد معلوم نہ ہوسکی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (ترجمہ) یہ لوگ ایسی چیزیں سیکھ

لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں اور ضرور یہ بھی اتنا جانتے ہیں
کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بلا شک
بری ہے وہ چیز جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو عقل ہوتی
اور اگر وہ لوگ ایمان و تقویٰ کرتے تو خدا کے یہاں کا معاوضہ بہتر تھا کاش
ان کو عقل ہوتی)

ان آیتوں میں کا جزو اول ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں ایک قصہ مذکور ہے پوری
آیت میں نے اس لئے نہیں پڑھی کہ جو مقصود اس وقت قابلِ بیان ہے وہ اُس
میں مذکور نہیں بلکہ وہ صرف اُسی جزو میں مذکور ہے جس کو میں نے تلاوت کیا ہے اگرچہ
وہ قصہ بھی جو پوری آیت میں ذکر کیا گیا ہے ضروری ہے اور قرآن کا کوئی جزو ایسا
نہیں ہے جو ضروری نہ ہو مگر خاص وقت اور خاص محل کی وجہ سے کسی ایک جزو کو
بیان کے لئے اختیار کر لیا جاتا ہے اسی لئے میں نے پوری آیت کی تلاوت نہیں کی بلکہ
اخیر جزو پر اکتفا کیا۔ اور تبلیغ کے موقعہ پر ایسا کرنا جائز ہے (چنانچہ سیدنا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ موقع استشہاد میں جزو آیت کے) تلاوت پر کفایت
فرمائی ہے ۱۲ من الجامع لیکن نماز میں ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ ایک آیت کو بیچ میں سے پڑھنا شروع
کر دے یا وسط میں سے قطع کر دے نماز میں پوری آیت بلکہ پوری سورت پڑھنی چاہیئے
مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لمبی لمبی سورتیں پوری پڑھا کرے جس سے مقتدیوں کو تکلیف ہو
بلکہ ہر وقت کے مناسب جتنی مقدار فقہائے نے بتلائی ہے اس کے موافق سورتیں پڑھنا
چاہئیں۔ نماز کا تو یہی حکم ہے مگر تبلیغ میں اس کا مضائقہ نہیں کہ ایک آیت کو وسط میں
سے شروع کرے یا وسط میں قطع کر دے یہ تو وجہ تھی جزو آیت پر اکتفا کرنے کی رہا
یہ کہ میں نے اس جزو کو اس وقت کیوں اختیار کیا سو ہر چند کہ مضامین قرآن سب ہی
ضروری ہیں اور اسی بنا پر وہ قصہ بھی ضروری ہے جو پوری آیت میں مذکور ہے لیکن
اس وقت یہ بیان ایک علمی مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ علم دین کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے
اس لئے مناسب ہوا کہ علم کے متعلق کچھ بیان اور بحث کی جاتے اور طلبہ کو علم کے حقوق سے

آگاہ کیا جائے اور اس میں جو کچھ کمی کی جا رہی ہے اس کی اصلاح کر دی جائے اور علم کا بیان جس خاص طریق پر ہیں اس وقت کرنا چاہتا ہوں وہ اسی جزو اخیر میں مذکور ہے جس کو میں نے پڑھا ہے چنانچہ ترجمہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی، حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ اور یہ لوگ سیکھتے ہیں اُس علم کو جو ان کے لئے مضر ہے اور نفع نہیں دیتا۔ ان لوگوں سے مراد یہود ہیں اور اس علم سے مراد سحر ہے۔ اوپر سے یہود کی مذمت مختلف طریقوں سے مذکور ہوتی آ رہی ہے، چنانچہ اسی ضمن میں ان لوگوں کی بھی مذمت بیان کی گئی ہے جو سحر میں مبتلا تھے اور اس کے متعلق ہاروت ماروت کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے ہر چند کہ اس قصہ کو مقصود وعظ کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں مگر ربط کے لئے اس کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیَاطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمَانَ ۚ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ وَلٰکِنَّ الشَّیَاطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ؕ وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ

(اور انہوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا شیاطین سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں کیا کرتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے۔ اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اس کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے جب تک یہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے سو تو کہیں کافر مت بن جائیو سو لوگ ان دونوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیا کرتے تھے اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے حکم سے)

اس کے بعد آیت کا وہی حصہ ہے جو میں نے تلاوت کیا تھا۔ مقصود ان آیتوں سے یہود کی مذمت بیان کرنا ہے کیونکہ ان میں سحر کا بہت چرچا تھا اور وہ اس میں بڑے ماہر تھے۔

چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی سحر کیا تھا جس کا اثر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گیا تھا پھر وحی کے ذریعہ سے آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ پر فلاں شخص نے سحر کیا ہے چنانچہ سورۃ الفلق میں اس کی طرف اشارہ ہے وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ اور (آپ کہئے کہ) میں پناہ مانگتا ہوں بدی سے ان عورتوں کی جو گرہوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونک مارنے والی ہیں۔ گرہوں پر پھونک مارنے کی تخصیص اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سحر ہوا تھا وہ اسی قسم کا تھا کہ ایک تانت کے ٹکڑے میں گیارہ گرہیں دی گئی تھیں اور ہر گرہ پر کلمات سحر کو دم کیا گیا تھا اور عورتوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں عورتوں ہی نے یہ سحر کیا تھا دوسری کچھ تجربہ سے اور نیز علم طبعی کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا سحر بہ نسبت مردوں کے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ کیونکہ سحر میں قوت خیالی کو زیادہ دخل ہے خواہ وہ سحر حلال ہو یا سحر حرام یعنی سحر کی دو قسمیں ہیں ایک سحر حرام کہ محاورات میں اکثر اسی پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے، دوسرے سحر حلال جیسے عملیات اور عزائم اور تعاویذ وغیرہ کہ لغۃً یہ بھی سحر کی قسم میں داخل ہیں اور ان کو سحر حلال کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعویذ و عزائم وغیرہ مطلقاً مباح نہیں بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر اس میں اسمار الٰہی سے استعانت ہو اور مقصود بھی جائز ہو تو جائز ہے اور اگر مقصود ناجائز ہو تو حرام ہے اور اگر شیاطین سے استعانت ہو تو مطلقاً حرام ہے خواہ مقصود اچھا ہو یا بُرا۔ بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ جب مقصود اچھا ہو تو شیاطین کے نام سے بھی استعانت جائز ہے یہ بالکل غلط ہے خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے) کا حکم مطلق نہیں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچھی نیت سے حرام کام بھی جائز ہو جائیں امور محرمہ کسی نیت سے بھی کئے جائیں وہ حرام ہی رہیں گے۔ بلکہ یہ حدیث امور مباحہ اور طاعات کے ساتھ مخصوص ہے یعنی اگر جائز کام کو اچھی نیت سے کیا جائے تو اس پر ثواب ملتا ہے اور بُری نیت سے کیا جائے تو گناہ ہوتا ہے، نیز بعض فرائض و واجبات بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتے خلاصہ یہ کہ

مقصود سے پہلے ذریعہ کو دیکھ لینا ضروری ہے اگر ذریعہ جائز ہے مثلاً اسماء الٰہی سے استعانت ہو تو پھر مقصود کو دیکھا جائے۔ اگر مقصود بھی محمود ہے تو اس صورت میں تعویذ عملیات کو جائز کہا جائے گا اور اگر مقصود ناجائز ہے تو ان کو حرام کہا جائے گا اور اگر ذریعہ ہی حرام ہو جیسے استعانت بالشیاطین تو اب مقصود چاہے کیسا ہی ہو وہ حرام ہی رہیگا اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص نماز کے لئے لوگوں کو جمع کرنا چاہے اور اس غرض کے لئے ناچ کرائے تاکہ ناچ کے شوق میں سب آجائیں اور نماز پڑھ لیں تو مقصود اگرچہ بہت محمود ہے مگر چونکہ اس کے لئے حرام کو ذریعہ بنایا گیا ہے اس لئے اس صورت کو حرام ہی کہا جاوے گا۔ سو آپ نے دیکھا کہ نماز باوجودیکہ حق تعالیٰ کو محمود ہے مگر اس کے لئے بھی جب حرام کو ذریعہ بنایا گیا اس کو شریعت حرام ہی کہے گی یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو تعویذ و عملیات کو نفع رسانی کے موقعہ میں مطلقاً جائز سمجھتے ہیں گو اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے تو مخلوق کو نفع پہونچانے کے لئے کیا ہے پھر اس میں کیا خرابی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نماز کے مقابلہ میں دنیوی نفع کوئی چیز نہیں ہے دنیا حق تعالےٰ کے نزدیک مبغوض ہے اور نماز محبوب ہے جب نماز کے لئے حرام کو ذریعہ بنانا جائز نہیں تو دنیوی نفع کے لئے شیاطین سے استعانت کیونکر جائز ہوگی۔ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہر کام میں سب سے پہلے یہ دیکھے کہ اس سے خدا تعالیٰ راضی ہیں یا نہیں جس کام سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں وہ بالکل ہیچ ہے چاہے اس میں دنیوی نفع کتنا ہی ہو مسلمان کے واسطے خدا کی رضا سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ غور کیجئے اگر کوئی محبوب اپنے محبوں کے دھولیں مارتا اور نافرمانوں کو روپئے دیتا ہو تو اس وقت عاشق کیا چاہے گا، یقیناً عاشق محبوب کی نافرمانی روپئے حاصل کرنے کے لئے کبھی گوارا نہ کرے گا بلکہ وہ نہایت خوشی سے دھولیں کھانا پسند کرے گا کیونکہ محبوب کی رضا اسی میں ہے اسی طرح خدا کا محبوب دنیوی نفع و نقصان کی پروا خدا کی رضا کے سامنے کبھی نہیں کرسکتا بلکہ اس کا مذاق یہ ہوتا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجانِ من	دل فدائے یار دل رنجان من
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں	فوق گردون ست نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ	جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے محبوب پر جو میری جان کو تکلیف دینے والا ہے فدا ہوں جہاں محبوب ہو خوش و خرم بیٹھو وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند ہے نہ پست جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو)

یہاں تک کہ عشاق تو رضائے الٰہی کے سامنے جہنم کی بھی پروا نہیں کرتے اگر خدا تعالیٰ اسی میں راضی ہوں کہ ان کو جہنم میں بھیجدیا جاوے تو اس پر بھی خوش ہیں اور اُس وقت وہ دوزخ ہی اُن کے واسطے جنت بن جاوے گی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔[۹]

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

باتو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب بغیر آپ کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ شاعرانہ مبالغہ ہے ورنہ اگر دوزخ میں ان کو بھیجدیا جائے تو ساری بہادری کرکری ہوجائے گی سو خوب سمجھ لو کہ یہ مبالغہ نہیں بلکہ سچی بات ہے اور اس وقت بھی اللہ کی ایک مخلوق ایسی ہے جو خدا کی رضا کے سامنے جہنم کی پرواہ نہیں کرتے دیکھو ملائکہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار اور طالب رضا ہیں ان میں ایک جماعت زبانیۂ جہنم کی بھی ہے جو دوزخ کی داروغہ اور کارکن ہے اور وہ ہر وقت دوزخ ہی میں رہتے ہیں، اگرچہ دوزخ میں ان پر عذاب نہیں ہے مگر ظاہر ہے کہ ان کے سامنے ہر وقت آگ اور دھواں ہے، خون اور پیپ کا منظر ہے، بڑی بڑی ڈراونی صورتیں ہیں، سانپ اور بچھو اور اژدہا وغیرہ ہیں اور ایک جماعت جنت کی کارکن ہے جہاں ہر وقت اُن کے سامنے مناظر حسنہ ہیں باغ اور پھول پھلواری ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں حسین جمیل صورتیں ہیں پھر جنتیوں کی صحبت ہے جو سب کے سب مہذب اور شائستہ ہیں

اور زبانیہ جہنم کو دوزخیوں سے پالا پڑتا ہے جن کی باتوں سے بھی لینا نہیں ہر وقت لعن طعن گالم گلوچ ہی ہوگی کُلّمَا دخلت امۃ لعنت اختھا تو کیا دوزخ اور جنت کے محافظوں کے ان خارجی حالات میں کچھ بھی تفاوت نہیں ہے ضرور ہے پھر کیا زبانیہ جہنم کو وہاں کچھ کلفت ہے ہرگز نہیں اگر ان سے یہ کہا جاوے کہ خدا کی مرضی تو نہیں لیکن اگر تم چاہو تو تم کو جنت کا محافظ بنا دیا جاوے جہاں ایسے ایسے مناظر حسنہ ہیں باغات اور نہریں ہیں مہذب آدمیوں کی صحبت ہے لیکن مرضی خدا کی اسی میں ہے کہ تم دوزخ میں رہو جہاں ایسے مناظر کریہہ ہیں تو وہ بھی کہیں گے ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب بغیر تمہاری رضا کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کی رضا کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

پھر جب ملائکہ میں ایک جماعت ایسی موجود ہے جو دوزخ میں رہنے پر ویسے ہی راضی ہے جیسا کہ جنت کے محافظ جنت میں رہنے پر تو اگر انسانوں میں عشاق کی جماعت اس شان کی ہو تو اس پر تعجب کیا ہے کیونکہ انسان میں تو عشق و محبت کا مادہ سب سے زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ عشق و محبت انسان ہی میں ہے، الغرض یہ مبالغہ شاعرانہ نہیں ہے سچا کلام ہے اور محقق کا کلام ہمیشہ محقق ہی ہوتا ہے مبالغہ شاعرانہ پر مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی۔

جب میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا تو اس وقت ہم لوگ مثنوی حضرت سے پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ مطالعہ میں یہ شعر آیا جس میں توحید کا مضمون ہے ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد

انکہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(ان کا حملہ نظر آتا ہے اور ہوا تصرف حق نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل

سے کم نہ ہو)
اس شعر پر میں بہت چکرایا کیونکہ آنچہ ناپیداست سے مراد اس میں حق تعالےٰ ہیں چنانچہ پہلے اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی مولانا نے اس سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے فاعل حقیقت میں حق تعالےٰ ہیں اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے علم پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے جب ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ شیر نہ حرکت کر سکتا ہے نہ حملہ بلکہ ہوا کی وجہ سے اس کو حرکت ہوتی ہے اور حرکت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے لیکن ہوا ہم کو نظر نہیں آتی بلکہ ظاہر میں وہ تصویر ہی متحرک معلوم ہوتی ہے۔ یہی مثال ہماری ہے کہ ہم حقیقت میں محض ہیچ ہیں مگر حق تعالےٰ کے فعل کی وجہ سے ظاہر میں ہم فاعل معلوم ہوتے ہیں ؎

ما ہمہ شیراں ولے شیرِ علم
حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہماری مثال ایسی ہے جیسا پرچم کا شیر ہوتا ہے کہ اس کا حملہ ہوا چلنے سے معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرف حق کی وجہ سے ہے)

اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد
آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(حملہ تصرف ہمارا ان کا نظر آتا ہے اور ہوا یعنی تصرف حق نظر نہیں آتا جو چیز نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو)

یعنی شیروں کا حملہ کرنا تو ظاہر ہے مگر ہوا جو اُن کو حرکت دے رہی ہے ناپیدا ہے یعنی مخفی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو۔ تو اس میں ناپیدا سے مراد حق تعالےٰ ہیں، اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ کے لیے یہ دعا کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ ہرگز کم مباد تو میں یہ سمجھا کہ مولانا نے محبت کے جوش میں

محض شاعرانہ طریقہ پر یہ دعا کی ہے جیسے شبانِ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایسے ہی مضامین مذکور ہیں کہ وہ محض غلبۂ محبت میں حق تعالےٰ کی شان میں ایسی باتیں کر رہا تھا جو محبوبانِ مجازی کے مناسب ہوتی ہیں اور حق تعالےٰ اُن سے پاک ہیں اسی طرح حق تعالےٰ اس دعا سے بھی مستغنی ہیں مگر محض غلبۂ محبت میں مولانا نے یہ فرمادیا کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو یعنی اللہ میاں ہمیشہ سلامت رہیں۔ غرض میں اس شعر میں تاویلیں کرتا تھا لیکن کوئی بات دل کو نہ لگتی تھی۔ کیونکہ یہ سب تاویلیں مولانا کے مرتبہ سے بعید تھیں، مولانا اگرچہ بہت بڑے صاحبِ حال ہیں مگر شبانِ موسیٰ کی طرح ایسے مغلوب الحال بھی نہیں ہیں۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے درس شروع ہوا تو آپ نے اس شعر کو سن کر بطور تفسیر کے ایک کلمہ ایسا فرمادیا جس سے سارے اشکالات ختم ہوگئے۔ اور معلوم ہوا کہ یہ مضمون شاعرانہ نہیں ہے بلکہ سچی بات ہے ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد
آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(حملہ ان کا نظر میں آتا ہے تصرف حق نظر نہیں آتا جو نظر نہیں آتا وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو)

حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں اے دل ما (ہمارے دل سے) سبحان اللہ اس کلمہ سے شعر میں جان پڑگئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ شعر میں تو جان پڑی ہوئی تھی مگر ہم نہ سمجھے تھے۔ حاجی صاحب کے ارشاد سے حقیقت ظاہر ہوگئی، یعنی مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ ہمارے دلوں سے کم نہ ہو۔ اب کوئی اشکال نہ رہا اور معلوم ہوگیا کہ محقق کا کلام محقق ہی ہوتا ہے۔ البتہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی محقق ہونا ضروری ہے اسی طرح اس شعر میں بھی مبالغہ نہیں ہے ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے بغیر آپ کی رضا کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کی رضا کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

کیونکہ بہادری تو جب ہو کہ دوزخ میں اس کو عذاب بھی ہو اور اس شخص کے لئے رضائے
الٰہی کے ساتھ دوزخ میں عذاب بھی نہیں کیونکہ اس کے نزدیک تو عذاب نام فراق کا
ہے اور جب خدا تعالیٰ کی رضا اس کو دوزخ میں بھی حاصل ہے تو فراق کہاں یہ تو عین
وصل ہے غرض عاشق کے نزدیک ظاہری تکالیف کا نام عذاب ہی نہیں وہ تو
صرف فراق اور ناراضی محبوب کو عذاب سمجھتا ہے۔ حضرت عارف شیرازی رحمۃ
اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

(میں نے سنا ہے کہ پیر کنعان یعنی یعقوبؑ نے کیا عمدہ بات کہی کہ محبوب کی جدائی
وہ حالت پیدا نہیں کرتی جس کو بیان کیا جا سکے واعظ شہر نے جو ڈراؤ نے
حالات قیامت کے بیان کئے ہیں وہ روزگار ہجر سے ایک اشارہ ہے)

اور راز اس میں یہ ہے کہ رضا و تفویض محبت و معیت کی لذت میں وہ آلام و تکالیف
ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ان کا اثر معتد بہ محسوس نہیں ہوتا۔ پس اگر فرشتوں کو جہنم
میں عذاب ظاہری بھی ہوتا تب بھی وہ اس پر راضی ہوتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا
اسی میں ہوتی اور وہ مقبول بندے رضا کے طالب ہیں مگر ان پر تو عذاب بھی نہیں ہے
غرض ان کے نزدیک جہنم میں رہنا ویسا ہی ہے جیسا کہ جنت میں رہنا۔ مقصود میرا
اس بیان سے یہ تھا کہ اصل حضرات خدا تعالیٰ کی ناراضی ہے اس کے سامنے دنیا کا
نفع و نقصان کوئی چیز نہیں بس بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر نیت اچھی ہو اور
کسی کا نفع ہو تو سفلی عمل بھی جائز ہے جس میں شیاطین سے استعانت ہوتی ہے یہ خیال
بالکل غلط ہے اسی طرح آجکل یہ مرض پیدا ہوا ہے کہ بعض لوگ گناہوں کے متعلق وجہ
دریافت کیا کرتے ہیں کہ سود کیوں حرام ہوا، اس میں کیا خرابی ہے، جان بیمہ کیوں ناجائز
ہے اس میں تو بڑا نفع ہے، سو یاد رکھو کہ اس سوال کا کسی مسلمان کو حق نہیں مسلمان
کے لئے اتنی وجہ کافی ہے کہ حق تعالیٰ اس فعل سے ناراض ہیں۔ عاشق کو اتنی بات

معلوم کر لینے کے بعد کہ محبوب اس بات سے ناراض ہوتا ہے کسی اور وجہ کا انتظار نہیں ہوتا پھر مسلمانوں کو گناہوں کے متعلق علل اور اسباب کی تلاش کا انتظار کیوں ہے اور اگر تم عاشق نہیں بنتے تو خدا کے غلام تو ہو اب خود ہی انصاف کرلو کہ اگر تمہارا کوئی لوکر یا غلام تم سے یہ دریافت کرنے لگے کہ آپ فلاں کام سے کیوں ناراض ہوتے ہیں، اس کی وجہ پہلے بتلا دیجئے تب میں اس کام سے باز آؤں گا ورنہ میں اپنی رائے پر عمل کروں گا تو آپ اس کی ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ افسوس تم تو اس غلام سے بھی گئے گذرے جس کو ایک شخص نے خریدکیا اور پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے اس نے کہا کہ اب تک خواہ کچھ ہی نام تھا لیکن اب سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھاتا ہے کہنے لگا کہ حضور کھلائیں گے وہی کھاؤں گا جو آپ پہنائیں گے وہی پہنوں گا۔ افسوس ہم خدا کی ساتھ اتنا بھی برتاؤ نہیں کرتے اور اس کے احکام میں علتیں ڈھونڈھتے ہیں آجکل اکثر تو تعلیم یافتہ اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو یہ جواب کافی نہیں ہوتا کہ سود اس واسطے حرام ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہیں بلکہ وہ اس کی عقلی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور جب تک علت نہ معلوم ہو اس وقت تک ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں تو سود کے مذموم ہونے کی علت یہ نہیں تسلیم کرتا کہ اس سے دوزخ میں جانا ہوگا بلکہ میں تو اس واسطے اسے حرام سمجھتا ہوں کہ اس میں بے مروتی بہت زیادہ ہے کہ اپنے ایک بھائی کو دیئے تو تھے سو روپئے اور لے لئے دو سو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ علت ایسی ہے جس کو ذرا سے تامل کے بعد ہر عاقل توڑ سکتا ہے کیونکہ ذہین آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی بے مروتی تو ہر تجارت میں ہے مثلاً ہم نے ایک کپڑا خریدا تو دس روپے میں اور اس کو فروخت کرنے لگے بیس روپے میں یہ بھی بے مروتی ہے۔ ایک مکان ہم نے تیار کیا دو ہزار میں اور بیچنے لگے دس ہزار میں یہ بھی بے مروتی ہے اسی طرح ایک جائداد ہم نے خریدی تھی ہزار میں اور فروخت کرنے لگے پندرہ ہزار میں اب وہ شخص جو سود کو محض بے مروتی کی وجہ سے مذموم سمجھتا ہے ان صورتوں میں اور سود کی صورت میں کوئی فرق عقلی بیان کرے سو ہرگز وہ کوئی فرق . . .

عقلی نہ بیان کر سکے گا۔ چنانچہ کفارِ مکہ کو بھی یہی شبہ پیش آیا تھا ان کو بھی یہی حیرت تھی وہ کہتے تھے اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بیع بھی سود کی طرح ہے) کہ ربوا اور بیع میں کیا فرق ہے دونوں ظاہر میں یکساں معلوم ہوتے ہیں تو اب وہ علت کہاں رہی۔ قرآن میں اس کا جواب جو دیا گیا ہے وہ سننے کے قابل ہے حق تعالٰے نے عقلی وجہ فرق کوئی نہیں بیان فرمائی بلکہ یہ فرق بیان فرمایا۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ تعالٰے نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے) کہ دونوں کو یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں بلکہ دونوں میں بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالٰی نے بیع و تجارت کو تو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور حق تعالٰے مالک ہیں انہیں اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں کسی کو وجہ دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں، علماء کو چاہیے کہ ایسے سوالات کے جواب میں قرآن کا طرز اختیار کیا کریں۔ عوام کا مذاق علماء نے بھی خراب کر دیا ہے کہ جب اُن سے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں تو وہ عوام کی مرضی کے موافق جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں سو یاد رکھو جو لوگ علتیں گھڑ کر بتلاتے ہیں وہ شریعت کی جڑ کھوکلی کرتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ جو علت وہ بتلا دیں اس کو کوئی ذہین آدمی مخدوش کر دے اور جب آپ نے حرمت کا مدار اسی علت پر رکھا تھا تو اس کے مخدوش ہونے کے بعد حکم بھی مخدوش ہو جائے گا۔ میں علماء کو وصیت کرتا ہوں کہ عوام کا ایسا اتباع نہ کریں کہ اس میں عوام کا بھی نقصان ہے اور علماء کا بھی اور شریعت کی بنیاد بھی کمزور ہوتی ہے بلکہ جب کوئی ان سے یہ پوچھے کہ فلاں کام کے حرام ہونے کی علت کیا ہے تو صرف اتنا جواب دے دیا کریں کہ حق تعالٰی نے اس سے منع کیا ہے یا حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ بعض لوگ سوال میں یہ قید لگا دیتے ہیں کہ اس کا ثبوت قرآن سے دیا جاوے اور علماء بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو قرآن ہی سے ثابت کیا جاوے حالانکہ جب اصول شریعت چار ہیں کتاب و سنت و اجماع امت و قیاس تو ہر عالم کو حق ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو قرآن سے ثابت کر دے یا حدیث سے یا اجماع سے یا قیاس مجتہد سے آخر تمام مسائل کو قرآن سے آپ کہاں

تک ثابت کریں گے۔ اگر تمام مسائل قرآن سے معلوم ہو سکتے تو پھر دوسرے حجج شرعیہ کی ہی ضرورت کیوں ہوتی بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں ہر چیز ہے یہاں تک کہ وہ ریل اور تار وغیرہ کا ثبوت بھی قرآن سے دینے لگے حالانکہ قرآن میں ہر چیز کے بیان ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ورنہ پھر کپڑا بننے کی ترکیب مشینیں اور کلیں بنانے کا طریقہ بھی قرآن میں ہونا چاہیئے تو پھر قرآن کیا ہوا وہ تو صنعتوں کی کتاب ہوئی۔ بھلا اگر کوئی شخص طب اکبر میں جوتا سینے کی ترکیب ڈھونڈھنے لگے وہ احمق ہے یا نہیں اور اگر طب اکبر میں ایسی ترکیبیں بھی لکھی ہوتیں تو اس کو طب کی کتاب ہرگز نہ کہتے طب اکبر میں ایسی باتوں کا ہونا اس کے لئے عیب ہے اسی طرح قرآن میں جو کہ طب روحانی کی کتاب ہے ایسی فضولیات کا ہونا اس کے لئے کمال نہ ہوگا بلکہ عیب ہوگا۔ قرآن میں دین کی سب باتیں مذکور ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ سب صراحتاً مذکور ہوں بلکہ اس میں قواعد کلیہ مذکور ہیں جس سے مجتہدین مسائل جزئیہ استنباط کرلیتے ہیں۔ رحمہم اللہ چنانچہ ایک قاعدہ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو کچھ (حکم) دیں اس کو لے لو اور جس بات سے منع کردیں اس سے باز رہو تو اب جتنے احکام احادیث نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ثابت ہیں وہ سب اس قاعدہ کی جزئیات ہیں، لہٰذا ہم کو حق ہے کہ بعض احکام کا ثبوت احادیث سے دیدیں نیز قرآن میں ایک قاعدہ یہ بھی مذکور ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ اے بصیرت والو! اعتبار حاصل کرو۔ اور اعتبار کہتے ہیں ایک نظیر کو دوسری نظیر پر قیاس کرنے کو اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام قیاس سے بھی ثابت ہوتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس پھر ہم کو اس پابندی کی کیا ضرورت ہے کہ ہر مسئلہ کا جواب قرآن ہی سے دیں۔

آجکل ایک فرقہ قرآنیہ پیدا ہوا ہے جو قرآن کے سوا کچھ نہیں مانتے یہ غیر مقلدوں سے بھی بڑھ گئے وہ تو قیاس ہی کو نہ مانتے تھے انھوں نے حدیث کو بھی اڑا دیا اس فرقہ کے ایک عالم سے یہ پوچھا گیا کہ عدد رکعات کا ثبوت قرآن سے دو کیونکہ قرآن میں تو مطلق نماز کا حکم ہے اور بعض آیات میں نماز کے اوقات بھی اشارۃً مذکور ہیں لیکن

عدد رکعات کہ صبح کی دو رکعتیں فرض ہیں اور ظہر کی چار اس کا بیان قرآن میں کہیں بھی نہیں تو تم لوگ یہ عدد کہاں سے سمجھے ہو اگر احادیث سے سمجھے ہو تو احادیث کا حجت ہونا مسلّم ہو گیا ورنہ قرآن میں دکھلاؤ کہ یہ اعداد کہاں مذکور ہیں اُس نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ اسی سے ان کے مذہب کا لچر ہونا معلوم ہو گیا کہ ابھی تک عدد رکعات کی دلیل بھی معلوم نہیں اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا۔ غرض اگلے دن انہوں نے بہت سوچ ساچ کر یہ آیت پڑھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے فرشتوں کو بازوؤں والا بنانے والا ہے دو دو اور تین تین اور چار چار۔ یہ دلیل بھی نماز کی رکعتوں کے اثبات کی۔ سبحان اللہ وہی مثال ہوئی ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ بھلا اس آیت میں فرشتوں کے بازوؤں کی شمار کا ذکر ہے یا رکعات صلوٰۃ کے عدد کا۔ اگر محض عدد کا ذکر ہی اس کے لئے کافی ہے تو ایک یہی آیت کیا اور بھی آیتیں ایسی مل جائیں گی۔ چنانچہ ارشاد ہے فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (پس اور عورتوں جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے) یہاں بھی وہ عدد مذکور ہے جو پہلی آیت میں ہے۔ باقی اس سے تو کوئی غرض ہے ہی نہیں کہ یہ عدد کس چیز کا ہے، نماز کا ہے یا فرشتوں کے بازوؤں کا یا منکوحہ عورتوں کا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ۔ غرض علماء کو یہ طرز اختیار نہ کرنا چاہیئے کہ ہر مسئلہ کا قرآن سے ثبوت دینے کی کوشش کریں یا ہر مسئلہ کی عقلی علت بیان کریں کیونکہ بعض جگہ آپ کو علت ہی نہ ملیگی یا ملے گی مگر کمزور ہو گی تو اس طرز سے گویا آپ شریعت کی جڑ کو کھوکلی کرنا چاہتے ہیں ایک صاحب نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک جنٹلمین کو میں نے نصیحت کی کہ تم داڑھی کیوں منڈاتے ہو یہ گناہ ہے اس سے توبہ کرنی چاہیئے، وہ کہنے لگے کہ داڑھی کا ثبوت تم قرآن سے اگر دیدو تو میں ابھی توبہ کر لوں گا، میں نے کہا کہ قرآن سے داڑھی کا ثبوت میں دے سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی قَالَ یَا ابْنَ اُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْیَتِیْ

وَلَا بِرَأْسِیْ۔ ہارون علیہ السلام نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے میرے ماں جائے میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام اسے کس طرح پکڑتے۔ میں نے ان حضرت سے یہ کہا کہ اگر وہ شخص تم سے یہ سوال کرتا کہ اس آیت سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی وجوب تو ثابت نہ ہوا کہ اس کا رکھنا واجب ہے تو تم کیا جواب دیتے اور وجود ثابت کرنے کے لئے تم نے قرآن کو کیوں تکلیف دی اپنی ہی داڑھی دکھلادی ہوتی کہ لو میری داڑھی دیکھ لو اس سے وجود ثابت ہوگیا وہ کہنے لگے کہ اجی اس کو اتنی عقل تھوڑا ہی تھی کہ وہ یہ سوال کرسکتا میں نے تو اس کو ڈرا ہی لیا۔ میں نے کہا کہ بس یہی فرق ہے ہم طالبعلموں میں اور آپ میں ہم ایسی دلیل کبھی نہیں بیان کرسکتے جو خود ہمارے نزدیک بھی مخدوش ہو۔ ہماری زبان ہی ایسی دلیل پر نہیں چلتی ہم تو حتی الامکان وہی بات منہ سے نکالتے ہیں جو دنیا بھر کے عقلاء سے نہ ٹوٹ سکے گو مخاطب کے مذاق کے موافق نہ ہو۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ یہ طرز شریعت کے لئے بہت ہی ضرر رساں ہے یہ لوگ اپنے دل ہی میں خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم نے شریعت کے ساتھ دوستی کی مگر ان کی یہ دوستی ویسی ہی ہے جیسے ریچھ کی دوستی مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک ریچھ پالا تھا اور اسے پنکھا جھلنا سکھایا تھا کہ جب آقا سوجاتا وہ کھڑا ہو کر اسے پنکھا جھلا کرتا تھا، بعض دوستوں نے اسے منع بھی کیا کہ جانور کا اعتبار نہیں اس سے ایسی خدمت نہ لینی چاہئے کہ خود سو جاؤ اور اُسے آزاد چھوڑ دو، کہنے لگا کہ نہیں صاحب یہ تعلیم یافتہ ہے (یعنی اب یہ مہذب اور شائستہ ہوگیا ہے وحشی نہیں رہا) اب اس سے کچھ خطرہ نہیں۔ ایک دن یہ آقا صاحب پڑے سو رہے تھے اور ریچھ حسب معمول پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی اس کی ناک پر آکر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑادیا وہ پھر آکر بیٹھی بعض مکھی ایسی لیچڑ ہوتی ہے کہ جتنا اس کو اڑاؤ وہ باز ہی نہیں آتی بار بار آکر بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس مکھی نے ریچھ کو تنگ کردیا وہ اڑاتا اڑاتا تھک گیا مگر وہ پھر آموجود ہوتی تھی یہاں تک کہ ریچھ کو غصہ آگیا اور اس نے پنکھا ڈال کر ایک بڑا سا پتھر تلاش کیا کہ اب کے اگر یہ مکھی آوے گی تو

میں اس پتھر سے اس کو مار ڈالوں گا چنانچہ وہ مکھی پھر آئی اور ریچھ نے تاک کر ایک بڑا سا پتھر آقا کی ناک پر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا نہیں مگر آقا کے دماغ کا بھرتہ ہو گیا تو جس طرح اس ریچھ نے اپنے نزدیک تو آقا کی خدمت ہی کی تھی اور اس کا ارادہ موذی کو مارنے کا تھا اس نے آقا کو ہلاک کرنا نہ چاہا تھا مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دوستی حقیقت میں آقا کی ساتھ دشمنی تھی اسی طرح آج کل ہمارے یہ نادان بھائی شریعت کے ساتھ ریچھ کی سی دوستی کر رہے ہیں۔ اور اصل راز ایسے گستاخانہ سوالات کا یہ ہے کہ لوگوں میں آجکل عُجب وکبر غالب ہے انقیاد کا مادہ مفقود ہوتا جاتا ہے اسی لئے احکام شرعیہ کو عبدیت کے طور پر ماننے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور ایک احکام شرعیہ ہی میں کیا اس عدم انقیاد اور عُجب وکبر کا مذاق ہر معاملہ میں جھلک رہا ہے حتیٰ کہ اگر کسی امر میں اپنی کوئی غلطی بھی محسوس ہو جاوے اور اس غلطی کے اعتراف کے لئے آمادہ بھی ہو جاویں تو اس کا طرز بھی ایسا تجویز کیا ہے جس سے ذرہ برابر ندامت و تواضع نہیں معلوم ہوتی بس چند الفاظ ضابطہ کے دُھرا لینا کافی سمجھتے ہیں اور شان کی اس میں بھی حفاظت رکھی جاتی ہے چنانچہ آجکل کی تہذیب میں معافی چاہنے کا ایسا ہی عجیب طریقہ مشاہدہ ہے کسی کمبخت کا ان کے ہاتھ سے کیسا ہی نقصان ہو جائے بس یہ اتنا کہہ کر چھوٹ گئے کہ میں نہایت افسوس کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو گیا۔ سبحان اللہ کسی کے جوتے مار لئے اور یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ میں افسوس کرتا ہوں۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص کی ڈاڑھ میں درد تھا وہ ڈاکٹر کے پاس گئے کہ اس ڈاڑھ کو نکال دو۔ نہ معلوم ڈاکٹر سے کیا غلطی ہوئی کہ اس نے وہ ڈاڑھ تو نہ نکالی اس کے بجائے ایک اچھی ڈاڑھ نکال دی جس کے نکلتے ہی یہ شخص فوراً اندھا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔ وہ بولے کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس غریب کی تو آنکھ گئی اور انہوں نے افسوس کر کے بزعم خود اس کی تلافی کر دی۔ پھر غضب یہ کہ افسوس بھی دل سے نہیں کرتے ان کا لہجہ افسوس میں بھی ایسا ہوتا ہے جس سے فرعونیت ٹپکتی ہے۔

کانپور میں ایک طالب علم نے ایک مدرس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مقدمہ میرے پاس آیا میں نے اس سے کہا کہ استاد سے معافی مانگو ورنہ تم کو مدرسہ سے نکال دیا جائے گا۔ وہ معافی چاہنے پر راضی ہوا مگر معافی چاہنے کی صورت یہ تھی کہ آپ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کرکے تن کر کھڑے ہوگئے اور زبان سے کہا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ صورت دیکھ کر غصہ آگیا میں نے دو تین طمانچے لگائے کہ گستاخ یہ طریقہ ہوتا ہے معافی چاہنے کا آگے ہاتھ جوڑ پیر پکڑ ورنہ ابھی مدرسہ سے نکال دونگا یہ آجکل کی تہذیب کا اثر ہے جو افسوس ہے کہ طلبہ اور علماء میں بھی سرایت کرگیا ہے۔ معافی اس طرح چاہتے ہیں جس میں ندامت نام کو بھی نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو استطراداً ذکر آگیا تھا۔ میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ آج کل لوگوں میں یہ خبط ہے کہ ہر چیز کو قرآن میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

ایک قصہ یاد آیا اہل سائنس نے یہ تحقیق کیا ہے کہ انسان کی منی میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے اس سے حمل قرار پاتا ہے۔ ایک صاحب کو اس کی فکر ہوئی کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ سائنس والوں کی تحقیق تو غلط ہو ہی نہیں سکتی وہ تو یقیناً صحیح ہے ہی بس کسی طرح اس کو قرآن میں ٹھونسنا چاہئے استغفراللہ العظیم غرض انہوں نے کھینچ تان کر اس کو قرآن سے ثابت کیا اب سنئے کیا خوبصورت استدلال ہے۔ آپ نے اس آیت سے ثبوت دیا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (اللہ تعالیٰ کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے) عَلَق کے معنے لغت میں خون بستہ بھی ہیں اور جونک کو بھی علق کہتے ہیں۔ آپ نے یہ تفسیر کی کہ خدا نے پیدا کیا انسان کو جونک سے۔ کیا واہیات ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس تفسیر سے سائنس کا مسئلہ کیونکر ثابت ہوگیا کیونکہ وہ لوگ تو اسی کے قائل نہیں ہیں کہ انسان کی منی میں جونک ہوتی ہے، ہاں اس پر ایک حاشیہ اور لگانا چاہیئے کہ جونک سے مراد وہ نہیں ہے جسے عام لوگ جونک کہتے ہیں بلکہ مطلق کیڑا مراد ہے۔ بس یہ تفسیر کرکے وہ صاحب خود ہی اپنے جی میں خوش ہولئے ہوں گے۔ تو آپ نے دیکھا کہ اس طرز میں

شریعت کی کس قدر تحریف لازم آتی ہے اور اس سے احتراز کس قدر ضروری ہے اگر کوئی ایسے مسائل کا ثبوت قرآن سے مانگے تو اس سے صاف کہدینا چاہیئے کہ قرآن علم تشریح کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز کے حرام ہونے کی وجہ دریافت کی جائے تو بس یہی جواب دیا جائے کہ خدا نے اس کو منع کیا ہے۔ خوامخواہ اپنی طرف سے علتیں نہ گھڑ نا چاہئیں بعض لوگ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ (لوگوں سے ان کی عقلوں کے اندازہ سے کلام کرو) سے استدلال کرتے ہیں کہ حدیث میں اس کا امر ہے کہ لوگوں کی عقل کے اندازہ سے کلام کیا کرو۔ اور جب آج کل طبائع کا حال یہ ہے کہ بدون عقلی علت معلوم کئے ان کو تسلی نہیں ہوتی تو ہم کو اسی طرز سے کلام کرنا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ آپ نے حدیث کا مطلب صحیح نہیں سمجھا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ایسی تدقیقات اور باریک باریک مضامین نہ بیان کرو جو ان کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے مذاق فاسد کی رعایت کیا کرو اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ امور محرمہ کی علت واضح اور سہل کونسی ہے اور باریک اور دقیق کونسی ہے۔ ظاہر ہے کہ جواب سب سے زیادہ سہل یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اس لئے یہ حرام ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اس لئے ایسا کرنا گناہ ہے اور جو علتیں اور حکمتیں آپ اپنی طرف سے گھڑتے ہیں درحقیقت وہی عوام کی عقول سے باہر ہیں تو اس حدیث سے بھی میری ہی تائید ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ عوام کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی تو آپ اس کی تسلی کے ذمہ دار نہیں ہیں آپ کو وہی جواب دینا چاہیئے جو اصلی اور حقیقی جواب ہے کہ خدا نے ہم کو اس سے منع کیا ہے یہ ایسا جواب ہے کہ قیامت تک اس پر کوئی جرح نہیں ہو سکتی اور اگر عقلی جواب دینے کا ایسا ہی شوق ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس حقیقی جواب کو بیان کردو اور کہدو کہ جواب اصلی تو یہی ہے پھر اس کے بعد تبرعاً عقلی جواب بھی بیان کردو تاکہ اگر اس پر کوئی جرح کردے تو پہلا جواب تو جرح سے سالم رہے گا اور حکم شرعی کا مدار آپ کی بیان کردہ علت پر تو نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا اتفاق سے ایک جنٹلمین صاحب بھی گاڑی میں اسی درجہ میں رونق افروز تھے ایک اسٹیشن پر پہنچکر ان کا ایک ملازم ایک کتا ان کے سپرد کر گیا جس کو انہوں نے ایک سینچہ سے باندھ دیا جب گاڑی چلی تو میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شریعت نے کتا پالنے سے کیوں منع کیا ہے حالانکہ اس میں ایسے ایسے کمالات ہیں انہوں نے اس کے وہ کمالات بیان کئے جو خود آقا صاحب میں بھی نہ تھے میں نے کہا کہ اس کے دو جواب ہیں ایک جواب عام ایک جواب خاص جواب عام تو یہ ہے کہ نَھَانَا عَنْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جاننے والے تھے اس لئے ہم کو اس کی تلاش کی ضرورت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع کیا اس جواب کو سن کر وہ ساکت ہو گئے مگر ان کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس جواب سے اُن کی تسلی نہیں ہوئی پھر کہنے لگے کہ میں خاص جواب سننے کا بھی مشتاق ہوں۔ میں نے کہا کہ خاص جواب یہ ہے کہ کتے میں جہاں بہت سے کمالات ہیں وہاں میں ایک عیب بھی اتنا بڑا ہے جس نے اس کے سارے کمالات کو دھو دیا ہے، وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہے اپنے آقا کی ساتھ چاہے کیسا ہی وفادار ہو مگر اپنی قوم سے اس کو ایسی نفرت ہے کہ جہاں دوسرا کتا اس کو نظر پڑا اور یہ اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑا پس جس میں قومی ہمدردی نہیں وہ پاس رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ جواب چونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا، کیونکہ یہ لوگ قومی ہمدردی کا سبق رات دن رٹا کرتے ہیں گو اس پر عمل کی توفیق نہ ہو، اس جواب سے پھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ بس جواب یہ ہے حالانکہ یہ جواب کچھ بھی نہیں محض لطیفہ ہے۔

پھر بریلی میں میں نے ایک تحصیلدار صاحب سے سنا کہ کالج علیگڈھ میں اس جواب کا بڑا چرچا ہے اور طلبہ کہتے ہیں کہ واقعی امت کو ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ایسی تحقیقات بیان کر سکیں، ڈلے، پتھر۔ میں کہتا ہوں کہ وہی لوگ اس جواب سے خوش

ہوں گے ورنہ ہمارے نزدیک یہ جواب خاک بھی نہیں ہیں اس جواب پر خود جرح کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک کتا جو دوسرے کو دیکھ کر بھونکتا ہے تو غور کرنا چاہئیے اس کا منشا کیا ہے آیا اس کا سبب اپنی قوم سے بے وفائی ہے یا آقا کی وفاداری۔ سو بظاہر آقا کی وفاداری اس کا سبب ہے وہ یہ سمجھ کر اس پر بھونکتا ہے کہ یہ میرے آقا کا دشمن ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے گھر میں دس کتے پلے ہوئے ہوں تو وہ آپس میں ایک دوسرے پر نہیں بھونکتے بلکہ وہ ہمیشہ اجنبی کتے پر بھونکتا ہے اور وہ بھی اس وقت تک جبتک کہ مالک اس کو روک نہ دے اور جہاں اس نے روکا فوراً خاموش ہوجاتا ہے کیونکہ اب سمجھ جاتا ہے کہ یہ میرے مالک کا دشمن نہیں اسے اس سے کچھ خوف نہیں پھر اس کے بعد مالک کے پیروں کو آکر لپٹ جاتا ہے اور ایسی خوشامدیں کرتا ہے جیسے کوئی بہت ہی بڑا عاشق ہو حتیٰ کہ اس کی اس محبت سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے، کتے کی دشمنی بھی بُری اور زیادہ دوستی بھی بُری۔ لیجئے جس جواب پر یہ لوگ اتنے خوش ہوئے تھے اس کو میں نے خود ہی مجروح کر دیا۔ بخلاف پہلے جواب کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے پالنے سے منع کیا ہے کہ اس جواب پر کوئی جرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب اگر کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع فرمایا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو ہم سے اس سوال کا کوئی حق نہیں یہ سوال اگر تمہارے اندر ہمت ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر لینا ایک جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے اور وہ قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اس سے یہ سوال کرنے کا کسی کو حق نہیں کہ یہ قانون کیوں وضع ہوا۔ اور اگر کوئی ایسا بے ہودہ سوال کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں عالم قانون ہوں واضع قانون نہیں ہوں۔ یہ سوال تم کو پارلیمنٹ یا مجلس واضعان قانون سے کرنا چاہیئے اور جج کے اس جواب کو تمام عقلاء معقول سمجھتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہی جواب اگر علماء دیں تو وہ معقول نہ ہو۔ ان پر جرح قدح کیوں کی جاتی ہے۔ علماء نے اس کا کب دعویٰ کیا ہے کہ ہم واضع قانون ہیں۔ بلکہ وہ تو صاف کہتے ہیں کہ ہم صرف قانون کے

جاننے والے ہیں ہم سے یہ سوال تم کر سکتے ہو کہ یہ قانون کہاں ہے ہم تم کو قرآن یا حدیث یا فقہ میں وہ قانون دکھلا دیں گے باقی وضع قانون کی علت کو ہم نہیں جانتے یہ سوال واضع قانون سے کرو۔ اور واضع قانون حق تعالےٰ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی واضع نہیں ہیں آپ بھی صرف مبلغ ہیں آپ کی تو یہ شان ہے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(آپ کا فرمان فرمودہ خدا ہے اگرچہ وہ فرمان ایک اللہ کے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلا ہے۔)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے علمار کی یہ حالت ہے ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

(پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ان احکام میں حکمت نہیں ہے۔ حکمت ہے اور ضرور ہے اور بعض کو علما جانتے بھی ہیں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو بتلا بھی دیں۔ ہمارے پاس گنی ہے مگر ہم تم کو نہیں دیتے کسی کا کیا اجارہ ہے۔ غرض ہم واضع قانون نہیں ہیں جو قانون کی علتیں بتلانا ہمارے ذمہ ضروری ہو، ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے سود کو حرام کیا ہے اس لئے وہ حرام ہے اگر یہ سوال کرو کہ کہاں حرام کیا ہے اس کا جواب البتہ ہمارے ذمہ ہے ہم کہدیں گے حق تعالےٰ نے فرمایا ہے وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ تعالیٰ نے بیع حلال کیا اور سود کو حرام کیا) میں اوپر یہ بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے سود کے حرام ہونے کی علت یہ سمجھی تھی کہ اس میں بے مروتی ہے سو یہ علت علت نہیں، کیونکہ اس طرح تو ہر تجارت میں بے مروتی ثابت کی جا سکتی ہے بلکہ اصل علت وہی ہے جو میں نے بتلائی بعض لوگ اپنی طرف سے احکام کی علتیں تراش کر غلہ کی تجارت کو حرام

سمجھنے لگے سو یہ بالکل غلط ہے۔ غلہ کی تجارت ویسی ہی ہے جیسے اور چیزوں کی تجارت اس میں کچھ حرج نہیں رہا یہ کہ اس میں گرانی کا انتظار ہوتا ہے سو میں کہتا ہوں کہ گرانی کا طبعی انتظار ہونے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ ہاں زیادہ گرانی کی دعا مانگنا یا تمنا کرنا بُرا ہے باقی اپنے نفع کی دعا کرنا یہ جائز ہے گو اس میں گرانی کی تمنا بھی لازم آتی ہے اور فقہائے جو احتکار کو منع کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں غلہ کا روکنا جبکہ بستی میں غلہ ملتا ہی نہ ہو اور لوگوں کو تکلیف ہونے لگے اس وقت حرام ہے اور اگر دکانوں پہ غلہ ملتا ہو تو روکنا حرام نہیں ہے۔ غرض یہ جو مشہور ہے کہ نفع کی امید میں بھی غلہ کا روکنا حرام ہے یہ صحیح نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے اپنی طرف سے علتیں گھڑ گھڑ کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر رکھا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے غلہ کی تجارت بالکل نکل گئی اور صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہے، اگر آج وہ مسلمانوں کے ہاتھ غلہ بیچنا موقوف کر دیں تو وہ نہایت پریشان ہو جائیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر شہر اور گاؤں اور قصبہ میں غلہ کی تجارت کرنے والے مسلمان بھی ہونے چاہئیں تاکہ کسی وقت مسلمانوں کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ غرض اسی حکمت و حلت کا اول تو علماء ہی کو معلوم ہونا ضرور نہیں پھر اگر معلوم بھی ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہیں بتلاتے بھلا اگر تم ڈاکخانہ میں جا کر بابو سے یہ پوچھو کہ ایک تولہ کا محصول کیا ہے اور وہ تم کو بتلادے کہ تین پیسے محصول ہے پھر تم اس سے یہ سوال کرو کہ تین پیسے محصول ہونے کی کیا وجہ تو وہ اس کے جواب میں کیا کہے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ صاحب میں قانون کے مطابق کام کرنے والا ہوں اگر تم تین پیسے سے کم کا ٹکٹ لگاؤ گے میں لفافہ کو بیرنگ کر دوں گا، آگے میں کچھ نہیں جانتا کہ اس کی وجہ کیا ہے اور کیا نہیں ہاں اگر تم کو میرے کہنے کا اعتبار نہ ہو تو میں تم کو قواعد ڈاک کی کتاب میں دکھلا سکتا ہوں کہ ایک تولہ کا محصول وہی ہے جو میں نے بتلایا اس سے زیادہ تم مجھ سے سوال نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ ڈاکخانہ کا بابو یہ جواب دیدے تو سب اس کو تسلیم کر لیں اور علماء کے ایسے ہی جواب کو تسلیم نہ کیا جاوے۔ آخر دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے

مگر آج کل تو ہر شخص دین کے بارہ میں اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے کہ اپنی عقل سے علتیں گھڑ کر اُن پر احکام کا مدار سمجھتے ہیں چنانچہ بعض کا مقولہ سنا گیا ہے کہ نماز کے لئے وضو اس لئے فرض کیا گیا تھا کہ اہل عرب اونٹوں کے چرانے والے وحشی لوگ تھے ان کے منہ پر غبار اور ہاتھ پیر پر پیشاب کی چھینٹیں بھی پڑتی تھیں اس لئے ان کو حکم کیا گیا کہ نماز سے پہلے وضو کیا کرو چنانچہ وضو میں انہی اعضاء کا دھونا فرض بھی کیا گیا جو اکثر کام کاج میں ملوث ہو جاتے ہیں باقی ہم لوگ تو مہذب ہیں اکثر اوقات دستانہ اور موزے چڑھائے رہتے ہیں پھر شیشہ دار مکانوں میں بیٹھے رہتے ہیں ہمارے ہاتھ پیروں کو گرد بھی نہیں پہونچتی اس لئے ہم پر وضو فرض نہیں۔ یہ دلیل ویسی ہی ہے جیسے ایک سرحدی پٹھان نے بیان کی تھی۔ ایک سرحدی ریل سے اترا تو اس کی بغل میں دو من کا ایک بورا بھی تھا جس کی بلٹی وغیرہ اس نے کچھ نہ کرائی تھی جب ٹکٹ دینے لگا تو بابو نے کہا کہ اس بورے کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ بلٹی کیا ہوتا ہے بابو نے کہا کہ اس سامان کا ٹکٹ اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھا دیا جو پہلے دکھایا تھا۔ بابو نے کہا یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے اس کا ٹکٹ لاؤ وہ کہنے لگا کہ نہیں یہی ٹکٹ ہمارا ہے اور یہی ٹکٹ اس کا ہے بابو لے کہا کہ پندرہ سیر سے زیادہ سامان کے لئے دوسرا ٹکٹ ہونا چاہیئے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہی پندرہ سیر ہے ریلوے نے پندرہ سیر کا جو قانون مقرر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر سامان آدمی بلا تکلف خود اٹھا سکے وہ معاف ہے اور ہندوستانی آدمی پندرہ سیر ہی اٹھا سکتا ہے اس لئے اس نے پندرہ سیر لکھدیا اور ہم دو من اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارا یہی پندرہ سیر ہے تو کیا اس جواب کو ریل بابو تسلیم کر سکتا ہے ہرگز نہیں وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کا راز کچھ نہیں جانتے ہمارے پاس کتاب میں یہی قانون لکھا ہوا ہے کہ پندرہ سیر سے جو زیادہ ہو اس کی بلٹی ہونی چاہیئے جس میں ہندوستانی اور کابلی کی کوئی تخصیص یا استثنا نہیں ہے۔ اور اس کے اس جواب کو تمام مہذب لوگ صحیح مانیں گے اسی طرح ہم اس دلیل کے جواب میں کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے وضو کو فرض کیا ہے جس میں مہذب اور دیہاتی کا کوئی فرق نہیں ہے اس لئے

وضو ہر شخص پر فرض ہے، ہم تم کو قرآن میں عام حکم دکھلا سکتے ہیں اس سے آگے ہم
کچھ نہیں جانتے ہم کو خبر نہیں کہ اس حکم کی علت کیا ہے۔ یہ مضمون اس پر بیان ہوا
تھا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرر سے بچنے کے لئے یا کسی دنیوی منفعت کے لئے
تعویذ وغیرہ کرنا مطلقاً جائز ہے خواہ اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو یہ بالکل
غلط ہے۔ اور میں نے یہ بیان کیا تھا کہ دنیوی مضرت کا اعتبار نہیں اصل مضرت حق تعالےٰ
کی ناراضی ہے۔ مگر اس کو لوگ ہلکا سمجھتے ہیں یہ خیال کر لیا ہے کہ ابھی حق تعالیٰ سے
ملاقات تھوڑا ہی ہو رہی ہے گناہ کر کے توبہ کر لیں گے پھر پاک صاف ہو کر حق تعالےٰ
سے مل لیں گے میں کہتا ہوں کہ اول تو حق تعالےٰ سے ملنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں شاید
ہمیں نفس نفس واپسیں بود (یہی سانس آخری سانس ہو) اور اگر تم کو ایسا ہی زندگی پر
بھروسہ ہے تو یہ کونسی عقلمندی ہے کہ توبہ کے سہارے گناہ کا ارتکاب کیا جائے اسکی
تو بعینہ وہ مثال ہے جیسے کوئی تریاق کے بھروسہ سنکھیا کھانا چاہے یا منتر جاننے کی وجہ
سے سانپ سے کٹوانا چاہے کہ زہر کھا کر تریاق کھا لوں گا یا سانپ کے کاٹنے کے بعد
منتر سے جھاڑ لوں گا۔ تو کیا جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں وہ ایسا بھی کر سکتے
ہیں۔ ہرگز نہیں۔ علاوہ اس کے حق تعالےٰ کے ساتھ محبت کا تعلق بھی تو ہے تو کیا اس کا
مقتضا یہی ہے۔ صاحبو! اگر کسی عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب فلاں کام سے
ناراض ہے تو کیا اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ابھی تو محبوب کی ملاقات میں دیر ہے
لاؤ اس کام کو کر لوں۔ صاحبو! عاشق سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا اس کی محبت ہرگز محبوب
کے خلاف رضا کام کرنے کی اجازت نہ دے گی گو ملاقات میں کتنی ہی دیر ہو بلکہ گو
ملاقات بھی ہونے والی نہ ہو پھر افسوس ہے کہ حق تعالےٰ کے ساتھ ہم اس کے خلاف
برتاؤ کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پوری محبت ہی نہیں ہے تو اس صورت میں شکایت
اور زیادہ ہو گئی کہ ہم کو بیوی اور بال بچوں سے تو کیسی محبت ہے۔ ایک ادنیٰ حسین
صورت سے ہم کو کیسا تعلق ہو جاتا ہے اور حق تعالےٰ سے ہم کو اس درجہ کی محبت نہ
ہو جو کہ جلال و جمال و کمال و نوال میں سب سے زیادہ کامل ہے اور جو کچھ دوسروں میں ہے

سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر چوں داری ز رب ذو المنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدون

(اے شخص تجھ کو بیوی بچوں سے صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہ سے تجھ کو کیسے صبر آگیا جب تجھ کو دنیائے حقیر سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالےٰ سے تجھ کو کیسے صبر آگیا)

اور گو نفس محبت تو ہے مگر دوسروں کی محبت نے اسے مغلوب کر رکھا ہے اس لئے ناراضئ حق کی گرانی کا ہم کو احساس نہیں ہوتا ۔ جب آدمی کو سانپ ڈس لیتا ہے تو اُس کو نیم کے پتے تلخ نہیں معلوم ہوتے ۔ اسی طرح ہم کو دنیا کے سانپ نے ڈس رکھا ہے اس لئے ناراضی خداوندی کی تلخی ہم کو محسوس نہیں ہوتی ، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم کو رضائے الٰہی کی حلاوت ہی کا ادراک نہیں ہوا اس لئے ناراضی کی تلخی کا بھی احساس نہیں ہوتا اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا یعنی ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد سے معلوم ہوا کرتی ہے ۔ حضرات اہل اللہ کو رضاء الٰہی کی حلاوت معلوم ہو چکی ہے ۔ اس لئے وہ ناراضی کی تلخی کو بھی محسوس کرتے ہیں سالک کے دل میں تعلق مع اللہ کی ایک حلاوت ہوتی ہے نسبت مع اللہ کی وجہ سے ایک نور ان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے جس کے فقدان سے اُن کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

جب ان کی قلبی کیفیت میں ذرا سی بھی کمی ہوتی ہے تو اُن کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے دوسروں کو ناراضئ الٰہی کا احساس کیونکر ہو دل تو پہلے ہی سے کالا توا ہو رہا ہے دل میں تعلق مع اللہ کا نور پیدا کرو اس وقت سمجھو گے کہ ناراضئ حق کی تلخی کیسی ہوتی ہے

پھر خود بخود یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی اصلی مضرت خدا کی ناراضی ہے۔ اُس کے سامنے دنیا کے منافع اور مضرتوں کی کچھ حقیقت نہیں چنانچہ اس مسئلہ کو قرآن شریف میں بہت صاف طور پر حل کردیا گیا ہے: ارشاد فرماتے ہیں یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۗ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت سوال کرتے ہیں (کہ یہ حلال ہیں یا حرام) آپ فرمادیجئے کہ ان دونوں میں ایک گناہ (ہے مگروہ) بڑا (گناہ) ہے اور لوگوں کے لئے منافع متعدد ہیں۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اس لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیئے تو حق تعالےٰ اس شبہ کا اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں کے لئے نفع بھی ہے اور ایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغۂ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالےٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ استعمال فرمایا یعنی منافع للناس اور مضرت کے بیان میں صیغۂ واحد لایا گیا یعنی اثمٌ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اٰثامٌ ہوتا مگر نہیں حق تعالےٰ نے اس جگہ صیغۂ واحد ہی اختیار فرمایا جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے کہ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا ہی سی ہو بڑی دولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اللہ تعالیٰ کی رضا بہت بڑی چیز ہے) اسی طرح خدا تعالیٰ کی ناراضی بھی بڑی وبال کی چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو اسی لئے گو اس جگہ اثمٌ بصیغۂ واحد لایا گیا مگر اس کو کَبِیْرٌ کی ساتھ موصوف کردیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے

ان سب منافع کو گاؤ خورد کر دیا ہے اسی لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر زہر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے، اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جاوے۔ اس لئے فرماتے ہیں وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (ان دونوں کا گناہ ان کے منافع سے زیادہ ہے) اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیا کے نفع و نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہدیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے یہ تو نفع کی چیز ہے چنانچہ تعویذ و عملیات میں بہت لوگ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس عمل سے کسی کو نفع ہوتا ہو وہ جائز ہے، خواہ اس میں شیاطین سے استعانت ہو یا کیسے ہی بیہودہ کلمات استعمال کرنے پڑتے ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شراب اور جوئے کی نسبت حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لئے ایک نفع نہیں بلکہ بہت سے منافع ہیں مگر پھر بھی یہ حرام ہیں کیوں محض اس لئے کہ خدا ان کو پسند نہیں فرماتے وہ ان سے ناراض ہوتے ہیں۔ اب یہ مسئلہ بالکل حل ہو گیا کہ حرمت کا مدار خدا تعالیٰ کی ناراضی پر ہے پس معلوم ہو گیا کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے) کا حکم گناہوں میں نہیں گناہ کسی نیت سے بھی ہو جائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ بعض اعمال نیت کے بغیر موجب ثواب نہیں ہوتے جیسے مباحات اور بعض بغیر نیت کے صحیح ہی نہیں ہوتے جیسے نماز روزہ وغیرہ چنانچہ اگر کوئی شخص نماز کی صورت بنالے لیکن نماز کی نیت نہ کرے تو وہ نماز نہیں ہے۔ یہاں سے میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں اگرچہ اس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن صرف اس لئے بیان

کرتا ہوں تاکہ تنگی کے وقت لوگ اپنے ایمان کو محفوظ کرلیا کریں اور کفر سے بچ جاویں
وہ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ کوئی بے نمازی نمازیوں میں جا پھنستا
ہے نماز کا وقت آگیا اور سب لوگ نماز کے لئے تیار ہو گئے اب یہ بے نمازی آدمی بڑا
پریشان ہوتا ہے نماز نہ پڑھے تو سب اُس کو ملامت کرتے ہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور
نماز پڑھتا ہے تو یہ مصیبت ہے کہ اس کو غسل جنابت کی ضرورت ہے سب کے سامنے
غسل کرے تو زیادہ بدنامی ہوتی ہے اب ایسی صورت میں یہ بے نمازی بدنامی
سے بچنے کے لئے نماز میں شریک ہو جاتا ہے، اور فقہار نے لکھا ہے کہ بے وضو نماز
پڑھنا کفر ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں اگر کوئی ایسا شخص نماز پڑھے تو اُس کو
چاہیئے کہ نماز کی نیت نہ کرے بلکہ بدون نیت کے نماز کی نقل کرتا رہے اس طرح
یہ شخص کفر سے بچ جاوے گا اگرچہ ترک نماز کے گناہ کی ساتھ دھوکا دینے کا بھی
گناہ ہوگا کہ لوگ اس کو نمازی سمجھیں گے اور ہے بے نمازی مگر کفر سے تو بچ جاویگا
دیکھئے شریعت میں کس قدر رعایت ہے کہ مجرم بھی اس سے محروم نہیں ہے پھر بھی
افسوس ہے کہ لوگ شریعت کو تنگ بتلاتے ہیں مگر خدا کے واسطے اس ترکیب سے
ہمیشہ کام نہ لینا اور نہ اس حالت میں امامت کرنا، ورنہ سارے نمازیوں کی نماز
کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔ غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہیئے، اگر کوئی شخص
بدنامی سے بچنے کے لئے بے وضو ہی نماز میں شریک ہو تو اس کو کفر سے بچنے کیلئے
نماز کی نیت نہ کرنا چاہیئے۔ آج کل بہت آدمی ایسے ہیں جو ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے
ہیں مگر وہ بے وضو ہی پڑھاتے ہیں، یا بلا عذر ارکان کو اڑا دیتے ہیں اور افسوس یہ کہ
ایسے لوگ مقتدا اور لیڈر بھی ہو جاتے ہیں چنانچہ آجکل ایک لیڈر ہیں جو پہلے تو بے نمازی
ہی تھے مگر اب چند روز سے نمازی ہو گئے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اسٹیشن
پر اُتر کر موٹر میں سوار ہوئے نماز کا وقت تھا تو موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے آپ نے نماز شروع
کردی حالانکہ موٹر کھڑا ہوا تھا پاس زمین موجود تھی اتر کر نماز پڑھ سکتے تھے مگر اُن کی
بلا اُترے انہوں نے موٹر ہی میں نماز شروع کر دی۔ انہیں لیڈر کا ایک قصہ یہ ہے

کہ ایک مرتبہ نماز کا وقت آیا پانی موجود نہ تھا تیمم کی ضرورت ہوئی آپ کو تیمم کا طریقہ تو معلوم نہ تھا اور کسی سے پوچھا اس لئے نہیں کہ لیڈر اور مقتدا ہو کر کسی سے پوچھنا عیب کی بات ہے لوگ کہیں گے کہ یہ اچھا لیڈر ہے جسے تیمم کا قاعدہ بھی معلوم نہیں۔ غرض خود ہی تیمم شروع کر دیا سب سے پہلی حرکت تو آپ نے یہ کی کہ مٹی لیکر ہاتھ کو ملی جس طرح پانی کو ملا کرتے ہیں حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر مٹی کو جھاڑ کر پھر ملنا چاہیئے شریعت نے بدن کو بھبوت ملنے سے منع کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ ہے جس سے انسان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ سبحان اللہ کس قدر رعایت ہے کہ تمہاری صورت بھی بگاڑنا نہیں چاہتے تو ان لیڈر صاحب نے اول تو مٹی کو پانی کی طرح ہاتھ پر بہایا پھر منہ میں بھی مٹی دی گویا آپ نے مٹی سے کلی کرنا چاہا۔ اس پہ سب لوگ ہنس پڑے اور سب کو اُن کی جہالت معلوم ہو گئی اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ وہ پہلے چپکے سے ایک آدمی سے پوچھ لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے اگر جہالت ظاہر ہوتی تو ایک ہی آدمی پر ظاہر ہوتی یا دوسروں کے تیمم کو دیکھ لیتے مگر آپ نے اجتہاد سے کام لیا جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ بالکل ہی جاہل ہے اس پر بھی وہ مسلمانوں کے پیشوا اور لیڈر بنے ہوئے ہیں ایک اور صاحب کی حکایت ہے کہ انھوں نے سفر میں مغرب کی نماز پڑھائی تو دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت کی، کہنے لگے کہ میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ ایک صاحب نے سفر میں مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی جب امام تیسری رکعت کے لئے اٹھنے لگا تو یہ حضرت سلام پھیر کر بیٹھ گئے بعد میں لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ غرض آجکل کثرت سے اس قسم کے بھی نمازی ہیں کہ ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے ہیں مگر یہ معلوم وہ کیا کیا گڑبڑ کرتے ہیں ہر شخص اپنے اجتہاد سے کام لیتا ہے مسائل سیکھنے سے آر آتی ہے ساری خرابی تکبر کی ہے۔ اگر کسی ملا سے چند اردو ہی کے رسائل پڑھ لیا کریں تو یہ رسوائی نہ ہو، اور یہ شکایت عوام ہی کی نہیں بلکہ بعض مولوی بھی جو معقول وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں ایک مولوی صاحب جو آجکل بڑے لیڈر مشہور ہیں ابتدا میں وہ ایک عربی مدرسہ میں ملازم ہوئے تھے۔ معقول میں تو بڑی مہارت تھی مگر دین سے ایسے ناآشنا کہ اسی زمانہ میں اُن کی شادی ہوئی

جب گھر سے مدرسہ میں آئے تو آپ کے ہاتھوں کو مہندی لگی ہوئی تھی۔ غرض بعضے مولوی بھی جاہل ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بعض جاہل مولوی مشہور ہو جاتے ہیں کیونکہ مولوی اصل میں وہ ہے جو اللہ والا ہو اور اللہ والا آدمی شریعت سے جاہل نہیں ہو سکتا مگر آجکل جہاں کسی نے عربی کی دو چار کتابیں پڑھ لیں اسے مولوی کہنے لگتے ہیں چاہے اُسنے محض معقول و ادب ہی پڑھا ہو اور دینیات کا ایک سبق بھی نہ پڑھا ہو حالانکہ یہ شخص حقیقت میں مولوی ہی نہیں۔ اگر معقول پڑھنے سے آدمی مولوی ہو جایا کرے تو ارسطو و جالینوس سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ لوگ معقول کے امام ہیں حالانکہ ان کے موحد ہونے میں بھی کلام ہے اور اگر ادب پڑھنے اور عربی میں گفتگو کر لینے اور تحریر لکھ لینے سے مولوی ہو جایا کرے تو ابولہب اور ابوجہل سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ لوگ بہت بڑے عربی داں اور فصیح و بلیغ تھے تو محض معقول و ادب سے انسان مولوی نہیں ہو سکتا مگر آج کل ان کو بھی مولوی مشہور کر دیتے ہیں اور یہ مرض اوپر ہی سے چلا آتا ہے چنانچہ ملّا محمود جونپوری اپنے زمانہ میں بڑا فاضل مشہور تھا حالانکہ وہ محض ایک فلسفی آدمی تھا علوم شریعت میں اُسے مہارت نہ تھی مگر مشہور بہت ہو گیا تھا حتیٰ کہ شاہ دہلی نے اس کو طلب فرمایا اور بہت اعزاز و اکرام کیا، ایک ملّا بادشاہ کے یہاں پہلے سے مقرب تھے اُن کو فکر ہوئی کہ اگر ملّا محمود کی دال گل گئی تو پھر ہماری پوچھ کم ہو جائے گی اس لئے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی موقعہ پر ملّا محمود کا جاہل ہونا بادشاہ پر ظاہر کیا جائے۔ خشک مولویوں میں یہ مرض حسد وغیرہ کا ہوا کرتا ہے چنانچہ ایک دن کوئی جنازہ آیا اور لوگوں نے ملّا سے کہا کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو انہوں نے ملا محمود سے کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز نہیں پڑھا سکتا آپ پڑھا دیں، ملا محمود نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد مجبور ہو کر آگے بڑھے اُن ملا نے کان میں کہہ دیا مجمع زیادہ ہے ذرا قرأت بلند آواز سے پڑھے اَللّٰہُ اَکْبَر کہکر انہوں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ باواز بلند پڑھنا شروع کر دی لوگوں نے نماز توڑ دی اور ایک شور مچ گیا کہ یہ کون جاہل ہے جسے جنازہ کی نماز بھی نہیں آتی غرض

مصلے پر سے پیچھے ہٹائے گئے اور سب لوگوں میں ان کی جہالت کا چرچا مشہور ہوگیا میں یہ بیان کر رہا تھا کہ اگر کوئی بے نمازی نمازیوں میں پھنس جاوے تو اس کو نماز کی نیت نہ کرنا چاہیئے کیونکہ بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے اسی طرح فقہا نے لکھا ہے کہ حرام مال پر بسم اللہ کہنا کفر ہے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ایک مفسر نیچری نے ایک تفسیر لکھی ہے جس کی اس جماعت میں بڑی شہرت ہے مگر اللہ کے بندہ نے اپنی تمہید میں بسم اللہ تک نہیں لکھی بس جہاں سے قرآن شروع ہوا ہے وہیں بسم اللہ ہے مفسر کی تمہید بسم اللہ سے شروع نہیں ہوئی اس تفسیر کا ایک جواب البرہان ہے بہت ہی عمدہ جواب ہے اس میں بطور لطیفہ کے اس کی ایک عجیب وجہ بیان کی ہے لکھا ہے کہ ہمارے احباب میں اس کی توجیہ میں اختلاف ہے، بعض کی یہ رائے ہے کہ تقلید ملاحدۂ یورپ اس کا سبب ہے بعض کی یہ رائے ہے کہ مخالفت اہل اسلام اس کا باعث ہے مگر ہمارے نزدیک ان دونوں توجیہوں کی ساتھ ایک تیسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مفسر کو پہلے سے یہ معلوم ہے کہ میں اس تفسیر میں جو کچھ لکھوں گا سب شریعت کے خلاف ہوگا اور فعل حرام پر بسم اللہ کہنا کفر ہے اس لئے مفسر نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے تمہید میں بسم اللہ نہیں لکھی خوب لطیفہ ہے گو مفسر کو خود بھی نہ سوجھا ہو غرض شریعت نے حرام مال کھانے حرام مال سے صدقہ کرنے میں بسم اللہ پڑھنے سے اور امید ثواب رکھنے سے منع کیا ہے اس مسئلہ کو سن کر بعض لوگ گھبرائے ہوں گے کہ ہمارے تو اکثر مال مشتبہ ہوتے ہیں پھر ان کو استعمال کرتے ہوئے بسم اللہ کہنے سے اگر ایمان جاتا رہا تو سارے بے ایمان ہی ہوئے میں کہتا ہوں کہ وہم مت کرو اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مال یقینی حرام ہو اس میں بسم اللہ کہنا منع ہے جیسے کوئی شخص رشوت کا روپیہ لیتے ہوئے بسم اللہ کہے یہ کفر ہے باقی جس مال میں حرام و حلال دونوں ملے ہوئے ہوں اور حلال غالب ہو وہ یقینی حرام نہیں وہ مشتبہ ہوگیا اس میں بسم اللہ کہنا حرام نہیں مگر بسم اللہ کہنے سے اس کی کراہت زائل نہ ہوگی جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت اور سود کے روپے میں سے کچھ خیرات کر دیا جاوے تو باقی حلال ہوجاتا ہے یہ بھی بالکل غلط ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

بلکہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ حرام مال کے صدقہ کرنے میں کفر کا خوف ہے غرض کوئی حرام کام کسی نیت سے یا بسم اللہ کہنے سے جائز نہیں ہو جاتا بلکہ ایسے کاموں سے خدا کا نام لینے سے ایمان پر اندیشہ ہے کیونکہ اس میں خدا کے نام کی بے تعظیمی ہے جیسے کوئی شخص پاخانہ جانے کے وقت بسم اللہ کہنے لگے فقہاء نے اس کو کفر لکھا ہے۔ اور وہ جو حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں جاتے ہوئے بسم اللہ کہو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاخانہ کی حد سے باہر بسم اللہ کہو یہ مطلب نہیں کہ اندر جا کر کہو خوب یاد رکھو۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں خبیث شیاطین ہوتے ہیں جب آدمی ننگا ہوتا ہے تو وہ اس کے بدن کو دیکھتے ہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ستر کو شیاطین سے چھپانے کے لئے ان کو یہ تعلیم فرمائی کہ پاخانہ میں جانے سے پہلے بِسْمِ اللهِ أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (یا اللہ میں پناہ پکڑتا ہوں آپ کی گندے مردوں سے اور گندی عورتوں سے) کہہ لیا کرو۔ اس کے بعد نہ وہ تمہارے بدن کو دیکھ سکیں گے نہ ایذا دے سکیں گے یہ سب مضمون نماز کو بلا وضو یا بلا نیت پڑھنے کے متعلق استطراداً آ گیا تھا اس سے اوپر اصل مضمون یہ تھا کہ جس نفع میں حق تعالیٰ کی ناخوشی ہو وہ نفع ہی نہیں۔

دیکھو اگر کسی عاشق کے پاس سونا چاندی بھرا ہوا ہو مگر محبوب کی نظر میں نہ آتا ہو تو کیا عاشق اس کو نفع کی چیز سمجھے گا۔ نفع کی چیز وہی ہے جو محبوب کو بھا جاوے ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت
زر و خاک یکساں نماید برت

(جب تمہارے محبوب کی نظر میں تمہارا زر نہیں آتا۔ تو تمہارے نزدیک زر و خاک برابر ہے)

اسی طرح مسلمان کے لئے نفع کی چیز وہی ہے جس سے خدا راضی ہو۔ اور جس چیز سے خدا راضی نہ ہو وہ ہرگز نفع کی چیز نہیں اگر تمہارے پاس سلطنت بھی ہو مگر خدا راضی نہ ہوا تو وہ کچھ بھی نہیں تم خدا کو راضی رکھو اس کے احکام کا اتباع کرو خواہ سلطنت ہو یا نہ ہو رضائے الٰہی سے اگر تم کو یہاں سلطنت نصیب بھی نہ ہوئی تو آخرت میں تمہاری ہی سلطنت ہوگی

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

اور وہ ایسی مستحکم ہوگی جس کو کوئی دشمن تم سے چھین نہیں سکتا، ہاں اگر خدا کو راضی رکھ کر تم کو دنیوی منفعت بھی حاصل ہو جاوے تو وہ خدا کی نعمت ہے، اسی طرح باطنی احوال اگر ذاکر کو پیش نہ آدیں مگر حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو وہ نفع میں ہے اور اگر حالات و کیفیات کسی درجہ کی پیش آدیں مگر اعمال مرضیٔ حق کے خلاف ہوں تو وہ سب ہیچ ہیں۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا مقولہ ہے بر ہوا پری مگسے باشی بر آب روی خسے باشی۔ دل بدست آر کہ کسے باشی۔ یہ نظم نہیں بلکہ نثر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہوا میں اڑنے لگے تو کیا ہوا ایک مکھی کے برابر ہوئے کیونکہ مکھی بھی ہوا میں اڑتی ہے اور اگر پانی پر چلنے لگے تو ایک تنکے کے برابر ہو گئے۔ پس یہ امور کوئی کمال نہیں۔ اب کمال یہ ہے۔ دل بدست آر کہ کسے باشی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ محبوب کو راضی رکھو اس وقت تم آدمی ہو گے۔ یہاں سے سالکین کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جن خوارق و کیفیات کے وہ دل دادہ ہوتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود رضائے محبوب ہے اگر رضائے حق حاصل ہے تو کشف و کرامت گو نہ ہو تو کیا ہے اور اگر یہ نہیں تو ہزار کشف و کرامات گو ہو تو کیا ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے اتباع احکام سے۔ پس اصل مقصود اس کو سمجھو اسی لئے مجھ کو احوال سے زیادہ اعمال کا اہتمام ہے میں اس کو نہیں دیکھتا کہ ذاکر پر حالات و کیفیات وارد ہوتے ہیں یا نہیں۔ میری نظر زیادہ اس پر ہوتی ہے کہ اس کو اعمال کا بھی اہتمام ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ منافع چاہے ظاہری ہوں یا باطنی سب غیر مقصود ہیں اصل مقصود رضائے حق ہے اس کا طالب ہونا چاہیئے۔ میں یہ مضمون سحر کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ نفع کی نیت سے حرام عمل جائز نہیں ہو جاتا پس سفلی عمل تو اپنی حقیقت ہی کے اعتبار سے گناہ ہے گو نیت کیسی ہی اچھی ہو مگر علوی عمل بھی مطلقاً جائز نہیں اگر کوئی علوی عمل پڑھے تو اس کو دیکھنا چاہیئے کہ نیت کیا ہے، اگر مباح کام کے واسطے پڑھا ہے تو جائز ہے جیسے حلال نوکری کے واسطے پڑھے یا کوئی شخص مقروض ہو وہ ادائے قرض کے واسطے عمل پڑھے اور اگر مثلاً

کسی اجنبی عورت کو مسخر کرنے کے واسطے پڑھتا ہے تو حرام ہے۔ اگر بلا نکاح ہی مسخر کرنا مقصود ہے تب تو حرام ہے اور اگر نکاح کے لئے مسخر کرنا ہے تب چونکہ اس سے نکاح کرنا اس کے ذمہ واجب نہیں ہے وہ بھی جائز نہیں ہے ہاں اگر کسی کی بیوی نافرمان ہو اس کے مسخر کرنے کے واسطے عمل پڑھے تو جائز ہے۔ اسی طرح کسی عورت کا شوہر ظالم ہو اس کا مسخر کرنا بھی۔ لیکن بعض افراد اس کے بہت نازک ہیں اکثر لوگ ان کو علی الاطلاق جائز سمجھتے ہیں مگر فقہاء نے ان کو بھی حرام لکھا ہے۔ مثلاً کوئی عورت اپنے شوہر کو تابعدار بنانے کے واسطے عمل پڑھے تو اس میں تفصیل ہے اگر وہ ادائے حقوق میں کمی کرتا ہو تو اس درجہ کے حاصل کرنے کے واسطے جائز ہے اور اگر حقوق ادا کرتا ہے تو محض عاشق و مفتوں بنانے کے واسطے عمل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کسی امیر آدمی کے واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہم کو پچاس روپے دیدے ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی امیر پر ہمارے روپے آتے ہوں اور وہ ٹالتا ہو اس وقت اگر علوی عمل اس غرض سے پڑھا جائے کہ وہ ہمارا قرض ادا کردے تو جائز ہے لیکن محض اس واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہمارا مسخر ہو جائے کہ جب ہم ملاکریں وہ ہم کو پچاس روپے دیدے یہ بالکل حرام ہے خواہ اس کے لئے عمل کیا جائے یا تصرف کے طور پر توجہ کیجائے دونوں حرام ہیں مگر اس کو لوگ عموماً حرام نہیں سمجھتے بلکہ اس کو تو مشائخ کے کمالات میں بیان کیا کرتے ہیں کہ ہمارے حضرت نے ایک عمارت بنانا شروع کی تھی اس میں ہزار روپے کی ضرورت تھی بس ایک رئیس حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے ذرا سی توجہ اس کے اوپر ڈالی فوراً ہزار روپے کا نوٹ نذر کر دیا بڑے ہی صاحب تصرف ہیں۔ یاد رکھو کہ جو شیخ ایسا ہو وہ راہزن ہے ڈاکو ہے۔ توجہ ڈال کر کسی سے روپے وصول کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈرا دھمکا کر چھین لینا کیونکہ توجہ دینے سے وہ شخص بالکل مجبور ہو جاتا ہے اور محض توجہ کے دباؤ سے نذر پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کا مال بدون طیب قلب کے لینا ہرگز جائز نہیں اس مقام پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ توجہ کی حقیقت اور مسمریزم کی حقیقت ایک ہی ہے بس اتنا فرق ہے کہ اگر کوئی بزرگ اپنی

نفسانی سے کام لینے لگے اس کو اصطلاح میں توجہ کہتے ہیں۔ اور ایک آوارہ آدمی قوت نفسانی سے کام لے اسے مسمریزم کہتے ہیں باقی حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے کہ دونوں میں نفسانی قوت اور خیال سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ توجہ کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ایک فاسق فاجر بلکہ کافر شخص بھی توجہ سے اثر ڈال سکتا ہے اس کا مشق پر مدار ہے۔ اور بعض لوگ فطری طور پر بدون مشق ہی کے صاحب تصرف ہوتے ہیں یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ جو کام کافر بھی کر سکے وہ مسلمان کے واسطے کمال کیونکر ہو جائے گا۔ مجھے ساری عمر میں ایک شخص ایسے ملے ہیں جو اس حقیقت کو بخوبی سمجھے۔

شاہجہاں پور میں ایک شیخ صاحب سمع تھے بہت مخلص آدمی تھے عقائد بھی عمدہ تھے صرف اتنی کسر تھی کہ صاحب سمع تھے لیکن دوکان دار نہ تھے صاحب دل آدمی تھے۔ ایک بار میرے پاس اُن کا خط آیا کہ ایک شخص میرا دشمن تھا مجھے بہت ستاتا تھا ایک دن میرے مُنہ سے اُس کے حق میں بددعا نکل گئی کہ الٰہی اس کو ہلاک کر دے۔ اسی عرصہ میں وہ ہلاک ہو گیا۔ بے شک سچ ہے ؎

بس بتجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(اس دنیا میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جس شخص نے کسی اہل اللہ کا دل دکھایا وہ ہلاک ہوا)

اہل اللہ کا دل دکھانا بڑے وبال کا سبب ہے غیرتِ حق ایک دن ضرور اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں بھی آیا ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ جو میرے دلی سے عداوت کرے اس کو میں اپنی طرف سے اعلانِ جنگ دیتا ہوں پھر جس کو حق تعالیٰ الٹی میٹم دیں اس کا کہاں ٹھکانا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیقِ ادب — بے ادب محروم ماند از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

(خدا تعالیٰ سے ہم ادب کی توفیق کی درخواست کرتے ہیں۔ بے ادب فضل ربی سے محروم ہوتا ہے بے ادب تنہا خود ہی اپنے ساتھ برائی نہیں کرتا بلکہ اور لوگ بھی اس کی بُرائی سے رنج اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ جب کسی کی پردہ دری کرتے ہیں تو اس کا میلان نیک لوگوں کی طعنہ زنی پر کرتے ہیں۔)

غرض ان بزرگ نے لکھا کہ میں نے بد دعا کی تھی جس کے بعد وہ شخص ہلاک ہوگیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ واقعہ اگر کسی دوسرے کو پیش آتا تو وہ اپنے مریدوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارتا کہ دیکھو ہماری بد دعا سے ہلاک ہوگیا۔ بھلا ہماری بد دعا خالی جا سکتی تھی اگر ان بزرگ میں اس کے بجائے دوسری حالت پیدا ہوئی انھوں نے لکھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہیں مجھے قتل کا گناہ نہ ہوا ہو۔ سبحان اللہ خوف خدا کی یہی شان ہوتی ہے میرے اوپر اس خط کا بہت اثر ہوا اور اس سوال سے مجھے سائل کی بہت قدر ہوئی کیونکہ ایسا سوال عمر بھر مجھ سے کسی نے نہ کیا تھا اور سوال بھی ایسے واقعہ کا جو ظاہر میں منشأ کرامت کے معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جواب لکھا کہ واقعی آپ کا اندیشہ درست ہے مگر اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ بد دعا کے وقت دو حالتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ محض سرسری طور پر حق تعالیٰ سے درخواست کردی اور اپنے دل کو اور خیال کو اس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا اس صورت میں اگر وہ شخص ہلاک ہوجائے تو یہ بد دعا کرنے والا قاتل تو نہ ہوگا کیونکہ بد دعا سے ہلاک ہونے میں اس کا دخل نہیں بلکہ اس میں محض حق تعالیٰ سے درخواست ہے اور حق تعالیٰ اپنی مشیت سے اس کو ہلاک کرنے والے ہیں پس یہ شخص قاتل تو نہیں البتہ وہ شخص اگر بد دعا کے قابل تھا تب تو گناہ بھی نہیں ہوا اور اگر بد دعا کے قابل نہ تھا تو قتل کا تو گناہ نہیں ہوا مگر بد دعا کرنے کا گناہ ہوا اس سے توبہ و استغفار کرنا لازم ہے۔ اور ایک صورت بد دعا کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کرنے کے ساتھ اپنے دل کو بھی اُس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ کیا اور اپنے تصرف سے کام لیا، اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر

اس شخص کو تجربہ سے اپنا صاحب تصرف نہ ہونا معلوم ہے مثلاً بارہا تصرف کا قصد کیا مگر کچھ نہیں ہوا اس وقت بھی قتل کا گناہ نہیں ہوا۔ البتہ اگر وہ شرعاً قابلِ قتل نہ تھا تو اس کی ہلاکت کی تمنا کا گناہ ہوگا اور اگر تجربہ سے اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم ہے تو یہ شخص قاتل ہے کیونکہ تلوار سے قتل کرنا اور تصرف سے قتل کرنا برابر ہے صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قتل عمد ہے اور یہ قتل شبہ عمد اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ شخص جس کے ہلاک کرنے کے واسطے تصرف کیا گیا ہے قتل کا مستحق تھا یا نہیں۔ اگر مستحق قتل تھا تو صاحب تصرف قاتل تو ہوا مگر گناہ نہیں ہوا کیونکہ تصرف کا استعمال اپنے محل میں ہوا۔ اور اگر مستحق قتل نہ تھا تو صاحب تصرف کو قتل کا گناہ ضرور ہوا۔ اس صورت میں اس کو علاوہ دیت کے ایک غلام کا آزاد کرنا اور اگر اس کی وسعت نہ ہو تو دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں اور توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ توجہ کی کیا حقیقت ہے یاد رکھو کسی کو توجہ سے ہلاک کرنا یا ضرر پہونچانا علے الاطلاق جائز نہیں بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو میں نے بیان کی مگر آجکل تو اس کو کمال سمجھا جاتا ہے کسی کو بھی اس طرف التفات نہیں ہوتا کہ اس میں بعض دفعہ گناہ بھی ہوتا ہے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو محض توجہ کی تھی ہم نے قتل کہاں کیا سو خوب سمجھ لو کہ توجہ سے قتل کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسے تلوار سے قتل کرنا اسی لئے ایسے مواقع میں توجہ سے بچنا چاہیئے اگر کوئی شخص توجہ کا مشاق بھی نہ ہو اسے بھی ایسے مواقع میں توجہ سے کام نہ لینا چاہیئے کیونکہ بعض لوگ فطرۃً صاحب تصرف ہوتے ہیں گو اس کو خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ تم اپنے آپ کو صاحب تصرف نہ سمجھتے ہو مگر واقع میں تم صاحب تصرف ہو تو اگر اس حالت میں تم نے کسی کو ضرر پہونچانے کا قصد کیا اور وہ اس کا مستحق نہ ہوا اور ضرر پہونچ گیا تو تم کو گناہ ہوگا اور یہی حکم عملیات سے ہلاک کرنے کا ہے۔ چنانچہ ایک عمل کچی اینٹ کا ہے کہ جس کو ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے اس کے واسطے ایک کچی اینٹ پر عمل پڑھتے ہیں پھر اس کو کفن وغیرہ دے کر اس پر نماز جنازہ پڑھ کر ندی میں ڈال دیتے ہیں۔ پانی سے وہ اینٹ گھلنا شروع ہوتی ہے جوں جوں وہ گھلتی ہے اسی قدر یہ شخص گھلنا شروع ہوتا ہے

یہاں تک کہ جب وہ اینٹ بالکل گھل جاتی ہے یہ شخص بھی گھل گھل کر ہلاک ہوجاتا ہے
یہ بہت ہی سخت عمل ہے سو خوب سمجھ لو کہ اگر وہ شخص مستحق قتل نہ ہوگا تو تم کو قتل کا گناہ
ضرور ہوگا۔ بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ ہم نے تو قرآن سے مارا ہے پھر ہمیں گناہ
کیوں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایک بڑا بھاری قرآن کسی کے سر پر مار دو جس سے
اس کا سر پھٹ جاوے اور مرجاوے تو کیا تم کو گناہ نہ ہوگا ضرور ہوگا۔ پس علوی
عملیات میں ایک بات تو یہ دیکھنے کے قابل ہے کہ مقصود جائز ہے یا نہیں دوسرے
یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کلمات طیب ہیں یا نہیں اگر علوی عمل میں خبیث الفاظ نہ ہوں مگر
طیب بھی نہ ہوں وہ بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے موکلوں کے عجیب عجیب
نام گھڑ رکھے ہیں کلکائیل، دردائیل اور اسی طرح اس کے قافیہ پر بہت سے
نام ہیں اور غضب یہ کہ ان ناموں کو سورۂ فیل کے اندر ٹھونسا ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ
فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ یَا کَلْکَائِیْلُ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ
یَا دَرْدَائِیْلُ وَعَلٰی ھٰذَا الْقِیَاس۔ یہ سخت واہیات ہے اول تو یہ نام ہی بیڈھنگے
ہیں نہ معلوم کلکائیل کہاں سے ان لوگوں نے گھڑا ہے۔ بس یہ لوگ رات دن کل کل
ہی میں رہتے ہوں گے پھر ان کو قرآن کی سورتوں میں ٹھونسنا یہ دوسرا بیڈھنگا پن ہے
اور نہ معلوم یہ مؤکل ان لوگوں نے کہاں سے تجویز کئے ہیں۔ محض خیالات ہیں اور کچھ
بھی نہیں اس کا مصداق معلوم ہوتے ہیں اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطَانٍ (یہ نرے نام ہی نام ہیں جن کو تم نے
اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھیرالیا ہے خدا تعالےٰ نے تو ان کی کوئی دلیل نہیں بھیجی)

موکل پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک وکیل صاحب گھر میں اپنی والدہ کے
پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ باہر سے ایک شخص نے ان کو آواز دی وکیل نے پوچھا کہ کون
ہے وہ کوئی دیہاتی آدمی تھا جس نے ان کو اپنے مقدمہ میں وکیل بنایا تھا اس نے
کہا اجی میں تھا تمہارا مؤکل یہ سنکر وکیل صاحب باہر جانے لگے۔ اُن کی والدہ نے
ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو وہ تو مؤکل ہے تم کو مار ڈالے گا۔ انہوں نے سمجھایا کہ

یہ عملیات کا موکل نہیں بلکہ اس نے مجھے وکیل بنایا ہے اُسے بھی موکل کہتے ہیں بغرض بڑے اصرار کے بعد والدہ نے اجازت دی اور کہا اچھا جاؤ خدا حافظ۔

اسی طرح ایک عمل بچھو کا ہے۔ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡ یہاں تک پڑھ کر پانی پیتے ہیں پھر حَرۡ کہتے ہیں پھر دم کرتے ہیں نہ معلوم یہ کونسا طریقہ ہے۔ بچپن میں ہم نے بھی ان عملیات کو لکھ لیا تھا مگر کبھی ان پر عمل نہیں کیا صرف بچھو کا عمل ایک آدھ بار غلطی سے کیا اللہ تعالے معاف فرمادے۔ سو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہیئے کہ عملیات علویہ میں الفاظ طیب ہوں قرآن کے الفاظ کو لگاڑا نہ گیا ہو۔ ایک بات عملیات میں قابل لحاظ یہ ہے کہ جو عملیات دنیا کے واسطے ہوتے ہیں وہ موجب ثواب نہیں ہوتے ان میں ثواب کا اعتقاد رکھنا بدعت ہے۔ اسی طرح ایسے عملیات کو مسجد میں بیٹھ کر نہ پڑھنا چاہیئے اور نہ اس قسم کے تعویذ مسجد میں بیٹھ کر لکھنے چاہئیں کیونکہ یہ یا تو تجارت ہے اگر تعویذ پر اجرت لی جائے جس کو مسجد سے باہر ہی کرنا چاہیئے۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ جو مدرس اور ملّا بچوں کو تنخواہ لے کر پڑھاتا ہو اس کو مسجد میں نہ بیٹھنا چاہیئے کیونکہ مسجد میں اجرت کا کام کرنا بیع و شرار میں داخل ہے۔ اسی طرح جو شخص اجرت پر کتابت کرتا ہو یا جو درزی اجرت پر کپڑے سیتا ہو یہ سب لوگ مسجد میں بیٹھ کر یہ کام نہ کریں۔ (قُلۡتُ اِلَّا اَنۡ یَّكُوۡنَ مُعۡتَكِفًا فَیَجُوۡزُلَهٗ ذٰلِكَ كَمَا هُوَ مُقۡتَضِیۡ قَوَاعِدھم واللّٰهُ اَعۡلَمُ ۱۲ جامع) (بجز معتکف کے پس معتکف کے لئے مسجد میں یہ کام جائز ہیں جیسا کہ فقہاء کے قواعد کا مقتضیٰ ہے) اور اگر اپنے لئے عمل پڑھا جاوے تو تجارت تو نہیں مگر ہے دنیا کا کام وہ بھی مسجد میں نہ چاہیئے اس نکتہ پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے متنبہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ مسجد میں پاخانہ پھر رہا ہوں حاجی صاحب نے فوراً ارشاد فرمایا کہ تم مسجد میں کوئی عمل دنیا کے واسطے پڑھتے ہو گے اس نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کے واسطے مسجد میں وظیفے نہ پڑھنا چاہئیں تو علوی عملیات

کے جائز ہونے کے لئے اتنے شرائط ہیں یہ مسائل آپ نے کبھی نہ سنے ہوں گے اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کسی محقق عالم کو لپسٹ جاؤ اور اس سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو اس کی بہت ضرورت ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا بغرض ان شرائط کے ساتھ تعویذ و عملیات وغیرہ سحر حلال ہیں یہ چیزیں مطلقاً سحر حلال میں داخل نہیں ہیں جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا اس پر سحر حلال و سحر حرام کی تقسیم کا بیان یہاں تک طویل ہوگیا لیکن یہ سب مضامین ضروری تھے۔ ان کا بیان فائدہ سے خالی نہیں۔ اب میں پھر اصل قصہ کی طرف لوٹتا ہوں یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا اور وہ لوگ سحر حرام ہی میں مبتلا تھے جس کا ذکر وَ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ میں کیا گیا ہے اس میں عورتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عورتوں کا سحر زیادہ قوی اور موثر ہوتا ہے اور اس میں ایک راز ہے جو کہ فلسفی مسئلہ پر مبنی ہے وہ راز یہ ہے کہ سحر و عملیات وغیرہ کی تاثیر کا مدار توجہ اور قوت خیال پر ہے الفاظ و کلمات کا اس میں زیادہ دخل نہیں۔ مگر چونکہ بدون قیود کے خیال میں قوت اور یکسوئی نہیں پیدا ہوتی اس لئے کچھ کمالات والفاظ اس کے لئے مقرر کر لئے جاتے ہیں اور عامل کے ذہن میں یہ بات جمادی جاتی ہے کہ ان الفاظ ہی میں یہ اثر ہے جس سے اس کا خیال مضبوط ہو جاتا ہے کہ جب میں یہ الفاظ پڑھوں گا فوراً اثر ہوگا۔ چنانچہ اثر ہو جاتا ہے لیکن در اصل وہ خیال کا اثر ہوتا ہے الفاظ کا نہیں ہوتا لیکن یہ اعتقاد مقصود عامل کو مضر ہوتا ہے اگر عامل یہ سمجھنے لگے کہ ان الفاظ میں کچھ تاثیر نہیں تو اس کے عمل کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا کیونکہ اس اعتقاد کے بعد اس کا خیال کمزور ہو جائے گا کہ نہ معلوم اثر ہوگا یا نہیں اس لئے عامل کے واسطے یہ جہل مرکب ہی مفید ہوتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ الفاظ میں اثر نہیں بلکہ اس کا مدار توجہ پر ہے۔ پھر بعضے آدمی تو فطری طور پر متصرف ہوتے ہیں ان کو اپنے خیال میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خاص اہتمام اور زیادہ مشق کی ضرورت نہیں ہوتی اور بعضے مشق سے صاحب تصرف ہو جاتے ہیں،

چنانچہ ایک مرتبہ ایک طلسمی انگوٹھی ہندوستان میں بہت شائع ہوئی تھی جس میں غائب غائب اور مردہ آدمیوں کی تصویریں نظر آتی تھیں اس کا مدار بھی محض خیال پر تھا اسی لئے اس میں یہ شرط تھی کہ اُس انگوٹھی کو کوئی عورت یا بچہ دیکھتا رہے تو اس کو صورتیں نظر آدیں گی تو اس میں راز یہی تھا کہ تم نے کسی آدمی کا تصور کیا اور اس کا خیال جمایا تمہارے تخیل کا اثر انگوٹھی دیکھنے والے کے خیال پر پڑا اس کو وہی صورتیں نظر آنے لگیں اور اگر تم کسی کا تصور نہ کرو بلکہ یہ خیال جمالو کہ اس کو کوئی صورت نظر نہ آدے تو اس کو ہرگز ایک صورت بھی نظر نہ آئے گی۔ کانپور میں ایک مولوی صاحب نے کچھ مشق کی تھی جس سے غائب لوگوں کی صورتیں دکھادیا کرتے تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی آدمی آیا اور اس نے درخواست کی مجھے فلاں شخص کی صورت دکھادو۔ انہوں نے اس سے کہا کہ جاؤ وضو کر کے حجرہ میں جا بیٹھو ادھر انہوں نے گردن جھکا کر توجہ کی تھوڑی دیر میں اسے کچھ بادل وغیرہ نظر آتے تھے پھر اس شخص کی صورت نظر آجاتی تھی۔ اس کی بھی یہی حقیقت تھی کہ وہ مولوی صاحب توجہ سے دوسرے کے خیال پر اثر ڈالتے تھے جس کی وجہ سے اس کے متخیلہ میں وہ صورت پیدا ہوجاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان مولوی صاحب کی مجلس میں ایک طالب علم بیٹھے تھے ایک شخص آیا اور اس نے درخواست کی کہ مجھ کو فلاں بزرگ کی صورت دکھلا دیجئے وہ حسب معمول ادھر متوجہ ہوگئے اس طالب علم نے چپکے چپکے یہ آیت پڑھنی شروع کی قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گذرا ہوا اور واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے) تو اس شخص کو پہلے پہل کچھ مقدمات نظر آنے لگے تھے جب اس طالب علم نے یہ آیت پڑھنی شروع کی تو وہ بھی سب غائب ہوگئے۔ اب وہ بزرگ پوچھتے ہیں کہ کچھ نظر آیا اس نے کہا کہ جو کچھ نظر آیا تھا وہ بھی سب غائب ہوگیا اور صورت تو کیا نظر آتی غرض انہوں نے بڑا ہی زور لگایا مگر خاک بھی نظر نہ آیا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تو بات کیا تھی کہ اس طالب علم نے جب ان کے خیال کے خلاف خیال جمایا دونوں میں تصادم ہوگیا اور کچھ

بھی اثر نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان عملیات اور سحر وغیرہ کا مدار محض خیال پر ہے اسی لئے معمول کسی بچہ یا عورت کو بناتے ہیں کیونکہ ان میں عقل کم ہوتی ہے ان کو جو کچھ سمجھا دیا جاتا ہے وہ ان کے خیال میں جم جاتا ہے اور اسی خیال کے مطابق صورتیں نظر آنے لگتی ہیں عاقل پر اثر کم ہوتا ہے کیونکہ اُسے وہم آتے رہتے ہیں کہ دیکھئے ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ کم عقل ذاکر پر احوال وکیفیات کا ورود زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس کو یکسوئی زیادہ ہو جاتی ہے اور احوال وکیفیات کا ورود یکسوئی کی حالت میں زیادہ ہوتا ہے۔ عاقل پر ورود وکیفیات کم ہوتا ہے کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے جس ذاکر کو کیفیات پیش نہ آویں وہ غمگین نہ ہو بلکہ خوش ہو کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عاقل ہے۔ دوسرے جو لوگ کشف وغیرہ کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں ان کی ساتھ شیطان تمسخر بھی کیا کرتا ہے۔ بعض اکابر نے لکھا ہے کہ شیطان کو تخیل میں تصرف کرنے کی بڑی قدرت حاصل ہے وہ خیالی آسمان ذاکر کو دکھلا دیتا ہے اس میں نور اور تجلی اور فرشتے سب کچھ نظر آتے ہیں جس کو یہ ذاکر جو کیفیات وکشف وغیرہ کا معتقد ہے حقیقی آسمان اور سچ مچ کے فرشتے سمجھنے لگتا ہے اس لئے محققین نے لکھا ہے کہ کشف کا راستہ بہت خطرناک ہے اس میں شیطان کو دھوکہ دینے کا بہت موقع ملتا ہے۔ اسی کو عارف شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است
ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

(عشق کے راستے میں شیطان کے بہت سے وساوس ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگاؤ)

بعض لوگ حافظ کو رندہ بتلاتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے آنکھیں ہی نہیں حافظ کے کلام میں سلوک کے مسائل بکثرت ہیں اور یہ نہیں کہ یہ مسائل محض اعتقاد کی وجہ سے ہم نے کلام سے نکال لئے بلکہ واقعی ان کا کلام تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

ورنہ کسی دوسرے کے کلام سے تو کوئی یہ مسائل نکال دے بات یہ ہے کہ جب تک اللہ کچھ نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی نکال بھی نہیں سکتا۔ تو حافظ فرماتے ہیں کہ اس راستہ میں شیطان کے وسوسے بہت ہیں۔ بس سالک کو ہوشیار رہو کر پیام سروش کی طرف کان لگائے رہنا چاہیئے۔ پیام سروش سے مراد ہاتف نہیں ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں اور اپنے دل میں خوش ہوں کہ اس سے تو کشف پر اعتماد کرنے کی تعلیم حاصل ہوئی نہیں بلکہ یہاں سروش سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور پیام سروش سے مراد وحی ہے جو کہ جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے نازل ہوتی تھی مطلب یہ ہوا کہ وحی کا اتباع کرنا چاہیئے پھر شیطان کے وساوس کارگر نہوں گے۔ غرض کشف میں یہ خطرے ہیں اور جس کو کشف ہی نہ ہوتا ہو اس کو شیطان کیا دھوکے دیگا جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سحر وغیرہ کا مدار تخیل پر ہے تو اب سمجھیئے کہ عورتوں کا تخیل مردوں سے بڑھا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اول تو ان کو عقل کم ہوتی ہے اور کم عقل آدمی کو جو کچھ بتلا دو وہ اس کے خیال میں جلدی جم جاتا ہے اسے جانب مخالف کا وہم ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے ان کی معلومات بھی بہ نسبت مردوں کے کم ہوتی ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ جس کی معلومات کم ہوتی ہیں اس کا خیال زیادہ منتشر نہیں ہوتا مگر آجکل نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی بھی کوشش ہے کہ عورتوں کے معلومات وسیع کیئے جائیں اور ان کو علوم و فنون کی تعلیم دی جائے۔ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں مگر اس تعلیم کا ضرور مخالف ہوں جو یہ لوگ عورتوں کو دیتے ہیں، بھلا عورتوں کو جغرافیہ اور تاریخ پڑھانے سے کیا فائدہ۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ عورتوں کو ابتک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہمارے شہر میں کتنے محلے ہیں اور ضلع میں کتنے شہر ہیں اور کون راستہ کدھر کو جاتا ہے اسی لئے اب تک وہ اپنے گھر میں مقید رہنا پسند کرتی تھیں لیکن آپ ان کو دنیا بھر کے نقشے اور راستے بتلائے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بھاگنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے سو واقعی میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی کہ عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں کیا فائدہ ہے۔ ان کا تو کمال یہی ہے کہ اپنے شہر

اور اپنے گھر کے سوا انہیں کچھ نہ معلوم ہو۔ عورتوں کی تعلیم کے لئے دینی مسائل سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں۔ اگر تاریخ پڑھائی جائے تو محض بزرگوں کے حالات پڑھانے چاہئیں جس کا اثر ان کے اخلاق پر بھی اچھا ہو مگر آج کل تو ان کو دنیا بھر کے قصے پڑھائے جاتے ہیں جس کا بہت ہی برا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں نیک عورتوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ غافل ہوں چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ جو لوگ پاکدامن غافل مسلمان عورتوں کو متہم کرتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے۔ غافلات کا مطلب یہ ہے کہ وہ چالاک نہیں ہیں نشیب و فراز سے بے خبر ہیں تو صاحبو! عورتوں کا تو کمال یہی ہے کہ وہ اپنے گھر اور اپنے شوہر کے سوا تمام دنیا سے بے خبر ہوں اور یہ وصف عورتوں میں فطری ہوتا ہے مگر لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے ایک بزرگ کی حکایت بیان کرتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ بہلی میں سفر کر رہے تھے اور وہ خود نہایت حسین تھے اور گاڑی بان ایسا بدشکل اور بدصورت تھا کہ خدا کی پناہ راستہ میں اس گاڑی بان کا گھر آگیا اور اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اس کی بیوی آواز سنتے ہی آئی جس وقت دفعۃً اس بزرگ کی نگاہ پڑی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ چاند نکل آیا نہایت ہی حسین تھی۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ عورت تو ایسی حسین وجمیل اور اس کا مرد ایسا بدصورت یہ اس کو منہ بھی لگاتی ہے یا نہیں۔ اِن کو اپنے حسن پر بہت ناز تھا انہوں نے سوچا کہ دیکھوں یہ عورت میری طرف بھی نظر کرتی ہے یا نہیں مگر اس اللہ کی بندی نے ایک نگاہ بھر کر بھی یہ نہ دیکھا کہ گاڑی میں کون ہے کون نہیں اُس کی ساری توجہ اپنے شوہر ہی کی طرف تھی اور اسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی یہاں تک کہ بہلی آگے بڑھ گئی اور وہ اپنے گھر میں چلی گئی۔ وہ صاحب کہتے تھے کہ اس کی یہ عفت دیکھ کر بہت ہی دل خوش ہوا کہ پاکدامن ایسی ہونی چاہیئے جو ایسے بدصورت خاوند سے بھی خوش ہو اور دوسروں کو مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ سو میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں یہ وصف فطری ہے مگر ہم لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں افسوس اس جوہر کی نگہبانی نہیں کی جاتی۔

پس عورتوں کو اگر تعلیم دی جائے تو سب سے پہلے ناولوں اور خراب قصوں کا داخلہ اپنے گھر میں بند کرو ان ناولوں کی بدولت شریف گھرانوں میں بڑے بڑے قصے ہوچکے ہیں۔ دوسرے عورتوں کو لکھنا مت سکھاؤ اور اگر بقدر ضرورت سکھاؤ تو اس کا بہت اہتمام رکھو کہ وہ نامحرموں کے نام خط نہ لکھیں بعض عورتیں اپنے بہنوئی اور چچا زاد بھائی اور ماموں زاد بھائی کے نام خطوط روانہ کرتی ہیں اس کی پوری بندش کرنی چاہیئے اور بعضی عورتیں محلہ والیوں کے خطوط لکھدیا کرتی ہیں اس سے بعض دفعہ مرد کو لکھنے والی سے تعلق ہوجاتا ہے جس سے بہت فتنہ پھیلتا ہے۔
اس لئے عورتوں کو خوب تاکید کردو کہ محلہ بھر کے خطوط نہ لکھا کریں اور ایک اس کا اہتمام کرو کہ اپنے محارم کے نام بھی خطوط لکھیں تو کارڈ اور لفافہ پر پتہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھیں بلکہ پتہ اپنے گھر کے مردوں سے لکھانا چاہیئے۔ ایک جگہ ایسا قصہ پیش آیا کہ ایک عورت نے پتہ اپنے ہاتھ سے لکھا وہ خراب ہوگیا تو لفافہ کو دھویا جس سے مہر مشتبہ ہوگئی اور ڈاکخانہ والوں نے اس پر مقدمہ قائم کردیا اس وقت بڑی دقت پیش آئی کہ پردہ نشین عورت کو عدالت میں کھچنا پڑے گا آخر اس کے ایک عزیز نے اپنے اوپر بات لی اور عدالت میں کہا کہ یہ خط میں نے بھیجا تھا اور پتہ میں نے لکھا تھا۔
اس نے خیال کیا کہ اگر مقدمہ قائم ہو تو میرے اوپر قائم ہو میں قید بھگت لوں گا مگر پردہ نشین عورت کی تو بے عزتی نہ ہو۔ اس لئے میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ عورتیں اپنے ہاتھ سے پتہ ہرگز نہ لکھیں تو اگر کسی کو عورتوں کی تعلیم کا بہت ہی شوق ہو تو اس کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غرض چونکہ عورتوں کی معلومات عموماً وسیع نہیں ہوتی اس لئے ان کا تخیل صحیح اور کامل ہوتا ہے اور سحر کا مدار تخیل ہی پر ہے۔ اس لئے عورتوں کا سحر زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس لئے والنفثٰت فی العقد (یعنی اور بالخصوص گنڈے کی گرھوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والوں کے شر سے) میں عورتوں کی تخصیص کی گئی تو یہود سحر حرام میں بہت مبتلا تھے ان کی عورتیں بھی سحر جانتی تھیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا جہلا ر یہود تو سحر میں مبتلا تھے ہی مگر علماء نے بجائے

اس کے کہ اس کو حرام اور کفر کہتے اور عوام کو اس سے منع کرتے الٹا اس کو ہاروت و ماروت کا علم بتا کر ایک آسمانی علم اسے بنا دیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ عالم جب بگڑتا ہے تو بہت دور جاتا ہے عالم ہر چیز کو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچا کر رہتا ہے چنانچہ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ دین تو علماء کے ہاتھ میں ہے جس طرف چاہیں موڑ دیں جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس کو چاہیں حلال گویا ان کے قبضہ کی بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عوام اگر ایسا کہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں۔ واقعی بعض اہل علم ایسا ہی کرتے ہیں تو یہود کے علماء کی یہی حالت تھی کہ انہوں نے سحر کو ہاروت و ماروت کا علم بتایا اور اس کے متعلق ایک عجیب قصہ زہرہ کا انہوں نے گھڑ لیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عجائب پرست تھے۔ لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے نئے نئے انداز سے قصے گھڑتے تھے تاکہ ذرا مجلس میں رنگ آجاوے چنانچہ آجکل یہی مذاق ہمارے واعظین کا ہے یہ لوگ ایسا غضب کرتے ہیں کہ وعظ کا رنگ جمانے کے لئے بہت ہی بعید از عقل حکایات بیان کرتے ہیں چونکہ عوام آجکل عجائب پرست زیادہ ہیں اس لئے ایسے وعظوں کو پسند کرتے ہیں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب وعظ میں نئی نئی باتیں ہونی چاہئیں جو کبھی سنی بھی نہ ہوں۔ پرانی باتوں کو دہرانے سے لطف نہیں آتا میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ لطف پرانی ہی باتوں میں ہے۔ چاہے ان کو کتنی ہی بار بیان کیا جاوے مگر اس کا لطف اہل سلامت ہی کو حاصل ہوتا ہے جو تحقیق حق کے طالب ہیں اور عجائب پرست نہیں ہیں اور جن کی فطرت سلیمہ نہیں ان کو تو طلسم ہوش ربا میں لطف آئے گا پرانی باتوں میں کیا لطف آئے گا۔ دیکھئے قرآن کا طرز یہی ہے کہ اس میں بعض مضامین کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن میں متعدد جگہ مذکور ہوا ہے مگر ہر جگہ نئے انداز اور نئے طرز سے بیان ہوا ہے تو یہی طریقہ وعظ کا ہونا چاہیے کہ وہی پرانی باتیں مختلف طرز سے بیان کی جائیں موقع کے مناسب مضامین ذکر کئے جائیں ان پرانی باتوں میں وہ لطف ہے جیسے کہا گیا ہے ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ترجمہ: اگرچہ میں بوڑھا اور کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں لیکن تیری صورت دیکھتے ہی جوان ہو جاتا ہوں)

ان سے دل میں نور اور تازگی پیدا ہوتی ہے اور ان نئی نئی حکایات سے ظلمت بڑھتی ہے۔ وعظ تو وہی ہے جس میں بدعت نہ ہو اور یہ نئی باتیں تو بدعت ہیں چنانچہ حلال روزی طلب کرنے کے متعلق واعظین ایک قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک شخص کو حلال کی طلب تھی لوگوں نے اس سے کہا کہ آج کل حلال روزی ایک شخص کے پاس ہے جو بصرہ میں رہتا ہے اس کے سوا حلال روزی یقینی طور پر کسی کی نہیں چنانچہ وہ بصرہ پہنچا اور اُن بزرگ سے ملا اور اُن سے اپنا قصہ بیان کیا کہ میں حلال کی طلب میں آپ کے پاس آیا ہوں میں نے سُنا ہے کہ آپ کی روزی بالکل حلال ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ بزرگ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ اب تک تو میری روزی بلا شبہ حلال تھی لیکن اب نہیں رہی کیونکہ میرے بیل ایک شخص کے کھیت میں گھس گئے تھے اس کے کھیت کی مٹی اُن کے پیروں کو لگ گئی اور وہ مٹی میرے کھیت میں مل گئی اب مجھے شبہ پیدا ہو گیا۔ سو یہ حکایت قواعد شریعت کے بالکل ہی خلاف ہے کیونکہ جتنی مٹی بیلوں کے پیروں کو لگی ہو گی وہ کوئی متقوم چیز نہیں جس سے شبہ پیدا ہو سکے یہ محض غلو فی الدین ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف کرے یعنی لوگوں سے پوچھتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا تو حاکم وقت کو چاہیئے کہ اس شخص کو سزا ہے تعزیر دے کیونکہ ایک دانہ متقوم نہیں ہے جس کی تعریف کی جائے تو یہ شخص حدود شریعت سے تجاوز کرتا ہے۔ غرض یہ حکایت سراسر خلاف شریعت ہے مگر واعظین اس کو بڑے زور و شور کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور سننے والے بھی اس پر سبحان اللہ کہتے اور وجد کرتے ہیں مگر ان حکایات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ حلال روزی بہت دشوار ہے جو ہم کو نصیب نہیں ہو سکتی اس لئے وہ طلب حلال سے ہمت ہار دیتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے ایک خادم تھے۔ مولانا ان کے لئے

کوئی کھانا بھیجدیتے تو انہوں نے ایک بار عرض کیا کہ حضرت آپ تحقیق بھی کر لیتے ہیں کہ حلال ہے یا حرام۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ارے بھوکوں مر جائے گا بڑا حلال کھانے والا آیا جا کھا لیا کر جب ہمیں ایک مسلمان نے ہدیہ دیا اور ہم کو اس کی آمدنی کا حال معلوم نہیں تو مسلمان پر ہم کو اس بدگمانی کی کیا ضرورت ہے کہ اس کی آمدنی حرام ہوگی۔

گنگوہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شاہ صاحب مہمان ہوئے جو حلال روزی کھانے کا دعوٰے کرتے تھے اور بہت تفتیش کرتے تھے۔ حضرت کے یہاں سے ان کے لئے کھانا آیا تو واپس کر دیا اور کہا میں خالص حلال کھاتا ہوں مشتبہ مال نہیں کھاتا اور مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ کھانا کیسا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دل میں اس کے منتظر ہوئے ہوں گے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود آکر اس کھانے کی حقیقت بیان کریں گے کہ یہ کھانا اس قسم کی آمدنی سے تیار ہوا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں تب کھاؤں گا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایسے روگ نہیں پالتے تھے جب کھانا واپس گیا تو آپ نے فرمادیا کہ کھانا تو گھر میں رکھ لیا جاوے اور ان شاہ صاحب سے کہدیا جائے کہ خانقاہ میں جو گولر کھڑا ہے اس کے پھل بالکل حلال ہیں جس میں کوئی شبہ نہیں پس گولر توڑیں اور کھا دیں۔ خوب علاج کیا۔ اگر وہ شخص سچا طالبِ حلال ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر اُس کو تو محض تنگ کرنا اور اپنا نام کرنا مقصود تھا چنانچہ جاہلوں کو بہت تنگ کیا کرتا تھا اور وہ اس کی خوشامدیں کرتے اور تلاش کر کر کے اس کے لئے حلال کھانا لایا کرتے تھے مگر حضرت کے یہاں سے جب صاف جواب مل گیا تو آپ بہت خفا ہوئے اور دوسرے ہی وقت وہاں سے چلدیئے۔

تو صاحبو! یہ تقوٰی نہیں بلکہ تقوے کا ہیضہ ہے۔ شریعت نے اس قدر غلو سے منع کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ دردہ ہو جاؤ۔ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ بلکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تم کو بدون تجسس کے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کے یہاں بالکل حرام آمدنی ہے تو اس کے گھر کا کھانا مت کھاؤ اور اگر یہ

یہ معلوم ہو کہ اس کی کچھ آمدنی حرام ہے اور کچھ حلال تو اس کے گھر کا کھانا مشتبہ ہے جو فتوے کے اعتبار سے کھانا جائز ہے مگر احتیاط کرنا التقوٰی ہے اور اگر کسی کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہو تو تم کو یہ بدگمانی کی کچھ ضرورت نہیں اُس کو حلال ہی سمجھو مگر آجکل عوام کی نظر میں اس شخص کی ہیبت وقعت ہوتی ہے جو شریعت میں غلو کرے اور راز اس کا یہ ہے کہ غلو فی الدین سے امتیازی شان پیدا ہوتی ہے اور اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو اس سے کچھ امتیاز نہیں ہوتا شہرت اسی کام سے ہوتی ہے جو نیا ہو۔

گڑھی میں ایک شاہ صاحب آئے اُن کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی ان کی دعوت کرتا تو پہلے آپ مراقبہ کرتے۔ کبھی تو مراقبہ کرکے کہدیتے کہ تیرے یہاں آمدنی حلال نہیں اس لئے میں دعوت قبول نہیں کرتا۔ اور کبھی کہدیتے کہ ہاں تیری آمدنی حلال ہے تیری دعوت منظور ہے۔ لوگوں میں بڑی شہرت ہوئی کہ واقعی شاہ صاحب بڑے بزرگ ہیں۔ حرام آمدنی کبھی کھاتے ہی نہیں مراقبہ کرکے معلوم کرلیتے ہیں کہ آمدنی کیسی ہے مگر چند لوگ ہوشیار بھی تھے، انہوں نے کہا کہ شاہ صاحب کے مراقبہ کا امتحان کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض ظاہری آثار سے سمجھ لیتے ہوں کہ یہ شخص امیر ہے اور امیروں کے یہاں ایسی ہی گڑبڑ آمدنی ہوتی ہے اور فلاں شخص مزدور خستہ حال ہے اور غریبوں کے یہاں اکثر مزدوری کی آمدنی ہوتی ہے جس میں شبہ کم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا امتحان کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لوگ ایک کسبی کے یہاں گئے کہ تیرے پاس کوئی تازہ آمدنی کا روپیہ ہو تو ذرا ایک دو روز کے واسطے ہمیں دیدے چنانچہ اس نے تازہ آمدنی کا ایک روپیہ دیدیا وہ روپیہ ان لوگوں نے ایک مزدور غریب آدمی کو دیا کہ اس روپیہ سے تو شاہ صاحب کی دعوت کر چنانچہ وہ گیا اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آج میرے یہاں دعوت قبول کرلیجیے۔ شاہ صاحب نے حسب معمول مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر کہا کہ سبحان اللہ تمہاری آمدنی میں بڑا نور ہے بالکل حلال ہے تمہاری دعوت منظور ہے۔ لوگ سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کا مراقبہ

محض ڈھونگ ہی ہے جب وہ اس کے گھر پر گئے اور کھانا کھا چکے تو ان لوگوں نے کہا کہ شاہ صاحب ذرا پھر مراقبہ کر لیجئے کہ آپ نے جو کھانا کھایا ہے وہ حرام ہے یا حلال ۔ آپ نے پھر مراقبہ کیا اور کہا ماشاء اللہ اس کھانے میں بہت ہی انوار ہیں جس سے دل منور ہو گیا لوگوں نے جوتہ نکال کر شاہ صاحب کی خوب مرمت کی کہ جھوٹے مکار بس تیرے مراقبہ کا حال معلوم ہو گیا تو مخلوق کو دھوکہ دیتا اور پریشان کرتا ہے یہ کھانا جو تو نے کھایا ہے ایک کسبی کی آمدنی سے تیار ہوا ہے جس میں تجھے انوار نظر آتے ہیں ۔ واقعی خوب امتحان کیا ۔ مگر ایسے امتحان کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں، اکثر تو ان مکاروں کے دھوکہ ہی میں آجاتے ہیں اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ عوام کی مدح و ثنا سے کسی کا معتقد نہ ہونا چاہیئے یہ لوگ ہر اک کے معتقد ہو جاتے ہیں اور نہ خود مشائخ کو بھی عوام کی تعریف سے اپنا معتقد نہ ہونا چاہیئے جب تک کوئی صاحب نظر شہادت نہ دے کہ تمہاری اچھی حالت ہے صائب کہتے ہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر صاحب نظر کو دکھلاؤ عیسیٰ چند احمقوں کی تصدیق کرنے سے عیسیٰ نہیں ہوتے ہیں)

آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ جہاں چند لوگوں نے ہاتھ پیر چومنے شروع کر دیئے تو ہم خود بھی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں کہ واقعی میں کچھ تو ہوں جو یہ لوگ میرے ہاتھ پیر چومتے ہیں ۔ عوام کے اعتقاد کی بھی ایک ہی رہی ان کے اعتقاد کی تو یہ حالت ہے کہ گنگوہ میں ایک واعظ آیا جس کا شین قاف بھی درست نہ تھا ، جہنم کو جہندم کہتا تھا مگر عوام کے اعتقاد کی یہ حالت تھی کہ بعض لوگ یوں کہتے تھے کہ یہ شخص بہت ہی بڑا عالم ہے مولوی رشید کو بارہ برس پڑھا دے ۔ واقعی سچ کہا مولانا کو تو بارہ برس کے بعد بھی یہ لغات معلوم نہ ہوتے کہ وہ جہنم کو جہندم کہتے ۔ پس عوام کی تو حالت یہ ہے کہ جو شخص واہی تباہی قصے بیان کرتا ہو اس کے معتقد ہو جاتے ہیں چاہے اُسے خاک بھی

نہ آتا ہو۔

کانپور میں ایک واعظ آئے منبر پر بیٹھتے ہی انہوں نے یہ دعوے کیا کہ آج میں ایسی بات کہوں گا جو کسی نے نہ کہی ہو گی وہ یہ کہ خدا عالم الغیب نہیں ہے۔ اس پر چاروں طرف سے لوگ لاحول پڑھنے لگے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہ کر آپ نے یہ کہا کہ صاحبو! یہ بات سن کر آپ نے مجھے اپنے دل میں کافر و زندیق کہا ہو گا' مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے بعد آپ کہیں گے کہ میری بات سچّی ہے۔ بات یہ ہے کہ غیب کہتے ہیں پوشیدہ کو اور خدا تعالےٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں تو خدا تعالےٰ عالم الغیب کیونکر ہو سکتے ہیں۔ ان کو تو جس چیز کا بھی علم ہے وہ اُن کے سامنے ہے آپ نے یہ نکتہ بیان کیا اور اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ میری بات سچّی ہو گئی مگر یہ نہ سمجھے کہ اس سے قرآن کے ایک لفظ کو اس نے بیکار اور لغو بنا دیا۔ جب قرآن میں خدا تعالیٰ کی صفت عالم الغیب موجود ہے تو اس کا انکار کرنا کیونکر جائز ہو گا۔ اُسے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کی صفت جو عالم الغیب ہے وہ مخلوق کے اعتبار سے ہے کہ جو چیزیں مخلوق سے غائب ہے خدا تعالےٰ کو ان کا بھی علم ہے اور ذات خداوندی کے اعتبار سے علم کی ایک ہی قسم ہے یعنی علم حضوری۔ غرض آجکل واعظین کا مذاق وہی ہے جو یہود کا مذاق تھا کہ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو عوام کو حیرت میں ڈالدیں۔ اسی طرح آجکل کے واعظین شہادت نامہ خوب پڑھتے ہیں تاکہ لوگ روئیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ روایات صحیح ہوں یا غلط بس جو جی میں آیا بیان کر دیا کیونکہ ان کا مقصود تو محض رُلانا ہے۔ ایک شخص نے قل ہو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا آپ کو حیرت ہوئی ہو گی کہ قل ہو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ کا کیا جوڑ تھا۔ سُنیئے ان حضرت نے اس طرح جوڑ لگایا تھا کہ یہ وہ سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی جن کے نواسے میدانِ کربلا میں امت ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ بس پھر سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر بعضے سننے والے کہنے لگے کہ واہ کیا ربط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ربط نہیں بلکہ خبط ہے جس کی وجہ سے یہ ساری تقریر

قابلِ ضبط ہے۔ مگر ضبط کے معنے وہ نہیں کہ قلمبند کی جائے بلکہ مشہور معنے مراد ہیں یعنے یہ اس قابل ہے کہ اس کو ردی میں ڈال دیا جائے اشاعت بند کی جائے بھلا اگر اس کا نام ربط ہے تو ایک قل ہو اللہ کیا ہر سورت کی تفسیر میں تم شہادت نامہ کو بلکہ ہزاروں واقعات کو ٹھونس سکتے ہو۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا بھی یہی مذاق تھا جو آجکل ان واعظوں کا ہے اس لئے انہوں نے عوام کو خوش کرنے کے لئے عجیب وغریب قصّے گھڑ لئے تھے چنانچہ انہی میں سے ہاروت وماروت و زہرہ کا قصہ بھی ہے جس کو آجکل بھی بہت لوگ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ غضب کیا ہے کہ اس قصہ کو تفسیروں میں ٹھونس دیا ہے۔ مگر محدثین نقاد نے اس کو موضوع کہا ہے۔ وہ قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں بنی آدم کے اندر معاصی کی کثرت ہوئی تو فرشتوں نے طعن کیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفۃ اللہ بنائے گئے ہیں کہ گناہ کر کر کے خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں اور ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتے ہیں۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ انسان میں جو شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر وہ تمہارے اندر پیدا کر دیا جاوے تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم ہرگز گناہ نہ کریں گے بلکہ اس وقت بھی ہم اطاعت ہی کریں گے۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو سب سے زیادہ عبادت گذار ہوں چنانچہ ہاروت وماروت کو منتخب کیا گیا۔ خدا تعالےٰ نے ان دونوں میں شہوت کا مادہ رکھدیا اور زمین پر اُن کو اتارا اور حکم دیا کہ انسانوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا نہ شراب پینا اور نہ زنا کرنا نہ کسی آدمی کو ناحق قتل کرنا چنانچہ وہ دونوں دن بھر مقدمات کا فیصلہ کرتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے۔ اسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ان کے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا جو کہ نہایت ہی حسین جمیل تھی یہ دونوں اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے موافق فیصلہ کر دیا۔ پھر اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے کہا کہ ایک شرط سے میں راضی ہو سکتی ہوں

یا تو تم شراب پیو یا میرے شوہر کو قتل کر دو یا اس بت کو سجدہ کرو جو تمہارے سامنے ہے یا مجھ کو وہ اسم اعظم بتلا دو جس سے تم آسمان پر جاتے ہو اول تو انہوں نے انکار کیا مگر پھر نہ رہا گیا تو انہوں نے شراب پینے کو منظور کیا اور یہ سمجھا کہ یہ سب سے سہل گناہ ہے اس سے توبہ کر لیں گے چنانچہ شراب پی کر اس سے زنا کیا اور اسی مدہوشی کی حالت میں شوہر کو بھی قتل کر دیا اور بت کو سجدہ بھی کیا اور بے خبری کی حالت میں اس عورت کو اسم اعظم بھی بتلا دیا۔ وہ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ خدا تعالے نے اُسے ستارہ کی صورت میں مسخ کر دیا چنانچہ زہرہ ستارہ وہی ہے اور یہ دونوں فرشتے جب مستی سے ہوش میں آئے تو بڑے پریشان ہوئے شام کو آسمان پر جانے لگے تو ان کو روک دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کرو یا آخرت کا انہوں نے دنیا کے عذاب کو آسان سمجھ کر اختیار کیا۔ چنانچہ وہ دونوں بابل کے کنویں میں اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں جہاں ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور یہ دونوں فرشتے سحر بھی تعلیم کرتے تھے جس کی تعلیم کا ان کو حکم ہوا تھا تو یہ سحر انہی سے منقول چلا آتا ہے۔

اس قصہ کو سنکر وہ شخص جس کو حدیث سے ذرا بھی مس ہے فوراً موضوع کہے گا۔ اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اسرائیلیات میں سے ہے۔ دوسرے شرعی حیثیت سے اس میں بہت سے اشکالات ہیں ایک اشکال تو یہی ہے کہ فرشتے خدا تعالے کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتے کہ حق تعالے تو یہ فرمائیں کہ اگر تم میں شہوت پیدا کر دی جائے تو تم بھی انسانوں کی طرح گناہ کرنے لگو گے اور وہ خدا تعالیٰ کی بات کو رد کریں کہ نہیں ہم اس حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتے۔ فرشتے ہرگز اس طرح خدا کی بات کو رد نہیں کر سکتے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس زنا کی وجہ سے یہ فرشتے معذوب ہوئے وہ عورت کیوں نہ معذوب ہوئی وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر کیوں کر چلی گئی اور ایسی مقرب کیونکر ہو گئی۔ اور بہت سے اشکالات ہیں جن کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں

مگر بعض مفسرین نے تفاسیر میں اس واقعہ کو لکھ دیا ہے اس لئے بہت لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہر کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ کسی عالم کو تجویز کرو اس کو کتاب دکھلا کر جب وہ کہدے کہ یہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جن کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے وہ معتبر کتابیں نہیں ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہر معتبر کتاب کا ہر جزء معتبر نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک کتاب معتبر ہو لیکن اس میں کوئی بات غیر معتبر بھی ہو ایک دو مضمون کے غیر معتبر ہونے سے ساری کتاب کو غیر معتبر نہیں کہہ سکتے لیکن اس کا امتیاز عالم محقق ہی کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں کونسی بات غیر معتبر ہے۔ غرض یہ قصہ محض غیر معتبر ہے۔

صرف ہاروت و ماروت کے قصہ کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں بالخصوص بابل میں جادو کا بہت چرچا ہوگیا تھا حتیٰ کہ اس کے عجیب آثار دیکھ کر جہلا کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور سحر میں اشتباہ ہونے لگا کیونکہ سحر سے بھی بعض باتیں خرق عادت کے طور پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ سحر اور معجزہ میں بہت کھلا فرق ہے۔ ایک فرق تو یہی ہے کہ سحر میں اسباب طبعیہ خفیہ کو دخل ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر اس کا مدار تخیل پر ہوتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ محض حق تعالےٰ کے حکم سے بدون اسباب کے خلاف عادت امور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے صاحب معجزہ کے اخلاق و عادات و اطوار و اعمال میں اور ساحر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ نبی کی صحبت سے خدا تعالےٰ کی محبت و معرفت اور آخرت کی رغبت دنیا سے نفرت پیدا ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ اور ساحر کی صحبت میں اس کے خلاف اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس فرق کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کی طبیعت سلیم ہو عقل صحیح ہو عوام اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے تو نبوت کی دلیل معجزہ ہوتا ہے اور ظاہر میں معجزہ اور سحر دونوں یکساں نظر آتے تھے اس لئے حق تعالیٰ نے

اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نام نازل کئے تاکہ وہ لوگوں کو سحر کی حقیقت پر مطلع کر دیں کہ اس میں فلاں فلاں اسباب کو دخل ہے اس لئے یہ منجانب اللہ ساحر کی مقبولیت کی دلیل نہیں ان اسباب کے ذریعہ سے ہر شخص وہ کام کر سکتا ہے جو ساحر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل کئے گئے اس کا جواب یہ ہے کہ سحر پر عمل کرنا حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی سیکھنا جبکہ اس پر عمل مطلق نہ ہو حرام نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اس کے گوشت کی خاصیت معلوم کر لینا اور اس کو بیان کر دینا حرام نہیں کیونکہ خاصیت جاننے اور بتلانے کو گوشت کھانا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح شراب پینا حرام ہے لیکن اگر طبی کتاب میں شراب کی خاصیتیں لکھی ہوئی ہوں تو ان کو پڑھنا اور پڑھانا حرام نہیں کیونکہ اس کو شراب پینا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح کلماتِ کفریہ کا عمداً زبان سے نکالنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کے لئے ان کو جاننا چاہے کہ کن کلمات سے ایمان جاتا رہتا ہے تاکہ میں ان سے بچتا رہوں یہ کفر نہیں بلکہ جائز ہے۔ چنانچہ فقہاء نے کتابوں میں کلمات کفر کے لئے مستقل باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ایمان جاتا رہتا ہے ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا کیونکہ نقل کفر کفر نہیں۔

اسی طرح فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں اس کا رد بھی کر دیا جاتا ہے جس سے مقصود صرف یہی ہے کہ فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کر لینے کے بعد کوئی شخص اس کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے پس یہ اشتباہ جاتا رہا کہ تعلیم سحر کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل ہوئے۔ انبیاء علیہم السلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء ہدایت محضہ

کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور تعلیم سحر میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اُس کو سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول و مبتلا ہو جاتے تو اس طرح انبیاء علیہم السلام ضلالت و گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو اُن کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لئے حق تعالٰے نے ان کو ضلالت کا سبب بعید بنانا بھی گوارا نہیں کیا بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لئے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش کرتے ہیں اسی طرح کفار کی بھی کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ رحم کے اندر نطفہ کی پرورش کے لئے مد ... مقرر ہیں تو وہ مسلمان اور کافر ہر شخص کی صورت رحم میں بناتے ہیں اور نشو ونما میں دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح ہر شخص کے ساتھ کچھ فرشتے اس کی نگہبانی کے لئے مقرر ہیں جو خبیث جنوں سے اس کو بچاتے ہیں اور موذی جانوروں سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں جب تک کہ اس کے مقدر میں حفاظت ہے اسی طرح لڑائی میں دشمن کے حملہ سے انسان کو بچاتے ہیں خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ ایسے ہی نباتات کی نشو و نما کے لئے کچھ ملائکہ مقرر ہیں جو کافروں اور مسلمانوں کے کھیتوں اور باغات کی نشو ونما کرتے رہتے ہیں۔ غرض امور تکوینیہ میں مسلمان اور کافر دونوں برابر ہیں اور فرشتے دونوں کی حفاظت کرتے ہیں حالانکہ شرعاً کافر کی امداد و اعانت اس طریقہ سے جائز نہیں مگر ہمارے واسطے جائز نہیں ملائکہ کے واسطے جائز ہے کیونکہ ان کے سپرد یہ کام کئے گئے ہیں وہ اسی کے مامور ہیں اور یہی شان ہوتی ہے اقطاب اہلِ خدمت کی کہ امور تکوینیہ ان کے بھی سپرد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض دفعہ وہ کسی کافر سلطنت کی حمایت کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت مغلوب اور کافر سلطنت غالب ہو جاتی ہے مگر ایسے اقطاب مجذوبین ہوتے ہیں سالک ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ سالک شریعت کا مکلف ہے اور شرعاً کفار کی حمایت و اعانت مسلمانوں کے مقابلہ میں بالکل حرام ہے اور مجذوبین مکلف نہیں ہوتے مگر رتبہ میں افضل سالکین ہی ہیں۔ مجذوبوں کی مثال ایسی ہے جیسے سپاہی اور کوتوال کہ ان کے سپرد شہر کا انتظام ہوتا ہے شہر کے

تمام حالات کی ان کو اطلاع ہوتی رہتی ہے اور سالک کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا محبوب کہ اسے شہر کے حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہورہا ہے ہاں بادشاہ کا مزاج شناس اس درجہ ہوتا ہے کہ کوتوال کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ سلطان محمود کو ایاز سے خاص محبت تھی۔ حالانکہ اس کی معلومات سلطنت کے متعلق وزیر کی برابر ہرگز نہ تھیں بلکہ نظام سلطنت کے متعلق ہزاروں آدمی اس سے زیادہ باخبر تھے اسی لئے لوگوں کو حیرت تھی کہ سلطان ایاز کو اتنا کیوں چاہتے ہیں مگر ایاز میں ایک بات ایسی تھی کہ وزیر کو بھی اس کی ہوا نہ لگی تھی وہ یہ کہ سلطان کا مزاج شناس تھا اگر اس سے شہر کے حالات دریافت کرو تو اسے کچھ بھی علم نہ تھا لیکن محمود کا مزاج پوچھو تو اس سے زیادہ اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات ایاز ہی محمود سے بات کرسکتا تھا اور کسی کی مجال نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح سالکین خدا تعالے کے گویا مزاج شناس ہیں یعنی اللہ تعالے کو راضی کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ قرب حاصل کرنے کا راستہ بتلاسکتے ہیں اور اگر ان سے یہ پوچھو کہ فلاں مقدمہ میں نتیجہ کیا ہوگا' فلاں واقعہ کس طرح ہوگا تو اس کا جواب ان کے پاس یہ ہوتا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے محبت اور عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

نہ ان کے یہاں کشف ہے نہ وہ خوابوں کی تعبیر جانتے ہیں نہ وہ عملیات اور تعویذ گنڈے کا شغل رکھتے ہیں وہ تو صرف رضائے خدا اور وصول الی اللہ کا طریقہ جانتے ہیں اور اس کی تعلیم و تبلیغ کے لئے وہ ہر وقت حاضر ہیں اگر کوئی ان سے خواب کی تعبیر پوچھتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں ؎

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو مجھ سے سنو)

یہی وجہ ہے کہ عوام ان سالکین کے کم معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ظاہری سامان کچھ نہیں ہوتا نہ کشف ہے نہ کرامت۔ نہ رات دن الہام کا تذکرہ نہ ہائے اور ہو نہ شور و غل۔ اور مجذوبین کے یہاں یہ سامان بہت ہوتا ہے ہاں سالکین کے پاس محبت و معرفت الٰہی کا ایک مخفی خزانہ ہوتا ہے جس کو اہل بصیرت دیکھ لیتے ہیں۔ عوام کی نظر وہاں تک کم پہنچتی ہے اسی طرح کاملین کی کیفیات ممتاز نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایسی شیرینی ہوتی ہے جیسی فیرینی میں کہ نہایت لطیف مٹھاس ہوتا ہے جس کو اگر کوئی دیہاتی چکھے تو بالکل پھیکا بتادے اور مجذوبین کی کیفیات میں ایسی شیرینی ہوتی ہے جیسی گڑ میں کہ دیہات کے لوگ اسی کو میٹھا سمجھتے ہیں مگر نازک مزاج لطیف الطبع لوگ اس کی ایک ڈلی بھی نہیں کھا سکتے مجھے فیرینی پر ایک حکایت یاد آئی کہ دیوبند میں ایک رئیس کے یہاں تقریب تھی جس میں زردہ پلاؤ اور فیرینی وغیرہ پکائی گئی تھی گانوں سے ان کی رعیت کے چمار بھی آگئے تو ان کو بھی انہوں نے یہی کھانا دلوایا۔ گانوں والوں کی سمجھ میں یہ لطیف کھانے کیوں آنے لگے تھے پلاؤ زردہ کو تو بہت ہی ناک منہ چڑھا کر انہوں نے کھایا جب فیرینی کا نمبر آیا تو ان سے نہ رہا گیا، آخر ایک بول ہی اٹھا۔ اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا کہ یہ تھوک سا کے ہے (کیا ہے) دیکھئے اتنی لطیف چیز جو دل و دماغ کو تفریح دیتی چلی جاوے مگر اس چمار نے یہ قدر کی اس کو تھوک سے تشبیہ دی۔ اسی طرح جو لوگ دیہاتی طبیعت کے ہوتے ہیں ان کو سالکین کی لطیف کیفیات کی قدر نہیں ہوتی ان کو تو ایسی کی قدر ہوتی ہے کہ ذرا کو دھاندہو ہو حق ہو کشف و کرامت ہو تب اس کو بزرگ سمجھتے ہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص آیا اور دس برس تک رہا

دس سال کے بعد کہنے لگا کہ حضرت میں اتنے عرصہ سے آپ کی خدمت میں ہوں مگر میں نے کوئی کرامت نہیں دیکھی واقعی یہ شخص بھی کوئی بڑا ہی کوڑ مغز تھا جس کو اتنے عرصہ میں بھی حضرت جنید کے کمالات نظر نہ آئے ورنہ ان کمالات کے سامنے کرامت کی کیا حقیقت تھی۔ حضرت جنیدرح کو جوش آگیا فرمایا کہ اے شخص اس دس برس کے عرصہ میں تو نے کوئی کام خلاف سنت جنید سے ہوتا ہوا دیکھا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت خلاف سنت تو میں نے کوئی کام آپ کا نہیں دیکھا فرمایا کہ پھر اس سے زیادہ تو جنید کی کرامت اور کیا چاہتا ہے کہ دس برس میں اس سے ایک کام بھی خلاف سنت صادر نہیں ہوا۔ اس اس شخص کی آنکھیں کھل گئیں۔ واقعی یہ کرامت اتنی بڑی ہے کہ حسی کرامتیں اس کی باندیاں ہیں اور حضرت جنید کے اس دعوی کی وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ بعض دفعہ تحدث بالنعمۃ (نعمت کو ظاہر کرنے کے لیے) کے طور پر یا سالکین کی اصلاح کے لئے اپنے بعض کمالات بیان کر دیا کرتے ہیں تاکہ ان کو شیخ کی حالت معلوم کر کے اعتقاد زیادہ ہو، کیونکہ اس طریق میں شیخ پر اعتماد اور اعتقاد نہایت ضروری ہے کامیابی اسی پر موقوف ہوتی ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کاملین کے کمالات کس قدر غامض (باریک) ہوتے ہیں کہ معمولی آدمی کی نظر وہاں تک نہیں پہونچتی۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمالات سالکین سے بھی زیادہ غامض ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہی کہتے تھے کہ ہمارے میں اور ان میں کیا فرق ہے یہ بھی آدمی ہیں کھاتے پیتے ہیں بازاروں میں پھرتے ہیں ہم بھی ایسے ہی آدمی ہیں اور مجذوبین کو عوام اہلِ اسلام کے علاوہ کفار نے بھی بہت مانا ہے کیونکہ ان کی حالت دوسروں سے کھلم کھلا ممتاز ہوتی ہے پس سالکین کی شان انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہوتی ہے اور مجذوبین ملائکہ سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اسی لئے ان کے سپرد تکوینی امور زیادہ ہوتے ہیں اور سالکین کے سپرد تشریعی انتظام ہوتا ہے غرض ملائکہ تکوین کے کام بھی بہت کرتے ہیں اس لئے تعلیم سحر کی خدمت انہی کے سپرد

ہوئی کہ اگر اس میں وہ ضلالت کا سبب بعید بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا وہ تو اس سے زیادہ کام لیتے ہیں چنانچہ بعض دفعہ وہ لڑائی کے موقعہ میں کفار کی حفاظت بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں پر کفار کو غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام ضلالت کا سبب بعید بھی نہیں بن سکتے ان کی یہاں تک حفاظت کی گئی ہے کہ شیطان کو نبی کے ساتھ تمثیل پر قدرت نہیں دی گئی یعنے شیطان کسی نبی کی صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا حالانکہ جنات کو مختلف اشکال پر تشکل کی قدرت ہے مگر نبی کی صورت کوئی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس میں دین کا انتظام مختل ہو جاتا ہے اور بیداری میں تو کیا شیطان خواب میں بھی کسی کو نبی کی شکل میں نظر نہیں آسکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی شکل میں ظاہر ہو کر یہ دعوے کرے کہ میں نبی ہوں ہاں یہ ممکن ہے کہ خواب میں شیطان کسی کو نظر آوے اور یہ دعوے کرے کہ میں خدا ہوں کیونکہ حق تعالےٰ کی شان یہ ہے یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وہ ہدایت بھی کرتے ہیں اور گمراہ بھی کرتے ہیں یعنی گمراہی بھی انہی کی پیدا کی ہوئی ہے گو وہ اس سے راضی نہیں ہیں مگر جب کوئی غلط راستہ پر چلنا چاہتا ہے تو گمراہی کی صفت اس میں پیدا کر دیتے ہیں اور اس میں کچھ اشکال نہیں کیونکہ گمراہی کا ارتکاب نقص ہے اس کا پیدا کرنا اور خالق ہونا نقص نہیں ہے بدصورت ہونا تو عیب ہے لیکن بدصورتوں کو پیدا کرنا عیب نہیں بلکہ یہ تو عین کمال ہے جس سے خالق کی قدرت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت بنانے پر قادر ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے کفر کرتا ہے یہ اس کے لئے عیب ہے کیونکہ اس کی نافرمانی میں کوئی حکمت نہیں ہے اور خدا تعالیٰ نے گناہ اور کفر کو جو پیدا کیا ہے اس میں کوئی نقص نہیں کیونکہ اس کے پیدا کرنے میں ہزاروں حکمتیں ہیں چنانچہ ایک حکمت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ گناہ اور کفر کو پیدا نہ فرماتے تو کوئی شخص ان کا ارتکاب نہ کر سکتا بلکہ سب کے سب ایمان اور اعمال صالحہ پر مجبور ہو جاتے اس صورت میں مخلوق کا امتحان نہ ہو سکتا۔ پس افعال سیئہ اور کفر کے پیدا کرنے میں ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس میں مخلوق کا

امتحان ہے کہ دیکھیں کون اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالحہ کا ارتکاب کرتا ہے اور کون گناہ اور کفر کو اختیار کرتا ہے۔ انسان جس قسم کے افعال کا قصد کرتا ہے حق تعالیٰ سب کو پیدا کر دیتے ہیں اور ایک حکمت جس کو صوفیہ کرام سمجھے ہیں یہ ہے کہ اس سے اسماء کا ظہور ہوتا ہے ایمان اور اعمال صالحہ سے اسم ہادی کا ظہور ہوتا ہے اور کفر و اعمال سیئہ سے اسم مضل کا ظہور ہوتا ہے اور حق تعالےٰ کی یہ دونوں صفتیں ہیں ہادی بھی اور مضل بھی، اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ خالق کفر و خالق سیئات ہونا نقص نہیں۔ صاحبو! آفتاب کے لئے یہ کمال ہے کہ وہ چاند کو بھی روشنی دیتا ہے اور آئینہ کو بھی اور گھورے کو بھی اس کی روشنی پہونچتی ہے۔ لیکن گھورے کی بدبو اور نجاست آفتاب تک نہیں پہونچتی وہ اسی طرح پاکیزہ اور شفاف ہے ناپاکی خود اسی کی ذات تک رہتی ہے آفتاب تک اس کا کوئی اثر نہیں جاتا اسی طرح خدا نے گناہ اور کفر کو بھی وجود دیا ہے لیکن ان کی نجاست کا وہاں کوئی اثر نہیں پہونچتا اس کے لئے یہ بھی کمال ہے کہ اس نے جہاں ایمان و اعمال صالحہ کو پیدا کیا ہے وہاں کفر و اعمال سیئہ کو بھی پیدا کر دیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست
در بما نسبت کنی کفر آفت ست

(خالق تعالیٰ کی نسبت سے تخلیقاً کفر میں بھی حکمت ہے اور اگر اس کو ہماری طرف نسبت سے دیکھو تو فعلاً ایک سخت آفت ہے)

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانہ میں کفر کا ہونا ضروری ہے دوزخ میں کون جلتا اگر بولہب نہ ہوتا)

مطلب یہ ہے کہ اگر ابولہب وغیرہ نہ ہوں تو صفت قہر کا ظہور کس پر ہوتا اور کارخانۂ عشق

سے مراد دنیا ہے کیونکہ منشا اس عالم کے ظہور کا عشق ہی ہے جس کی طرف اس جملہ میں اشارہ ہے کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں مخفی خزانہ تھا پس پسند کیا میں نے کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا) بعض لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عشق میں کفر کرنا بھی بعض دفعہ ضروری ہوتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے بعض لوگ خلاف شرع کلمات زبان سے نکال دیتے ہیں اور محرمات کا ارتکاب کر لیتے ہیں سو یہ مطلب بالکل غلط ہے اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ان کو طریق سے ذرا بھی مس نہیں بلکہ اس کا صحیح مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ کارخانۂ عشق سے عالم مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ عالم چونکہ اسمار الٰہیہ کے ظہور کا محل ہے اور خدا کی ایک صفت قہار و مضل بھی ہے اس لئے عالم میں کفر کا وجود بھی ضروری ہے ورنہ ظہور اسمار کامل طور پر نہ ہوگا یہ حکمت تو صوفیہ سمجھے اور ایک حکمت علمار ظاہر نے سمجھی ہے وہ یہ کہ اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد کے مطالعہ سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے پس دنیا میں کفر وغیرہ کو اس لئے پیدا کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ایمان کی حقیقت کامل طور پر منکشف ہو جائے دیکھئے جس شخص نے اندھے کو نہ دیکھا ہو وہ سوانکھے کی حقیقت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح اگر کسی نے ظلمت اور اندھیرے کو نہ دیکھا ہو وہ روشنی کی قدر نہیں جان سکتا یہ تو وہ حکمتیں ہیں جو عارفین اور علمار نے بیان کر دی ہیں ان کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہوں گی جو حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں غرض اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تکوینًا کفر و معاصی کی بھی ضرورت ہے اس عالم کو پس تکوینًا تعلیم سحر میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے اس کام کے لئے فرشتوں کو بھیجا گیا چنانچہ انہوں نے دنیا میں آکر سحر کی حقیقت ظاہر کی اور صلحار نے ان سے تعلیم حاصل کر کے سحر کے اترے پترے کھول دیئے جس سے ساحروں کی ساری بزرگی خاک میں مل گئی اور لوگوں کو معجزات اور سحر میں جو اشتباہ پیدا ہو گیا تھا وہ رفع ہو گیا پھر وہ فرشتے غالبًا آسمان ہی پر چلے گئے نہ وہ کسی کنویں میں ہیں نہ کھائی میں اب

آیت کا ترجمہ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ. الآیۃ
(یعنی یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ کتاب اللہ کا اتباع تو کرتے نہیں) اور ایسی چیز کا
اتباع انہوں نے کرلیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے خبیث جن (حضرت) سلیمان
علیہ السلام کے زمانہ سلطنت میں (یعنی سحر کا اتباع کرتے ہیں جو کہ خبیث جنوں
سے متوارث چلا آرہا ہے) اور (بعضے بے وقوف یہودی جو حضرت سلیمان علیہ
السلام کو نعوذ باللہ ساحر کہتے ہیں یہ بالکل ہی لغو اور جھوٹی بات ہے کیونکہ سحر تو اعتقاداً
یا عملاً کفر ہے اور (حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا
مگر (ہاں) خبیث جن بیشک کفر (کی باتیں اور کفر کا کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے اور
حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی تھے مگر دوسرے) آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے
تھے (چنانچہ انہی سے وراثۃً یہ سحر چلا آرہا ہے جس کا یہودی اتباع کرتے ہیں) اور
(اسی طرح) اُس سحر کا بھی (اتباع کرتے ہیں) جو نازل کیا گیا تھا اُن دو فرشتوں پر
بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور وہ دونوں (سحر کی) تعلیم کسی کو نہیں دیتے
تھے جب تک (احتیاطاً) پہلے یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا وجود بھی (مخلوق کے لئے) ایک
امتحان (وآزمائش) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہوکر کون اُس میں پھنستا
ہے اور کون اس سے بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہوکر) کہیں کافر مت بن جائیو
(کہ سحر میں پھنس جاوے) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا
سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے مرد اور بی بی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے (آگے
مسلمانوں کو تسلی ہے کہ وہ ساحروں سے خوف نہ کریں کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ)
یہ ساحر لوگ سحر کے ذریعہ سے کسی کو (ذرہ برابر) بھی ضرر بدون خدا تعالیٰ کی مشیت
کے نہیں پہونچا سکتے (تو تم کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اگر کسی پر سحر کا اثر
ہوجاوے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے لئے خدا تعالیٰ کی یہی مشیت تھی ساحر نے کچھ
نہیں کیا بلکہ یہ کلفت دوست نے پہونچائی ہے اور ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

لہ یہ حاصل ہے نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتٰب اللہ الآیہ کا ۱۲ منہ

اب میں مقصود پر آ گیا۔ اس وقت تک جس قدر بیان ہوا وہ تمہید تھی مگر تمہید میں خلاف امید بہت طول ہو گیا (پھر دریافت فرمایا کہ وقت کیا ہے معلوم ہوا کہ گیارہ بجے ہیں۔ فرمایا کہ بہت دیر ہو گئی ۱۲ جامع) اب میں مقصود کو مختصر طور پر بیان کروں گا تاکہ زیادہ دیر نہ ہو (اس پر چاروں طرف سے آواز آئی کہ حضرت مختصر نہ کیجئے جب تک چاہیں بیان کرتے رہیں۔ ۱۲ جامع فرمایا کہ) لیکن میرا مطلب مختصر کرنے سے یہ ہے کہ تمہید کی نسبت آئندہ بیان مختصر ہو گا یہ مطلب نہیں کہ فی نفسہ بھی مختصر ہو گا ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
گرچہ بس عالی ست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت سے پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کی سامنے تو بہت بلند ہے)

آسمان عرش و کرسی کے سامنے چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے باقی زمین سے تو وہ پھر بھی بہت بڑا ہے۔ غرض میں یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ بیان ایک مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ بیت العلم ہے اس لئے ضروری ہے کہ علم کے متعلق ایک منضبط بحث بیان کر دوں تاکہ طلبہ کو اس سے فائدہ ہو نیز علماء اور عوام نے علم کے متعلق جو کچھ غلطیاں کی ہیں ان کو واضح کر کے اصلاح کا طریقہ بتلا دوں چنانچہ اگلی آیتوں میں میرا مقصود صراحۃً مذکور ہے فرماتے ہیں وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ (اور یہ لوگ ایسی چیز سیکھ لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں) اگرچہ یہاں یہود کی حالت کا بیان ہو رہا ہے کہ وہ ایسی چیز کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو ان کو مضر ہے لیکن یہ قاعدہ ہے کہ خصوص سبب سے حکم خاص نہیں ہوا کرتا عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اس لئے یہ حکم جو اس جگہ مذکور ہوا ہے عام ہے وہ یہ کہ علم مضر کو حاصل نہ کرنا چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ ہر علم محمود نہیں بلکہ بعضے مضر بھی ہیں جن کے سیکھنے پر اس آیت میں ملامت کی گئی ہے۔ پھر مضر کی دو قسمیں ہیں بعضے بالذات مضر ہیں اور بعضے بالغیر۔ مضر بالذات وہ علوم ہیں جو اصل سے ممنوع اور ناجائز ہیں کیونکہ اُن کے

مضامین خلاف شریعت ہیں جیسے سحر اور نجوم وغیرہ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ پہلے تو سحر کی تعلیم کو اور اس کے سیکھنے کو جائز کہا تھا اور اب اس کو ناجائز کہدیا اس کا جواب یہ ہے کہ اوپر سحر سیکھنے کو اور سکھانے کو جائز نہیں کہا تھا بلکہ اس کی حقیقت جاننے اور بتلانے کو جائز کہا تھا اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ضرورت شرعیہ کی وجہ سے اس کی حقیقت کو معلوم کیا جائے تو اس وقت چونکہ سحر اور معجزہ میں اشتباہ ہونے لگا تھا اس لئے اس کا جاننا اور بتلانا جائز تھا وہ بھی ان لوگوں کے لئے جن کو اپنے نفس پر یہ اعتماد ہو کہ وہ اس کو جان کر اس میں مبتلا نہ ہوں گے اور اب اس کی حقیقت جاننے کی ضرورت نہیں رہی نیز مفسدہ کا اندیشہ غالب ہے اس لئے اس سے بھی منع کیا جائیگا۔ رہا سحر کو سحر کے طور پر اور مقصود کر کے سیکھنا اور سکھانا اس کو میں نے جائز نہیں کہا تھا۔ خوب سمجھ لو۔

اور مضر بالغیر وہ علوم ہیں جو فی نفسہ جائز ہیں مگر کسی عارض کی وجہ سے اُن کو ممنوع کیا گیا ہے جیسے علم مناظرہ کہ فی نفسہ جائز ہے لیکن بعض لوگ اس طرز سے اس کی تعلیم دیتے ہیں جو کہ مضر فی الدین ہے۔ اس لئے اس طرز سے تعلیم و تعلم کو ممنوع کہا جائے گا جیسے بعض جگہ طلبہ کو مناظرہ کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ ایک جماعت فرضی عیسائی بنتی ہے اور ایک مسلمان پھر وہ جماعت جو عیسائیوں کی طرف سے وکالت کرتی ہے وہ بالکل اس طرح گفتگو کرتی ہے جیسے سچ مچ کوئی عیسائی بول رہا ہے مثلاً وہ اپنی مقابل جماعت سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ آپ کے قرآن میں یہ لکھا ہے اس سے ہماری تائید ہوتی ہے اور ہماری انجیل میں یہ مسئلہ اس طرح بیان کیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے۔

ایک مدرسہ کے مہتمم نے مجھے طلبہ کا مناظرہ دکھلا دیا تھا وہاں میں نے یہ طرز دیکھا واللہ ان طلبہ کی اس گفتگو سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ مناظرہ ختم ہو گیا تو مہتمم صاحب کہنے لگے کہ اس میں کوئی بات قابل اصلاح ہو تو فرما دیجئے، میں نے کہا کہ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (بدن پر داغ ہی داغ ہیں کہاں کہاں پھایہ رکھا جائے) یہ تو سر سے پاؤں تک ہی بگڑا ہوا ہے میں کس بات کی اصلاح کروں سو اس

طرز میں ایک ضرر تو یہی ہے کہ مسلمان سے عیسائی بن گئے دوسرے یہ کہ مناظرہ میں ہر فریق کو اپنی بات کا اونچا رہنا اور دوسرے فریق کی بات کا نیچا رکھنا مدنظر ہوتا ہے تو یہ صورت مطلقاً بھی اور خصوص ایسے طور پر نہایت سخت ہے کہ ایک فریق اسلام کی جانب کو کمزور کرنے کی کوشش کرے جس سے بعض دفعہ سلب ایمان کا اندیشہ ہو جاتا ہے کیونکہ آج کل طبائع میں سلامتی نہیں ہے نیتیں درست نہیں ہیں پس ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس طرز میں نیت کو درست رکھ سکیں ممکن ہے کسی وقت کوئی شخص محض اپنی بات کی پچ کرنے لگے اور نفسانیت کی وجہ سے اسلام کی جانب کو کمزور کرنے لگے تاکہ سننے والے یہ کہیں کہ فلاں شخص نے بڑی زوردار تقریر کی اور اس کا انجام جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ تیسرے یہ غضب ہے کہ اس قسم کے مناظرہ میں بعض دفعہ عوام بھی شریک ہو جاتے ہیں جس میں بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں فریق باطل کے دلائل بیٹھ جائیں اور اہلِ حق کی طرف سے جو اس کا جواب بیان کیا جائے وہ اس کی سمجھ میں نہ آوے یا جس طالب علم نے اہلِ اسلام کی طرف سے جواب دیا ہے اس کی تقریر اچھی نہ ہو تو اس عامی شخص کا ایمان اس صورت میں برباد ہو جائے گا اس لئے میرے نزدیک یہ طرز بالکل قابل ترک ہے بلکہ میرے نزدیک تو مناظرہ کے لئے تعلیم و تعلم ہی کی ضرورت نہیں فطرت سلیم ہو تو انسان ہر باطل مذہب کا رد بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔

الٰہ آباد میں ایک رئیس تھے بالکل ان پڑھ جو اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے بس ایک مہر بنوالی تھی جب دستخط کرنا چاہتے مہر کر دیتے تھے ایک دفعہ وہ سواری پر سوار ہو کر جا رہے تھے راستہ میں ایک عیسائی کھڑا ہوا اپنے مذہب کی حقانیت بیان کر رہا تھا اپنے حق ہونے پر ایک دلیل اس نے یہ بھی بیان کی کہ دنیا میں عیسائی سب سے زیادہ ہیں انجیل کے ترجمے بہت زبانوں میں ہو چکے ہیں معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ مقبول ہیں جو ان کی اس قدر کثرت اور ترقی ہے اُن رئیس صاحب نے اپنی سواری روک کر پادری سے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل حقانیت کی نہیں

آؤ ہم تم کو اسٹیشن پر چل کر دکھائے دیتے ہیں کہ ریل گاڑی میں فسٹ کلاس کا درجہ ایک ہی ہوتا ہے اور تھرڈ کلاس بہت ہوتے ہیں پس ہم مسلمان فسٹ کلاس ہیں اور تم عیسائی لوگ تھرڈ کلاس ہو یہ جواب سن کر پادری مبہوت ہوگیا اور اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو دیکھئے ایک اَن پڑھ آدمی نے پادری کو خاموش کر دیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ مناظرہ کے لئے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں البتہ طبیعت سلیم ہونی چاہئے پھر ہر اعتراض کا جواب دے لینا آسان ہے پھر آجکل جس طرح مناظرہ کیا جاتا ہے سلف کا یہ طریقہ نہ تھا قرآن میں جابجا کفار سے مناظرہ کیا گیا ہے مگر اس کا عجیب طرز ہے آجکل کی طرح تو تو میں میں نہیں ہے احادیث میں حضرت صحابہ کے مناظرے مذکور ہیں ان کا طرز یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بات کو بار بار دھرائے جاتا تھا آخر دونوں میں سے ایک کہہ دیتا تھا کہ بس مجھے انشراح ہوگیا اور میری سمجھ میں آگیا۔ دلائل اور ردّ و قدح زیادہ نہ ہوتے تھے اور یہی طرز قرآن کا ہے۔ آجکل کے مناظرہ میں ایک ضرر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ مخالف کے جواب میں انبیاء کی توہین کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ایک مناظرہ میں عیسائی نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے رسول رسیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ زاہد تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بھی نکاح نہیں کیا ساری عمر زہد کی حالت میں گذار دی اور مسلمانوں کے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک چھوڑ نو شادیاں کیں۔ تو اس کے جواب میں ایک صاحب کیا فرماتے ہیں کہ پہلے تم یہ تو ثابت کر دو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت رجولیت (رمردانگی) بھی تھی۔ لیجئے صحیح جواب کو چھوڑ کر ان حضرات نے ایسا جواب دیا جس میں نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام پر نامردی کا عیب لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام جس طرح باطنی کمالات کے جامع ہوتے ہیں اسی طرح ظاہری کمالات بھی ان میں کامل طور پر موجود ہوتے ہیں اُن کے قویٰ بشریہ بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ صحیح جواب یہ تھا کہ زاہد ہونا نکاح نہ کرنے پر موقوف نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا جتنے پیغمبر ہیں وہ سب زاہد نہ تھے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام و ابراہیم و داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام

سب کے سب صاحب اہل و عیال تھے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تو تین سو اور بعض روایات کے موافق ہزار بیبیاں تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زہد کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ تعلقات سے یکسو ہوکر زاہد بنے دوسرے یہ کہ تعلقات میں مشغول ہوکر زاہد رہے کہ بی بی اور بچے اور گھر بار سب کچھ ہو مگر دل کسی چیز میں نہ لگا ہوا ہو بلکہ دل میں خدا ہی کے ساتھ لگا ہو دوسروں سے محض حقوق ادا کرنے کے واسطے تعلق ہو سو عیسیٰ علیہ السلام کا زہد پہلی قسم کا تھا اور دوسرے انبیاء میں دوسری قسم کا زہد تھا۔ آجکل یہ مرض بہت پھیل گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اس طرح ثابت کرتے ہیں جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانہ میں بہت شائع ہو رہی ہے اور لوگ اس پر بہت فریفتہ ہیں لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرتے ہوئے اس میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کمالات تھے وہ کسی نبی میں نہ تھے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت کا مادہ نہ تھا کیونکہ انھوں نے یہ دعا کی تھی یَا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا (اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ) اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سلطنت کا سلیقہ نہ تھا۔ استغفر اللہ۔

دیکھئے اس ظالم نے نوح علیہ السلام کو شفقت و رحمت سے اور عیسیٰ علیہ السلام کو تمدن و سلطنت کے سلیقہ سے خالی بتا دیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے نوح علیہ السلام کی دعوت کا حال جو سورۂ نوح میں مذکور ہے وہی اُن کی شفقت و رحمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَہَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو (دین حق کی طرف) رات کو بھی بلایا اور دن کو بھی سو میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگتے رہے۔ آگے ارشاد ہے ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا یعنی پھر بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت

کرتا رہا چنانچہ) میں نے ان کو بآواز بلند (حق کی طرف) بلایا (اس سے مراد خطاب عام ہے وعظ کے طور پر) پھر میں نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور بالکل خفیہ بھی سمجھایا۔ (غرض جتنے طریقوں سے نفع کی امید ہوسکتی ہے سب ہی طرح سمجھایا) تو اگر نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت نہ ہوتی تو اس کاوش کی انھیں کون ضرورت تھی پھر یہ طرز کوئی ایک دو دن یا ایک دو مہینہ تک نہیں رہا بلکہ ساڑھے نو سو برس تک اسی طرح سمجھاتے رہے اور قوم کی سرکشی کی یہ حالت تھی کہ اس عرصہ میں غالباً صرف اسّی آدمی ایمان لائے باقی سب اسی حالت پر رہے اور طرح طرح سے نوح علیہ السلام کو ستاتے رہے مگر وہ اس پر بھی مایوس نہیں ہوئے۔ برابر دعوت کرتے رہے حتیٰ کہ جب خود اللہ تعالےٰ نے وحی کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دی کہ اب کوئی ایمان نہ لاوے گا تب وہ مایوس ہوئے جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ اور نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جتنے لوگ ایمان لاچکے ہیں ان کے سوا اب اور کوئی ہرگز ایمان نہ لاوے گا پس ان باتوں پر رنج نہ کیجئے جو وہ کیا کرتے تھے۔ جب وحی سے ان کو معلوم ہوگیا کہ اب کسی کی قسمت میں ایمان نہیں ہے تب انھوں نے کفار کی ہلاکت کے لئے بد دعا کی جس کی حکمت کو انھوں نے خود بھی ظاہر کردیا ہے اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ اگر (اب) آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو وحی وغیرہ سے اس کی خبر بھی ہوگئی تھی کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی اولاد میں بھی کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ اب بتلایئے ایسی حالت میں ان کی بد دعا خلاف شفقت کیونکر تھی بلکہ یہ تو مسلمانوں کے حق میں عین رحمت تھی ورنہ اگر وہ زندہ رہتے تو ان کی اولاد بھی کافر ہوتی تو دنیا میں مسلمانوں کا جینا محال ہوجاتا پھر نوح علیہ السلام سے حق تعالےٰ نے یہ بھی فرمادیا تھا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ

منظر کیونکہ ان ظالموں کی بابت تم مجھ سے سفارش کے طور پر کچھ مت کہنا کیونکہ یہ سب غرق کئے جائیں گے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت بہت زیادہ تھی کہ اگر ان کو ممانعت نہ کی جاتی تو وہ شفاعت وغیرہ کرتے چنانچہ اپنے لڑکے کے بارے میں اُن کو کچھ کہنے کا موقع مل گیا تو انھوں نے عرض کر ہی دیا کہ اے پروردگار آپ کا وعدہ تھا کہ تیری اہل وعیال کو نجات دوں گا اور میرا لڑکا بھی تو میری اہل وعیال میں داخل ہے وہ کیوں ہلاک ہو گیا، وہاں سے ارشاد ہوا کہ وہ آپ کی اہل میں داخل نہیں کیونکہ اس کے اعمال اچھے نہ تھے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کی بابت حدیث میں آتا ہے کہ وہ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں کی سلطنت کا انتظام فرما دیں گے اور جزیہ کو موقوف کر دیں گے اگر ان میں سلیقہ سلطنت نہیں تو وہ آخر زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی سلطنت نہایت کمزور ہوگی اسکا انتظام کیسے کرلیں گے۔

الغرض انبیاء علیہم السلام میں تمام کمالات مجتمع ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی جوہر سے کسی وقت وہ کام نہ لیں لیکن کسی کمال سے ان کو خالی بتا دینا یہ سخت غلطی ہے۔ حق تعالیٰ جس صفت سے کام لینے کا ان کو حکم فرماتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں اور جس صفت سے جس وقت کام لینے کا حکم نہیں ہوتا اس سے کام نہیں لیتے ان کی حالت یہ ہوتی ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان او ست ... ور بجہل آئیم ما زندان او ست

گر بخواب آئیم مستان ویئم ... ور به بیداری بدستان ویئم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے ہوا ہے اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ ہی تصرف بنے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اور اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں یعنی قوت بیانیہ بھی ان کی ہی عطا کی ہوئی ہے)

من چو کلکم درمیان اصبعین　　نیستم در صف طاعت بین بین
بنگر اے دل تو اجلا لیستی　　درمیان اصبعین کیستی

(میں قلم کی طرح انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں اے دل غور کر اگر تو اجلا نہیں ہے تو درمیان انگلیوں کے کیوں ہے)

رشتۂ در گردنم افگند دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

انبیاء علیہم السلام بدون حکم کے کچھ نہیں کرتے جس کو جو حکم ہوتا ہے وہی بجالاتے ہیں اسی لئے ان کی شانیں مختلف ہوتی ہیں مگر ہر شان محبوب ہے کیونکہ محبوب کی رضا کے موافق ہے ایک عارف فرماتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ہم کو وہی بیان کرنے چاہئیں جو احادیث میں مذکور ہیں وہ کیا کچھ کم فضائل ہیں اور یہاں سے اس کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل خود کیوں بیان فرمائے وجہ یہ ہے کہ اگر خود حضور

صلی اللہ علیہ وسلم بیان نہ فرماتے تو امت اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر کمالات بیان کرتی،
کیونکہ محبت و اعتقاد اس پر مجبور کیا کرتا ہے کہ محبوب کے فضائل بیان کئے جائیں
اور ہمارے بیان کردہ فضائل میں یہ اندیشہ غالب تھا کہ دوسرے انبیاء کی تحقیر و
توہین لازم آجائے جیسا کہ آجکل مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنے سچے اور واقعی کمالات خود ہی بیان فرما دیئے تاکہ اگر کسی کو محبت و عشق
کے غلبہ میں آپ کے فضائل بیان کرنے کا شوق ہو وہ ان صحیح فضائل کو بیان کر کے اپنا
شوق پورا کرلے اور ان فضائل کے بیان کرنے میں کسی نبی کی توہین کا شائبہ بھی نہیں
الغرض آج کل مناظرہ کی تعلیم جس طرز سے کی جاتی ہے وہ قابل ترک ہے چنانچہ اس
شخص مذکور نے عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ نامرد بنانا چاہا یہ تو مہذب لوگوں کا مناظرہ
ہے اور گنواروں کا مناظرہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

روڑکی میں ایک عیسائی بیان کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں ایک
گنوار نے کہا خدا کے اور بھی کوئی بیٹا ہے یا نہیں پادری نے کہا نہیں گنوار بولا کہ بس
تیرے خدا کے اتنے زمانہ میں ایک ہی بیٹا ہوا میرے نکاح کو اتنا عرصہ ہوا ہے اس وقت
میرے گیارہ بیٹے ہیں اور آگے کو اور بھی ہوں گے تو تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا رہا۔
اس گنوار کا جواب اگرچہ فی نفسہٖ ایک معقول بات تھی واقعی اگر خدا کے لئے بیٹا ہونا
ممکن ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کے ایک ہی بیٹا ہو حالانکہ اس کی مخلوق میں ادنیٰ
سے ادنیٰ آدمی کے بہت اولاد ہوتی ہے لیکن طرز نہایت بیہودہ ہے۔ غرض جو علوم مضر
ہوں ان کا سیکھنا حرام ہے وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ (یہ لوگ ایسی
چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں) سے یہ مسئلہ مستنبط
ہوتا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بعض علوم مضر ہیں تو کوئی نافع بھی
ضرور ہے تو اس سے دو حکم معلوم ہوئے ایک یہ کہ علوم مضرہ سے بچنا چاہیئے
دوسرے یہ کہ علوم نافعہ کو سیکھنا چاہیئے۔ رہا یہ کہ مضر کون ہے اور نافع کون ہے
اس کی تعیین بھی خود اسی آیت میں موجود ہے وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ

فِی الْآخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ (جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں) اس سے معلوم ہوا کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے تو اس کے مقابلہ میں نافع وہ ہوا جو آخرت میں کام آوے اور ان دونوں کے مجموعہ سے دو غلطیاں معلوم ہوئیں۔ ایک علماء کی ایک عوام کی۔ علماء کی تو غلطی یہ ہے کہ ان میں سے بعضے ساری عمر علوم غیر نافعہ ہی میں صرف کر دیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنے والی نہیں البتہ اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جاوے کہ اس سے فہم و استدلال میں سہولت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو و صرف و بلاغت وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم آلیہ ہیں اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو طبعاً ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے لیکن ساری عمر علوم آلیہ ہی میں گنوانا یہ سراسر حماقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی اور صفائی میں گذار دے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بیوقوف بتلائے گا اور بعضے صرف معقول تو نہیں پڑھتے مگر علوم دینیہ پر اس کی تقدیم کرتے ہیں یہ بھی غلطی ہے اس میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اگر اس حالت میں موت آگئی تو معقولیوں ہی میں اس کا حشر ہوگا۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ اس شخص کی عقل پر معقول رچ جاتی ہے پھر یہ حدیث و قرآن کو معقول ہی کے طرز پر سمجھنا چاہتا ہے اور ہر جگہ اسی کو چلاتا ہے اس لئے حدیث و قرآن کا اثر اس کی طبیعت پر نہیں جمتا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے پاس ایک معقولی طالب علم حدیث پڑھنے آئے۔ ایک دن سبق میں یہ حدیث آئی لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طُھُوْرٍ وَّلَا صَدَقَۃً مِنْ غُلُوْلٍ یعنی نماز بدون طہارت (اور وضو) کے قبول نہیں ہوتی الخ مولانا نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بغیر نماز فاسد ہے۔ معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ اس سے تو قبول نہ ہونا معلوم ہوتا ہے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بغیر وضو کے نماز صحیح بھی نہیں ہوتی ممکن ہے کہ صحت تو بدون وضو کے بھی ہو جاتی ہو لیکن قبول بدون

وضو کے نہ ہو پس اگر کوئی بدون وضو کے نماز پڑھ لے پھر وضو کر لے تو احتمال ہے
کہ اب قبول بھی ہو جاوے۔ اس پر سب کو ہنسی آگئی سو معقول پہلے پڑھنے کا یہ ضرر
ہوتا ہے کہ حدیث کا ذوق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ نماز کے بعد وضو کر لینے پر مجھے
ایک حکایت یاد آئی۔ ایک افیونی کا لوٹا کچھ ٹوٹا ہوا تھا۔ جب وہ پاخانہ جاتا اور وہاں
دیر لگتی جیساکہ افیونی کی عادت ہے کہ پاخانہ میں جاکر بہت دیر لگاتے ہیں اس عرصہ میں
لوٹا بالکل خالی ہو جاتا ہے ایک دن افیونی صاحب نے کہا کہ آج میں تیرا علاج کروں گا
تو روز خالی ہو جاتا ہے آپ نے کیا کیا کہ پاخانہ میں جاکر پہلے آبدست کر لی اور اپنے
جی میں بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے خوب تدبیر کی کہ لوٹا خالی نہ ہو سکا مگر اس کی خبر
نہ تھی کہ جس غرض سے پانی لائے تھے اس کا کہیں پتہ ہی نہیں غرض وہ روزہ یہی حرکت
کرتا کہ پہلے آبدست لیتا پھر پاخانہ پھرتا۔ مولانا محمد یعقوبؒ بڑے ظریف تھے
میں نے کہدیا کہ یہ بڑا بیوقوف تھا اول آبدست کرتا تھا پھر پاخانہ پھرتا فرمایا
نہیں تم سمجھے نہیں وہ آبدست گذشتہ دن کے پاخانہ کی کرتا تھا تو آبدست ہو رہی
ہوئی البتہ صرف اول دن کی آبدست بیکار ہوئی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا تو ان
معقولی صاحب کا وضو بھی اسی کے مشابہ تھا ان ہی طالب علم صاحب نے ایک اور
اعتراض کیا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں ہر شخص اپنے اپنے درجہ میں خوش
رہے گا ادنیٰ درجہ والوں کو بڑے رتبہ کے لوگوں کو دیکھ کر رنج نہ ہوگا کیونکہ جنت میں
رنج و غم کا نام بھی نہیں ہوگا ہر شخص اپنی حالت کو دوسرے سے اچھی سمجھے گا۔ وہ معقولی
صاحب بولے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ سب جنتی جہل مرکب میں مبتلا ہوں گے
غرض ان کو حدیث میں بھی وہی معقولی اصطلاحیں یاد آتی تھیں جہل مرکب اور جہل
بسیط ہی میں رہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اپنی حالت پر خوش رہنا اور
چیز ہے اور حالت کا نہ جاننا اور چیز ہے ایک دوسرے کے متلازم نہیں ایسا
ہو سکتا ہے کہ ہم یہ جانتے ہوں کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے مگر پھر بھی ہم اپنی
حالت پر خوش ہوں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو ماش کی دال ایسی مرغوب ہے

کہ مرغ کا گوشت بھی اس کے آگے پسند نہیں آتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی رغبت اور پسند ہے اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ شخص ماش کی دال ہی میں ایسا خوش ہے جیسا کہ دوسرا شخص مرغ کے گوشت میں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو دال اور گوشت میں فرق بھی نہ معلوم ہو دونوں میں فرق ہر ایک جانتا ہے اسی طرح جنت میں ادنی درجہ والوں کو اپنا درجہ ہی پسند ہوگا وہ اسی میں خوش و خرم ہوں گے اگرچہ وہ یہ بھی جانیں گے کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے پس جہل مرکب میں ہونا کیونکر لازم آیا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ معقول کا علوم دینیہ پر مقدم کرنا مضر ہے مگر بعض لوگ معقول کے ایسے فریفتہ ہوتے ہیں کہ پہلے اسی کو پڑھتے ہیں بلکہ بعض تو حدیث وغیرہ کے پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ حدیث کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے اس میں کونسی مشکل بات بات ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ حدیث پڑھ لینے کے بعد بھی اگر سمجھ میں آجاوے تو بس غنیمت ہے اور بدون پڑھے ہوئے تو سمجھ میں آہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ایک معقول صاحب کی حکایت ہے کہ انھوں نے حدیث پڑھی نہ تھی مگر پڑھانے کو تیار ہوگئے۔

ایک حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا قصہ آیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کئے نکاح کرلیا تھا جب وہ شادی سے اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر زردی کا اثر دیکھا یہ دلہن کے زعفرانی کپڑوں کا نشان لگ گیا تھا۔ فرمایا مهيم هذه الصفرة انھوں نے کہا تَزَوَّجْتُ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی میں نے شادی کرلی ہے۔ آپ نے فرمایا اولم ولو بشاة ولیمہ کرو اگرچہ ایک ہی بکری کا ولیمہ ہو۔ یہ تو حدیث تھی۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ یہ زردی کیسی تھی مدرس صاحب نے حدیث پڑھی تو تھی نہیں جو اس کی حقیقت سمجھتے آپ نے اجتہاد کیا کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف جوان آدمی تھے ایک زمانہ سے رُکے ہوئے تھے جب شادی ہوئی تو انھوں نے مقاربت میں کثرت کی اس لئے چہرہ پر زردی آگئی۔ ظالم نے کیا حدیث کا ناس مارا ہے۔ آپ نے رای علیه اثر الصفرة (آپ نے اس پر زردی کا نشان دیکھا) کے یہ معنے سمجھے کہ چہرہ زرد ہوگیا تھا۔

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ طالب علم بے چارہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا مگر اس کے دل کو یہ بات نہ لگی اس نے ایک دوسرے عالم سے اس کا مطلب پوچھا انھوں نے صحیح مطلب بیان کر دیا کہ شادی کے دن دلہن کے کپڑوں کو خوشبو اور عطر لگایا جاتا ہے عرب میں جو خوشبو اس وقت استعمال کی جاتی تھی اس میں زعفران وغیرہ پڑتی تھی دلہن کے پاس جانے سے وہ رنگ عبدالرحمن بن عوف کے کپڑوں پر بھی لگ گیا۔ چونکہ اس خوشبو کا استعمال مرد نہیں کرتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا کہ یہ رنگ دلہن کی خوشبو کا ہے اس حقیقت کے معلوم ہو جانے پر طالب علم کا اطمینان ہو گیا۔ تو صاحبو! یہ فرق ہوتا ہے حدیث پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے میں۔ حدیث میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا واقعات کے جاننے پر موقوف ہوتا ہے ان میں معقول کچھ کام نہیں دے سکتی اور اگر اُن میں صرف عقل سے کام لیا جائے تو بس ایسے ہی مطلب بیان کئے جائیں گے جیسا ان حضرت نے رَاٰیٰ عَلَیْہِ اَثَرُ الصُّفْرَۃِ (آپ نے اس پر زردی کا نشان دیکھا) کا مطلب بیان کیا تھا پس معقول کو علوم دینیہ کے بعد پڑھنا چاہیے ورنہ وہی عقل پر پرچ جائے گی اور حدیث میں وہی معقولی اشکالات جاری ہو نگے ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا ایک معقولی صاحب پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں کہنے لگے کہ شیخ بوعلی سینا تو ان کے ذہن میں ہر وقت شیخ بوعلی سینا ہی جما ہوا تھا کہ تصور شیخ میں بھی وہی یاد آیا گویا ان کے نزدیک بس وہی ایک شیخ رہ گیا ہے۔ یہ تو علما کی غلطی تھی کہ علم مضر میں مشغول ہو گئے اور عوام کی غلطی یہ ہے کہ وہ علم نافع کو بھی حاصل نہیں کرتے وہ اگر معقول سے بچے ہوئے ہیں تو دینیات سے بھی بے خبر ہیں اور یہ غلطی جو عوام کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت علماء ہی کی ذات مقدس سے نکلی ہے۔ کیونکہ ہر فتنہ ہمارے ہی سے نکلتا ہے عوام کا فساد اکثر کسی عالم کے فساد سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر بدعات و منکرات پھیلی ہوئی ہیں کسی عالم کا ہاتھ ان میں پہلے شریک ہوا ہے۔ بنا اس غلطی کی یہ ہے کہ عوام نے علم دین کو عربی ہی کی ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے اور عربی پڑھنے کی ہر ایک کو فرصت نہ تھی

تو اب انھوں نے اردو میں بھی مسائل نہ سیکھے کیونکہ اردو میں مسائل پڑھ لینے کو وہ علم ہی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ جب اردو میں پڑھ لینے کے بعد بھی ہم جاہل رہیں گے تو اس کی بھی کیا ضرورت ہے اور یہ غلطی ہماری پیدا کی ہوئی اس لئے ہے کہ آجکل واعظین جب علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں اور جتنی حدیثیں پڑھتے ہیں اس کی ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربی پڑھنی چاہئے اور جتنے عربی مدارس ہیں ان کی امداد کرنی چاہیئے پس اگرچہ یہ لوگ صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ علم دین عربی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ان سب فضائل پر عربی کی تعلیم کو متفرع کرنا اور مدارس عربیہ کی امداد پر توجہ دلانا لازمی طور پر عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ بس جتنے فضائل علم کے بیان کئے گئے ہیں یہ سب عربی ہی کے ساتھ خاص ہیں بدون عربی میں علم حاصل کئے یہ فضائل حاصل نہ ہوں گے۔

واعظوں کا مقصود تو محض مدارس کی امداد پر توجہ دلانا تھا مگر عوام اس سے یہ سمجھ گئے کہ یہ فضائل جبھی حاصل ہوں گے جبکہ عربی میں اس علم کو حاصل کیا جائے۔ شاید یوں سمجھے ہوں کہ عربی خدا تعالیٰ کی بولی ہے اور اردو ہماری بولی تو علم دین تو خدا تعالیٰ ہی کی بولی میں ہونا چاہیئے اور یہ مذاق صرف عوام ہی کا نہیں بگڑا بلکہ بعض طالبعلم بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں جیسے ایک طالب علم مولوی مغیث الدین تھے انھوں نے منیہ میں یہ مسئلہ پڑھا تھا کہ نماز کلام الناس سے باطل ہو جاتی ہے وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ اردو میں بات کرنے سے نماز فاسد ہوتی ہے۔ ایک دفعہ وہ کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ امام نے مغرب کی دوسری رکعت میں اتنا لمبا قعدہ کیا کہ مقتدیوں کو شبہ ہو گیا کہ بس اب سلام پھیر دیں گے تو مولوی مغیث الدین نے پیچھے سے آواز دی قُم یعنی کھڑے ہو جاؤ۔ امام کو یاد آگیا کہ یہ رکعت دوسری ہے وہ کھڑے ہو گئے۔ مولوی مغیث الدین اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ آج عربی نے بڑا کام دیا کہ ہم نے امام کی غلطی بھی دور کر دی اور ہماری نماز بھی فاسد نہیں ہوئی امام نے سلام پھیر کر پوچھا کہ یہ قُم کہنے والے کون صاحب تھے آپ آگے بڑھے کہ میں تھا انھوں نے کہا کہ آپ اپنی نماز دہرا لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی کیونکہ کلام الناس سے

نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو عربی میں کلام کیا تھا۔ امام نے کہا اچھا تو آپ کے نزدیک عربی کلام الناس نہیں ہے۔ جاؤ نماز کا اعادہ کرو۔ جب معلوم ہوا کہ عربی بھی بندوں کی زبان ہے۔ غرض اس غلطی میں لوگ بہت مبتلا ہیں اسی واسطے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز اردو یا فارسی میں دعا کرنے سے فاسد ہو جاتی ہے اگرچہ وہ اُسی درجہ کا ترجمہ ہو جو عربی میں پڑھی جاتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی اگرچہ غیر عربی میں دعا پڑھنا نماز کے اندر حرام ہے مگر حرمت سے فساد تو لازم نہیں آتا۔ پس اصل مدار تو مضمون پر ہے۔ جس مضمون کی دعا عربی میں پڑھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی اسی مضمون کی دعا اردو فارسی میں پڑھنے سے بھی فاسد نہ ہوگی صرف ممانعت ہوگی وہ بھی اس وقت جبکہ قصداً ایسا کیا ہو اور اگر بھولے سے یا غلبۂ حال میں ایسا ہو جائے کہ اردو یا فارسی کی دعا زبان سے نکل جائے تو کراہت بھی نہ ہوگی بشرطیکہ مضمون مفسد نہ ہو ہمارے حاجی صاحبؒ کے ایک خادم تھے جن کا نام مولوی تجمل حسین ہے جب وہ مکہ معظمہ گئے تو ایک دن صبح کی نماز شافعی امام کے پیچھے پڑھ رہے تھے۔ شافعیہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے ہیں حنفیہ اس وقت خاموش رہتے ہیں مولوی تجمل حسین پر قنوت سننے سے ایک حالت طاری ہوئی کہ سب تو خدا سے مانگ رہے ہیں اور میں بت کی طرح خاموش کھڑا ہوں ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے پندنامہ کے یہ اشعار شروع کر دیئے ؎

بادشاہا جرم ما را در گذار	ما گنہگاریم و تو آمرزگار
تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم	جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم
بر در آمد بندۂ بگریختہ	آبروئے خود بعصیاں ریختہ

(اے بادشاہ حقیقی ہمارے جرم کو بخشدے ہم گنہگار ہیں تو گناہ کا بخشنے والا ہے تو نکوکار ہے اور ہم نے بُرے کام کئے ہیں ہم نے جرم بے اندازہ بے حد کئے ہیں۔ دروازہ پر حاضر ہوا بندہ بھاگا ہوا اپنی آبرو کو گناہ سے کھوئے ہوئے)

انھوں نے یہ پوری نظم پڑھ ڈالی اور لوگ چاروں طرف سے متوحش ہو گئے کہ نماز میں

یہ کیا ہونے لگا۔ بعد نماز کے لوگوں نے کہا کہ ان کی نماز باطل ہوگئی دوبارہ پڑھنی چاہیئے۔ یہ خبر حاجی صاحب کو پہونچی حاجی صاحب پر نہ معلوم کیا کیا حالتیں گذری تھیں وہ سمجھ گئے کہ انھوں نے غلبۂ حال میں ایسا کیا ہے۔ فرمایا کہ نہیں نماز باطل نہیں ہوئی۔ واقعی صاحب حال کی حالت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گذری ہو اور جس پر یہ حالتیں نہ گذری ہوں وہ کیا سمجھ سکتا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہ لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

(اندھیری رات موجوں کا خوف اور ایسا بھنور ہائل ہمارا حال کنارہ دریا پر آرام سے کھڑے ہونے والوں کو کیا معلوم ہوسکتا ہے)

یعنی جو شخص ساحل پر آرام سے کھڑا ہے وہ اس شخص کی حالت کو کیا جانے جو دریا میں غوطے لگا رہا ہے کہ ان کو کن کن مصائب کا سامنا ہورہا ہے اس شعر کے متعلق ایک لطیفہ ابھی قلب پر وارد ہوا ہے وہ یہ کہ ساحل دو ہوتے ہیں ایک ادھر کا ساحل اور ایک اُدھر کا ساحل جس پر دریا کو عبور کرکے پہونچتے ہیں تو اس شعر میں ادھر کا ساحل مراد ہے اُدھر کا ساحل مراد نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص ابھی تک ادھر کے ساحل ہی پہ کھڑا ہے اور دریا میں اس نے قدم بھی نہیں رکھا اس کو دریا میں غوطہ لگانے والے کا حال کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس کو اُس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں اور جو شخص دریا میں گھس کر تیرتا ڈوبتا دوسرے ساحل پر پہونچ چکا ہو یعنی سلوک کو طے کرچکا ہو اس کو دریا میں چلنے والے کا حال معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ اس پر بھی ایک

وقت ایسا گذرا ہے جبکہ وہ دریا میں تیرتا اور ڈبتا ہوا چل رہا تھا اگرچہ اس وقت دوسرے
ساحل پر پہنچ جانے کی وجہ سے وہ چین میں ہے پس اس کو سا کنین پر اعتراض کا حق بھی
حاصل ہے پس اہل ساحل دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دریا میں گھسے ہی نہیں یہ تو دریا کی حالت
سے بالکل ناواقف ہیں دوسرے وہ جو دریا کو عبور کر کے ساحل پر پہونچا ہے ظاہر میں اس
کی حالت بھی پہلے اہل ساحل کے مشابہ ہے دونوں چین میں نظر آتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ
اس کو مصائب جھیلنے کے بعد چین نصیب ہوا ہے اور پہلے ساحل والوں کو مصائب کا
سامنا ہی نہیں ہوا تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لئے اس کو اعتراض کا حق ہے
مگر کورے اندھوں کو صاحب حال پر اعتراض کا کچھ حق نہیں۔ اسی واسطے حاجی صاحب
اس شخص پر جو اعتراض کرتے ان کو اس کا حق حاصل تھا مگر اس لئے اعتراض نہیں کیا کہ وہ
اس حالت کی حقیقت سے واقف تھے اور جنھوں نے اعتراض کیا ان کو یہ حق حاصل نہ تھا
غرض عام لوگ سمجھے تھے کہ اس صورت میں نماز باطل ہوگئی کیونکہ فارسی و اردو میں مطلقاً کچھ
پڑھنا عوام کے نزدیک مفسد صلوٰۃ ہے تو اس غلطی کا منشا وہی ہے کہ یہ لوگ عربی کو تو
خدا کی زبان سمجھتے ہیں اور اردو فارسی کو بندوں کی زبان۔ حالانکہ اگر کوئی مضمون فی نفسہ
مفسد ہو تو اگرچہ وہ عربی ہی میں کیوں نہ ہو مفسد ہوگا۔ جیسے مولوی مغیث الدین نے ذکر
کیا تھا اور اس سے نماز فاسد ہوگئی تھی۔ تو اس غلطی کا منشا زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے
کہ انھوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل
حاصل ہو سکتے ہیں جو احادیث و قرآن میں علم کے لئے وارد ہیں۔ حالانکہ حدیث و قرآن میں
کہیں عربی کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم مضر وہ ہے جو
آخرت میں کام نہ آوے اور نافع وہ ہے جو آخرت میں کام آوے۔ اس میں کہیں یہ قید نہیں
کہ وہ عربی میں ہونا چاہیئے۔ مگر شاید علماء نے یہ بات صاف صاف اس لئے نہیں کہی کہ
ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم یہ کہدیں گے کہ اردو میں مسائل جان لینے سے بھی علم کی یہ فضیلتیں
حاصل ہو سکتی ہیں تو پھر ہماری قدر نہ رہے گی پھر تو سارے ہی عالم ہو جاویں گے مگر
میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی علماء کو نقصان ہوا بلکہ دو نقصان ہوئے ایک عوام کو

ایک علماء کو۔ عوام کو تو یہ نقصان ہوا کہ انھوں نے جب علم کو عربی کے ساتھ مخصوص سمجھا اور عربی پڑھنے کی سب کو فرصت یا ہمت نہ ہوئی اور اردو میں پڑھنے کو وہ علم ہی نہ سمجھے تو مسائل شریعت سے بالکل بے خبر رہ گئے اور علم ہی سے محروم ہو گئے۔ علماء کا یہ ضرر ہوا کہ جب عوام علم سے بالکل محروم ہو گئے تو وہ علماء کی قدر و منزلت سے بھی اندھے ہو گئے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے جس کو کچھ تو اس سے مناسبت ہو۔ دیکھو اگر کوئی زمیندار ایک گانوں کے اندر بہت بڑے حصہ کا مالک ہو تو اس کی قدر و عظمت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا کچھ تھوڑا بہت حصہ اس گانوں میں ہو وہ جان سکتا ہے کہ یہ بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں اور جس شخص کا اس گانوں میں کچھ بھی حصہ نہ ہو وہ اس زمیندار کی قدر پوری طرح نہیں جان سکتا۔ اسی طرح جوہر کی قدر وہی کر سکتا ہے جس نے عمر بھر میں کبھی جواہر کو پرکھا ہو۔ ناواقف کی نظر میں تو ایک معمولی لال پتھر اور یاقوت دونوں یکساں ہیں ؎

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری
(گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری)

تو اے صاحبو! اگر تم عوام کو بادشاہ بنانا نہیں گوارا کرتے تو کم از کم ان کو جوہری تو بنا دیا ہوتا تاکہ ان کو اس جوہر کی قدر ہوتی جو آپ کے پاس ہے اور اب جبکہ وہ دین سے بالکل ہی محروم ہو گئے وہ جانتے ہی نہیں کہ عربی پڑھنے والے کے پاس کیا جوہر ہے تو وہ آپ کی قدر کیا خاک سمجھیں گے۔ ہاں اگر وہ کچھ عقائد اور احکام اردو میں پڑھ لیتے پھر ان ہی عقائد و احکام کی تحقیق آپ کی زبان سے سنتے اس وقت ان کو معلوم ہوتا کہ علماء کے پاس یہ جواہرات ہیں اس وقت البتہ ان کو علماء کی قدر ہوتی مگر خدا کے واسطے کوئی صاحب اسی نیت سے عوام کو تعلیم نہ دینے لگیں یہ تو میں نے اس لئے بیان کر دیا ہے کہ اگر کسی کو اردو میں علم پڑھانے سے اس لئے رکاوٹ ہو کہ ہماری قدر کون کرے گا تو وہ یہ سمجھ لے کہ اردو میں اگر عوام کو دین کا علم حاصل ہو گیا تو وہ اس وقت سے زیادہ آپ کی قدر کریں گے یعنی یہ میں بطور تنزل کے کہتا ہوں کہ

بیقدری کا اندیشہ مت کرو ورنہ حقیقت میں عوام کی قدر و بیقدری ہی کیا جس کی پروا کی جائے عوام کی رضا اور اعتقاد ہے کیا چیز جس کا خیال کیا جاوے علما کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے ؎

دلا را مے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(اے دل جس کو تو دوست رکھتا ہے اسی میں دل لگا اور تمام جہان سے آنکھیں بند کرلے)
عوام قدر کر کے تم کو کیا دیں گے صرف دنیا کے چند ٹھیکرے تو اس کی اُس کمال کے سامنے ہستی کیا ہے جو علم سے آپ کو حاصل ہے ؎

خلیل آسا درِ ملک یقین زن
نوائے لا احب الآفلین زن

(یعنی ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کرے لا احب الآفلین (میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا) کی صدا لگاؤ)

؎ زر و نقرہ چیست تا مجنوں شوی
چیست صورت تا چنیں مفتوں شوی

(زر و نقرہ کیا چیز ہے کہ ان کے مفتون ہوتے ہو اور یہ عالم صورت (دنیا) کیا چیز ہے کہ اس پر ایسے مجنوں بنے ہوئے ہو)

مگر افسوس آجکل علماء میں یہ مذاق بہت ہی کم رہ گیا ہے آجکل اکثر لوگ علم کے بعد بھی عوام کی نظروں میں جاہ اور قدر و منزلت کے طالب ہیں یہی وجہ ہے کہ عوام کی خاطر وہ بعض دفعہ ایسے کاموں میں پڑ جاتے ہیں جن کو اندر سے ان کا دل قبول نہیں کرتا۔ بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں جگہ رہ کر عوام کی نظروں میں ہماری وقعت نہ ہوگی یا کم ہوگی تو اس جگہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں اور ایسی جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں ان کی وقعت زیادہ ہو بعض لوگوں کو اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ جب ہم بازار میں یا کسی اور جگہ جاویں تو دو چار آدمی ہمارے ساتھ چلنے والے ہوں

تنہا چلنا انھیں گوارا نہیں ہوتا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ جب آپ کی ساتھ راستہ میں کچھ صحابہ ہو جاتے تو آپ بعض کو آگے کر دیتے اور بعض کو پیچھے آپ سب کے آگے نہ چلتے تھے اسی طرح مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جگہ پاتے وہیں بیٹھ جاتے آپ کی نشست کے لئے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی حتیٰ کہ باہر سے آنے والوں کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مجمع میں کون سے ہیں جبتک کہ وہ خود یہ سوال نہ کرتا مَنْ مُحَمَّدٌ (صلے اللہ علیہ وسلم) مِنْكُمْ کہ تم میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سے ہیں صحابہؓ اس کے جواب میں فرماتے ھٰذَا الْاَبْیَضُ الْمُتَّكِئُ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہونچے تو مدینہ منورہ والے شہر سے باہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کیلئے حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بھی آپ کے ساتھ تھے اور حضرت ابوبکرؓ کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ڈھائی برس ہی کم تھی مگر ان کے قویٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نہ تھے۔ اسی لئے وہ باوجود چھوٹے ہونے کے دیکھنے میں بڑے معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ نہایت اچھے تھے اس وقت آپ کا ایک بال بھی غالباً سفید نہ ہوگا کیونکہ وصال کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم چند گنتی کے بال سفید تھے اور ہجرت کا واقعہ وصال سے دس برس پہلے ہوا ہے تو اس وقت تو ایک بال بھی شاید آپ کا سفید نہ ہوگا۔ اس لئے اکثر لوگ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سمجھے پس سب لوگ حضرت ابوبکرؓ ہی سے آکر مصافحہ کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مصافحہ نہ کرتا۔ مگر اللہ رے تواضع کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے خود یہ فرمایا کہ مجھ سے مصافحہ کرو میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور حضرت ابوبکرؓ کی یہ سادگی کہ انھوں نے مصافحہ سے انکار نہ کیا جو کوئی ان سے مصافحہ کرتا بے تکلف ہاتھ بڑھا دیتے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت کا خیال کیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بھی تکلیف کیوں دی۔ الغرض دیر تک لوگ حضرت ابوبکر ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے رہے۔ تھوڑی

دیر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آنے لگی اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنے چادرہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کرنے لگے جب سب کو معلوم ہوا کہ یہ خادم ہیں جن سے پہلے مصافحہ کیا تھا اور دوسرے مخدوم ہیں۔ بھلا کچھ حد ہے اس تواضع اور سادگی کی۔ مگر آجکل تو لوگ خود بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کوشش بھی نہ کرے تو عوام کے مصافحہ اور ہاتھ پیر چومنے سے اس کو شبہ ہو جاتا ہے کہ میں ضرور کچھ ہوں جبھی تو یہ لوگ میری اس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ انسان کو اپنے عیوب حالانکہ خوب معلوم ہوتے ہیں جن کو دوسرے نہیں جانتے تو گویا دوسرے لوگ اس کے عیوب سے جاہل ہیں مگر یہ شخص اُن جاہلوں کی تعظیم و تکریم سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں واقع میں اسی قابل ہوں اور جو عیوب اُسے یقیناً اپنے اندر معلوم ہوتے ہیں ان سے قطع نظر کر لیتا ہے بلکہ ان کو بھول جاتا ہے جیسے حکایت ہے کہ ایک نائن نے ایک بی بی کو نتھ اُتار کر منہ دھوتے دیکھا۔ نتھ اوتارنے سے سمجھی کہ بیوہ ہو گئی۔ دوڑی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آئی کہ کیا بیٹھا ہے فلانے کے پاس (یعنی اس بی بی کے شوہر کے پاس) دوڑ اور خبر کر کہ تمہاری بی بی بیوہ ہو گئی وہ نائی بھی ایسا ہی احمق تھا پہونچا وہ شخص بھی بیوقوف ہی تھا۔ نائی سے پوچھا کہ گھر میں خیریت ہے۔ نائی نے کہا کہ حضور اور تو سب خیریت ہے مگر آپ کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ بس یہ خبر سنکر آپ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک دوست اُن سے ملنے آئے پوچھا خیر تو ہے یہ رونا پیٹنا کیوں ہو رہا ہے کہنے لگے کہ میری بیوی بیوہ ہو گئی ہے۔ اُس نے کہا کہ خدا کے بندے ہوش سے کام لے۔ جب تو زندہ سلامت موجود ہے تو بیوی کیونکر بیوہ ہو گئی۔ تو تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر گھر سے آیا ہے معتبر نائی۔

بس یہی حالت آجکل اکثر لوگوں کی ہو رہی ہے کہ وہ اپنے عیوب کو اچھی طرح جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں مگر لوگوں کی تعظیم و تکریم سے یہ خیال کرتے ہیں کہ معتبر لوگ میرے معتقد ہیں کہ شاید ان لوگوں کو میری حالت مجھ سے زیادہ معلوم ہو اور میرے اندر وہ عیوب بھی شاید نہ ہوں جو مجکو معلوم ہوتے ہیں

بس وہی قصہ ہو رہا ہے کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی ؂

ایک میانجی لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آج کسی طرح چھٹی لینی چاہیئے سب کے اتفاق سے یہ بات قرار پائی کہ جب میانجی آدیں تو ایک لڑکا غمگین صورت بنا کر ان سے یہ کہے کہ حضور خیر تو ہے آج آپ کا چہرہ کچھ اُترا ہوا ہے پھر سب لڑکے ایک ایک کرکے یہی کہیں۔ چنانچہ میانجی آئے اور ایک لڑکا منہ بنا کر اُن کے پاس گیا اور کہا حضور آج مزاج کیسا ہے خیر تو ہے کچھ چہرا اُترا اُترا معلوم ہوتا ہے میانجی نے اُس کو تو ڈانٹ دیا کہ جا بیٹھ کام میں لگ میں تو اچھا خاصا ہوں ابھی پیٹ بھر کے کھانا کھا کر آیا ہوں وہ تو بیٹھ گیا دوسرا پہونچا میانجی نے اس کو بھی دھتکار دیا۔ تیسرا پہونچا اب میانجی کو وہم ہونا شروع ہوا اسے بھی ٹال دیا مگر نرمی سے اب وہ تیزی نہ رہی۔ چوتھا پہونچا اب تو میانجی کو قوی شبہ ہو گیا کہ واقعی میرا چہرہ اتر رہا ہوگا جبھی تو یہ سب کے سب مزاج پرسی کر رہے ہیں اس کے بعد ایک اور آیا بس اب تو ان کو خاصا بخار ہو گیا اور کپڑا اوڑھ کر گھر چل دیئے اور مکتب بند کر دیا لڑکوں کو چھٹی مل گئی۔ اب ملاجی گھر میں پہونچے آہ آہ کرتے ہوئے بیوی نے کہا کہ کیا ہوا ابھی تو یہاں سے اچھے خاصے گئے تھے ملاجی کہاں تھے ڈنڈا لے کر اس کے سر ہو گئے کہ تو تو یہی چاہتی ہے کہ میں مرجاؤں اور تو دوسرا نکاح کر لے۔ یوں کہتی ہے کہ تم تو ابھی اچھے خاصے گئے تھے میں اچھا خاصا گیا تھا۔ اسی وقت میرا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ لڑکوں کو معلوم ہو گیا اور تجھے نہ معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوں۔ غرض اس قصہ میں آس پاس کے لوگ بھی آگئے اور پوچھنے لگے کہ ملاجی کیوں غصے ہو رہے ہو ملاجی نے بیوی کی شکایت کی۔ جب ایک شخص نے کہا کہ میانجی تمہاری عقل کہاں ہے یہ تو لڑکوں کی ایک شرارت تھی وہ تم سے چھٹی لینا چاہتے تھے اور وہ ابھی راستہ میں کہتے جا رہے تھے کہ آج ہم نے خوب چھٹی لی تم بیوقوف تھے اُن کے بہکانے میں آگئے۔ تب ذرا ملاجی کے حواس درست ہوئے۔

صاحبو! اس حکایت میں تو ہر شخص اس ملا کو بیوقوف بتانے کو تیار ہوگا مگر

اس کی خبر نہیں کہ اس بیوقوفی میں ہم سب مبتلا ہیں کہ جہاں چار آدمیوں نے ہمارے ہاتھ پیر چومنے شروع کئے اور ہم کو سچ مچ اپنی بزرگی کا وہم ہونے لگا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمی گوید نے منم انباز تو — آں ہمی گوید نے منم ہمراز تو

او چو بیند خلق را سرمست خویش — از تکبر می رود از دست خویش

(ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں۔ وہ شخص جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے)

؎ اشتہار خلق بند محکم ست — بند او از بند آہن کے کم ست

(مخلوق کی شہرت اللہ تعالیٰ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے)

؎ خویش را رنجور ساز و زار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں)

یہ تو باطنی ضرر ہے عوام کی تعظیم و تکریم میں اور ظاہری ضرر دنیا کا یہ ہوا کہ ؎

خشمہا و چشمہا و رشکہا

بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

کہ جہاں عوام نے کسی کی تعظیم و تکریم زیادہ شروع کی اور لوگوں کو اس کی ساتھ حسد ہوا اور بہت سے دشمن اُس کے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس تعظیم و تکریم کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے رات دن اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اس کو عوام کی نظروں سے گرا دیں۔ بس عافیت میں وہ لوگ ہیں جو گمنام ہیں جن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں نہ اُن سے کسی کو حسد ہے نہ عداوت ؎

آنانکہ بکنج عافیت بنشستند دندان سگ و دہان مردم بستند

(جن لوگوں نے گوشۂ عافیت اختیار کی کتوں کے دانتوں اور لوگوں کی زبان کو بند کر دیا۔)

کاغذ بدریدند و قلم بشکستند وز دست و زبان حرف گیران رستند

(کاغذ پھاڑے قلم توڑے عیب پکڑنے والوں کی زبان اور ہاتھ سے چھوٹ گئے)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عوام کی قدر اور تعظیم و تکریم اور ان کی نظروں میں عزت وجاہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی طلب کی جائے ایسی تیسی عوام کی رضا کی انسان کو خصوصی عالم کو رضائے حق کا طالب ہونا چاہیئے کیونکہ عوام کے اعتقاد کی مضرتیں میں آپ کو بتلا چکا ہوں کہ اس سے باطن وظاہر دونوں کا ضرر ہوتا ہے اِلَّا مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائیں) پس علماء کو علم کی فضیلت عربی ہی کے ساتھ خاص نہ کرنا چاہیئے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر اردو پڑھنے والا بھی عالم کی برابر فضیلت میں ہو گیا تو ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس خیال کو دل سے نکال دو اور اپنے کو مٹا دو دیکھو پھر تمہاری ہی قدر ہو گی کچھ خاصیت ہے مٹانے ہیں کہ اس سے زیادہ شہرت ہوتی ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ طالب جاہ ہیں ان کو جاہ حاصل کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔ جاہ بھی ترک جاہ ہی سے حاصل ہوتی ہے طلب سے حاصل نہیں ہوتی۔ مگر اس نیت سے اگر کوئی ترک جاہ کرے تو وہ یاد رکھے کہ ثواب کچھ نہ ہوگا تواضع اس نیت سے کرنا کہ ہم متواضع مشہور ہو جائیں گے تکبر ہی میں داخل ہے۔ پس مٹانے میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے شہرت ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

(اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ گمنامی اختیار کرو کہ عنقا گوشہ گمنامی اختیار کرنے سے مشہور ہے)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم سارے عالم کو عالم بنادو گے جب بھی بڑے تم ہی ہوگے۔ کیونکہ تم پھر بھی استاد ہوگے اور سب لوگ تمہارے شاگرد ہوں گے۔ شاگرد چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے آخر تو رتبہ میں استاد سے کم ہی ہے گو ظاہر میں بڑا معلوم ہو جیسے کوئی شخص اپنے چھوٹے بھائی کو خوب دودھ گھی کھلاوے تاکہ موٹا تازہ ہو جاوے اور چند سال میں وہ ایسا تیار ہو جائے کہ بڑا بھائی اُس سے چھوٹا معلوم ہونے لگے تو کیا رتبہ میں بھی وہ چھوٹا ہو جائے گا ہرگز نہیں بڑا بھائی پھر بھی بڑا ہی رہے گا۔ اور جب سب لوگ تمہارے شاگرد ہو جاویں گے اُس وقت تمہاری اس وقت سے زیادہ قدر ہوگی کیونکہ وہ جانیں گے کہ ان کے پاس علمی جوہر ہے۔ میزان پڑھنے والا شرح ملا جامی پڑھنے والے کی اس لئے قدر کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس درجہ کا طالب علم ہے اور جس نے کچھ بھی نہ پڑھا ہو اس کے نزدیک میزان اور شرح جامی پڑھنے والا یکساں ہے۔ الغرض علماء کو چاہیئے کہ نصاب تعلیم کو وسیع کریں۔ پس ایک نصاب تو مکمل ہونا چاہیئے ان لوگوں کے لئے جن کو عربی پڑھنے کے لئے فراغت اور فرصت ہے۔ دوسرا نصاب عربی میں ان لوگوں کے لئے ہونا چاہیئے جن کو عربی پڑھنے کا شوق ہے مگر فرصت کم ہے۔ تیسرا نصاب اردو میں ان لوگوں کے لئے ہونا چاہیئے جو عربی نہیں پڑھ سکتے ان کو اردو میں ضروریاتِ دین پڑھا کر عقائد و احکام معاملات سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ اور ایک چوتھا نصاب اُن بوڑھے طوطوں کے لئے مقرر کرنا چاہیئے جو اردو بھی نہیں پڑھ سکتے کیونکہ ان بوڑھے آدمیوں کو اب مکتب میں جاکر پڑھنا دشوار ہے ان کے لئے یہ تدبیر ہونی چاہیے کہ ایک عالم ہر ہفتہ میں کتاب ہاتھ میں لیکر ان کو مسائل سنا دیا کرے اور اچھی طرح سمجھا دیا کرے۔ اس طریقہ سے گاؤں والے بھی تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ گانوں والوں کو چاہیئے کہ ایک عالم کو اپنے گانوں میں رکھ لیا کریں دس پندرہ روپے ماہوار میں ایسا عالم ان کو مل جائیگا جو ضروری ضروری مسائل ان کو بتلا دیا کرے گا۔ اور علماء کو بھی چاہیئے کہ دیہات والوں کی تعلیم کی طرف توجہ کریں اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر تم ان کو تعلیم یافتہ بنادوگے

تو وہ کسی کے دھوکہ میں نہ آئیں گے ورنہ کوئی دوسرا جاہل واعظ ان کو بہکا دے گا پھر جو رونق آج تمہاری گانوں میں ہورہی ہے وہ سب جاتی رہے گی چنانچہ ایسے قصے بہت پیش آتے ہیں ایک شخص گانوں میں گیا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ان ملاؤں کو یہاں سے نکلوانا چاہیئے اس لئے یہ تدبیر کی ملاؤں کا امتحان لینا شروع کیا سب سے پوچھتا کہ نمی دانم کے کیا معنی ہیں اگر اس کو معنی معلوم نہ ہوئے تب تو وہ ذلیل ہوتا ہی تھا اور اگر معنے معلوم ہوئے تب بھی وہ یہی کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا کیونکہ نمی دانم کے معنے یہی ہیں اس پر وہ کہدیتا کہ دیکھو خود اقرار کرلیا کہ میں نہیں جانتا اپنی جہالت کا خود معترف ہے پس گانوں والے سمجھ جاتے کہ واقعی یہ ملا جاہل ہے اس کو نکالنا چاہیئے ایک اور شخص گانوں میں گیا اور وہاں کے ملا سے پوچھا کہ بتلاؤ ایمان نقطہ دار ہے یا بے نقطہ دار۔ ظاہر میں تو اس کے جواب میں یہی کہا جاتا کہ منقوط ہے کیونکہ ایمان میں ی اور ن منقوط ہیں مگر اس کا یہ مقصود ہی نہ تھا وہ ملا بڑا ہوشیار تھا اس نے کہا کہ ایمان غیر منقوط ہے ممتحن نے پوچھا کیسے اس نے کہا دیکھو ایمان لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ (صلے اللّٰہ علیہ وسلم) کا نام ہے اور اس کلمہ میں کسی حرف پر نقطہ نہیں اس پر وہ ممتحن بولا کہ تم نے جواب تو صحیح دیا مگر وجہ غلط بیان کی اس نے کہا اچھا تم صحیح وجہ بتلاؤ کہنے لگا کہ ایمان اس واسطے غیر منقوط ہے کہ جب تم کسی سے پوچھتے ہو کہ تم مسلمان ہو تو وہ جواب میں کہتا ہے الحمد للّٰہ اور دیکھو اس میں نقطہ نہیں اس ملا کو فکر ہوئی کہ کسی طرح اس بات کو گانوں والوں کے سامنے غلط کرنا چاہیئے کہنے لگا کہ یہ وجہ بالکل صحیح نہیں کیونکہ لوگ اس سوال کے جواب میں الحمد للّٰہ نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں شکر الحمد للّٰہ اور اس جواب میں شین پر نقطے ہیں اس لئے وجہ وہی صحیح ہے جو میں نے بیان کی بس اتنی بات پر ملا جیت گیا اور گانوں میں شہرت ہوگئی کہ ہمارا ملا بڑا پڑھا ہوا ہے غرض گانوں والوں کو پڑھا دینے میں یہ بھی نفع ہے کہ تم گانوں میں جمے رہو گے کوئی ان کو بہکا نہ سکے گا، یہ تو ہنسی کی بات تھی اگر تم جم بھی نہ سکو تو تمہارا اجر خدا کے ذمہ ہے ثواب تو کہیں نہیں گیا یہ کیا تھوڑی بات ہے اس لئے تم روٹیوں کی

فکر نہ کرو خدا کو راضی رکھنے کا قصد کرو۔ عالم کو روزی کا فکر نہ کرنا چاہیئے اس کی تو یہ شان ہونی چاہیئے ؎

لے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلی کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب (عشق الٰہی) سے تو مست رہے بغیر چاندی سونے کے خزانوں کے تو دولت ہو جائے لیلیٰ (محبوب حقیقی کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں پہلی شرط اس راہ کے لئے مجنوں بن جانا ہے)

اور عالم کو اپنی فاقہ مستی پر نازاں ہونا چاہیئے۔ مخلوق کے روپے پر نظر نہ کرنی چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم

مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر تلاش دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور ان کی محبت کے متوالے ہیں)

اوست دیوانہ کہ دیوانہ۔ نہ شد

مرعسس را دید و درخانہ۔ نہ شد

(جو دیوانہ نہیں وہ ہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں خود وہ لذت ہے جس کے سامنے تمام لذتیں ہیچ ہیں عالم ہوکر پھر دنیا کی طمع ہو تعجب ہے دنیا ہے کیا چیز علم کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ رہا روٹی کپڑا سو اس سے بیفکر رہو جس کے پاس علم ہو وہ بھوکا نہیں رہا کرتا اور اس سے زیادہ کی تم کو ضرورت نہیں پس اہل علم کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہیئے کہ اہل دنیا کو ہرگز یہ وسوسہ بھی نہ آسکے کہ علماء کو ہماری طرف احتیاج ہے۔

صاحبو! کیا تم کیمیا گر سے بھی گئے گذرے کہ وہ ذرا بھی بے حقیقت چیز پر ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ نوابوں اور بادشاہوں کی بھی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتا او تمھارے پاس اتنی بڑی کیمیا ہے جس کے سامنے ہزار کیمیا گرد ہیں یہ علم کی کیمیا وہ چیز ہے جس سے جنت اور رضائے حق نصیب ہوتی ہے جس کے آگے واللہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ ہے پھر حیرت ہے کہ تم اتنے بڑے کیمیا گر ہو کر اہل دنیا کی خوشامد کرو اُن کے روپے پیسے پر نظر کرو پس تم کو اس کی فکر نہ کرنی چاہیئے کہ سب لوگوں کو عالم بنانے کے بعد ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو خدا پوچھے گا جس کے ہاتھ میں زمین آسمان کے خزانے ہیں اور جب خدا تم کو پوچھے گا تو وہ ہرگز تم کو بھوکا نہ مارے گا پھر تم کو کیا فکر لہٰذا علم دین کی تعلیم بہت عام ہونی چاہیئے جس کا طریقہ میں بتلا چکا ہوں۔ اب صرف عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ رہ گیا سو عورتوں کو ان کے مرد پڑھا دیا کریں اور جب ایک عورت تعلیم یافتہ ہو جائے تو پھر وہ بہت سی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے۔ لیجئے میں نے ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تھوڑے ہی عرصہ میں سب مسلمان عالم بن سکتے ہیں مگر اس طریقہ پر عمل کرنا شرط ہے اور وہ بھی استقلال کے ساتھ مگر افسوس یہی ہے کہ مسلمانوں میں استقلال نہیں کسی کام کو نباہ کر نہیں کرتے اور علم نباہنے کی چیز ہے کیونکہ اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ساری عمر کا کام ہے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش | تادم آخر دمے فارغ مباش
تا دمے آخر دمے آخر بود | کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو آخر وقت تک تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہم راز اور رفیق بن جائے گی)

جیسا کہ ایک ظریف بزرگ نے ایک لڑکے کی بابت پوچھا تھا کہ یہ کیا پڑھتا ہے باپ نے کہا کہ حضرت قرآن حفظ کرتا ہے فرمایا ارے بھائی کیوں جنم روگ لگایا۔ انھوں نے قرآن حفظ کرنے کو جنم روگ کہا۔ کیونکہ واقعی قرآن کا حفظ کرنا تو ایک دو

سال کا کام ہے مگر اس کی نگہداشت ساری عمر کا کام ہے جہاں ذرا غفلت کی اور یہ ذہن سے نکلا اس لئے ہر سال اس کا دور اور تکرار کرنا اور محراب سنانا اور روزانہ منزل پڑھتے رہنا ضروری ہے اسی لئے اس کو جنم روگ کہا۔ مگر ایسا روگ مبارک ہے جس سے خدا راضی ہو اسی طرح سمجھ لو کہ یہ علم بھی جنم روگ ہے اس کا سلسلہ ساری عمر باقی رکھنا چاہیئے۔ حدیث میں ہے مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ الدُّنْيَا وَطَالِبُ الْعِلْمِ یعنی دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے ایک طالب دنیا کہ دنیا سے اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا دوسرے طالب علم کہ جب علم کا چسکہ اس کو لگ جاتا ہے تو پھر اُس کا پیٹ بھی علم سے نہیں بھرتا اور وجہ یہ ہے کہ علم کا سلسلہ غیر متناہی ہے تو اس کی طلب بھی غیر متناہی ہوتی ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہرچہ بروے میرسی بروے ایست

(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہونچو اس پر مت ٹھیرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

اگر آپ یہ کہیں کہ ساری عمر کا سلسلہ تو ہم سے نہیں ہو سکتا ایک دو دن کا کام ہو تو کر لیا جائے میں کہتا ہوں کہ پھر کھانا بھی چھوڑ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ ہم سے یہ دو وقت کی روٹی کا دھندا نہیں ہو سکتا آخر اس دھندے کو ساری عمر کے لئے آپ نے کیونکر گوارا کر لیا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ وہ تو غذا ہے جس پر زندگی موقوف ہے میں کہتا ہوں کہ وہ جسمانی غذا ہے اور علم روحانی غذا ہے۔ روحانی زندگی علم ہی پر موقوف ہے اور جس طرح روٹی کھانا آپ کو روزانہ سہل ہے اسی طرح آپ علم میں مشغول ہو کر دیکھیں پھر وہ بھی آپ کے لئے سہل ہو جائے گا اور جب علم کا چسکا لگ جائے گا تو پھر آپ کو اس کے بغیر چین نہ آئے گا۔ پھر اس میں ایک بڑا نفع یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا اس سے حاصل ہوتی ہے جو شخص طلب علم میں مرتا ہے اس کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔

صاحبو! حق تعالیٰ اپنے بندوں سے راضی ہونے کے واسطے بہانہ ڈھونڈھتے ہیں امام محمدؒ کو کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا حکم ہوا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے ارشاد ہوا کہ اگر ہم تم کو عذاب کرنا چاہتے تو علم عطا نہ کرتے تم کو ہم نے اپنا علم اسی لئے عطا کیا تھا کہ ہم تم کو بخشنا چاہتے تھے لہذا مغفرت تو ہے ہی کچھ اور مانگو۔ سبحان اللہ دیکھئے علم دین کی کیسی فضیلت ہے واقعی حق تعالیٰ بخشنے کے واسطے بہانہ ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ خود ارشاد فرماتے ہیں

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

یعنی اگر تم خدا کی نعمتوں کا شکر کرو جس کی تفسیر یہ ہے کہ ایمان لے آؤ یہ واؤ عطف تفسیری کے لئے ہے تو حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے یعنی تمہاری عذاب کرنے میں خدا کا کونسا نفع ہے اور حق تعالیٰ بڑے قدر دان ہیں جاننے والے ہیں ان کو سب خبر ہے کہ کون ایمان دار ہے کون نہیں اور وہ ہر مسلمان کے ایمان کی قدر فرمائیں۔ اس آیت میں کیسی بلاغت ہے یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو ہم تم کو عذاب نہ کریں گے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ہم تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اس عنوان میں جس قدر بلاغت ہے اہل لسان واہل ذوق اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ واقعی حق تعالیٰ کا ہمارے عذاب میں کیا نفع ہے وہ تو ہر وقت بخشنے کے لئے تیار ہیں کوئی اپنے کو بخشوانا بھی چاہے ایک بت پرست ہمیشہ بت کو پوجتا تھا اور نوے سال تک صنم صنم کا ورد کرتا رہا۔ ایک دن بھولے سے اُس کی زبان سے بجائے صنم کے صمد نکل گیا فوراً آواز آئی لَبَّيْكَ يَا عَبْدِیْ لَبَّيْكَ کہ اے میرے میں موجود ہوں اس آواز پر وہ رونے لگا اور بت کو اٹھا کر پھینک دیا کہ کمبخت تجھ کو نوے سال تک میں پکارتا رہا اور تو نے ایک دن بھی میری بات کا جواب نہ دیا میں قربان جاؤں اس خدا کے جس سے نوے سال تک میں بے رخی کرتا رہا اور ایک بار بھولے سے اس کا نام زبان سے نکل گیا تو اس نے فوراً مجھ پر توجہ کی۔

صاحبو! جب ایک بت پرست کے بھولے سے یاد کر لینے پر اتنی توجہ ہوتی ہے تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ مسلمانوں پر متوجہ نہ ہوں گے اگر وہ خدا کو راضی کرنا چاہیں ضرور متوجہ ہوں گے۔ ذرا آپ خدا کو راضی کرنے کا قصد تو کیجئے وہ تو یوں فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(لوٹ تو لوٹ تو جو کچھ بھی ہے لوٹ اگر کافر اور آتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی ہے تو بھی ہماری طرف لوٹ۔ یہ ہمارا دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو بار توبہ تو نے توڑی ہے تو بھی ہماری طرف جھک)

تو علم میں یہ کتنا بڑا نفع ہے کہ اس سے رضائے حق نصیب ہوتی ہے اس لئے اس کے سلسلہ کو بند نہ کرنا چاہئے اور اگر کبھی سلسلہ ٹوٹ جاوے تو اس کو پھر جوڑ لینا چاہئے اگر کسی سے پابندی کے ساتھ نہ ہوسکے تو بدون پابندی ہی کے علم حاصل کرتا رہے نہ ہونے سے ہونا پھر بھی غنیمت ہے۔ اسی طرح کرتے کرتے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن نظام بھی پیدا ہو جائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(محبوب حقیقی اس آشفتگی یعنی طلب کو پسند فرماتے ہیں سعی اگرچہ بے ثمر ہو مگر تعطل سے بہتر ہے۔)

واقعی مولانا بڑے حکیم ہیں کسی حال میں سالک کو مایوس نہیں کرتے فرماتے ہیں کہ اگر ذکر و شغل میں پابندی اور انتظام نہ ہو تو اسی طرح بغیر پابندی اور بے ڈھنگے پن ہی سے کہتے رہو دوست کو یہ بھی محبوب ہے۔ آگے دلیل کیا عمدہ بیان فرمائی ہے کہ بے ڈھنگی کوشش سو رہنے سے تو بہتر ہی ہے۔ کیونکہ یہ شخص کوشش تو کر رہا ہے۔

اور جو بالکل ہی چھوڑ کر الگ ہو گیا وہ تو اتنی کوشش بھی نہیں کرتا اور اگر کسی سے تعلیم و تعلم کا مشغلہ بالکل ہی نہ ہو سکے اس کو چاہیئے کہ کم از کم علماء سے ملتا جلتا رہے اور ان سے دین کے مسائل پوچھتا رہے اور ان کی صحبت میں کچھ عرصہ تک مقیم رہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ علم میں مشغول ہونے کے ساتھ بھی اس کو اختیار کرنا چاہیئے۔
فقط کتابیں پڑھ لینے پر کفایت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ ایک چیز ایسی ہے جو بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوتی وہ دین کی مناسبت ہے۔ دین کے ساتھ تعلق اور مناسبت بدون صحبت کے نہیں ہوتی۔ صحبت کا وہ اثر ہے جس کو شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عنبری — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہما خاکم کہ ہستم

(حمام میں ایک خوشبودار مٹی ایک محبوب کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں پہونچی میں نے اس سے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دلآویز بو سے میں مست ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں وہی ناچیز مٹی ہوں جو تھی لیکن ایک عرصہ تک گلاب کے ساتھ بیٹھی ہوں ہمنشیں کے جمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی خاک ہوں کہ ہوں میں)

دیکھئے گلاب کے پاس رہنے سے مٹی میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اہل محبت کے پاس رہنے سے خدا کی محبت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہونچ سکتا حالانکہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ بہت سے علوم تو صحابہ کے بعد پیدا ہوئے ان کے زمانہ میں ان علوم کا پتہ بھی نہ تھا جو آجکل کثرت سے موجود ہیں اُن کا یہی کمال تھا کہ

وہ ان علوم میں مشغول نہ ہوئے تھے کیونکہ ؎

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند ۔۔۔ دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند ۔۔۔ اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(دل فریباں نباتی یعنی خود رو محبوب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے پھلدار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا کہ ہر غم سے آزاد ہے)

بس صحابہ کا بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا آپ کی صحبت ان کو نصیب تھی پس یاد رکھو کہ صحبت بدون علم متعارف کے مفید ہو سکتی ہے مگر علم متعارف بدون صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آجکل بہت سے علماء نظر آتے ہیں مگر ان میں کام کے علما دو چار ہی ہیں جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ الغرض میں نے ثابت کر دیا کہ علم سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے اور کسی کے پاس جاہل رہنے کے لئے کوئی عذر نہیں گو عربی میں اور درس کے طور پر نہ سہی البتہ یہ جو طبقہ متمول مال داروں کا ہے جن کو خدا نے ہر طرح سے دنیا کی فراغت عطا کی ہے کہ نہ ان کو ملازمت کی ضرورت ہے نہ کھانے پینے کا فکر ہے خدا کا دیا ہوا ان کے پاس سب کچھ ہے اور اتنا ہے کہ کئی پشتوں کے لئے کافی ہے ان کے ذمہ ضرور یہ حق ہے کہ یہ لوگ متبحر عالم بنیں کیونکہ آجکل جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کو بہت جلد اہل وعیال کے نفقہ کی فکر ہو جاتی ہے اس لئے وہ کمال تبحر حاصل نہیں کر سکتے مگر نہایت افسوس ہے کہ ان لوگوں کو کچھ بھی فکر نہیں یہ لوگ اگر ساری عمر علم میں گذار دیں تو ان کو بہت آسان ہے مگر سب سے زیادہ بے توجہ یہی طبقہ ہے اور اگر کچھ توجہ ہے بھی تو انگریزی کی طرف میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لوگ انگریزی نہ پڑھیں نہیں اپنی دنیوی ضروریات کے لئے ضرور پڑھیں مگر ان کو ڈگری اور پاس حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ یہ لوگ ملازمت سے مستغنی ہیں جب ان کو ملازمت کی ضرورت نہیں تو بس بقدر ضرورت اپنے گھر پر کسی ماسٹر کو ملازم رکھ کر

انگریزی سیکھ لیں جس سے اپنی ریاست و تجارت کا کام چلا سکیں اور بقدر ضرورت انگریزی بہت جلد آسکتی ہے زیادہ عرصہ تو اس ڈگری اور پاس میں لگتا ہے تو ان لوگوں کو انگریزی پڑھنے سے میں منع نہیں کرتا ہاں یہ کہتا ہوں کہ بہت پاس نہ جائیں دور ہی دور رہیں اور اتنی انگریزی تو عربی سے فارغ ہوکر نے کے بعد بھی یہ لوگ سیکھ سکتے ہیں مگر یہ لوگ تو زیادہ مال و جاہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اس لئے انگریزی میں ڈگریاں حاصل کر کے ملازمت کرتے ہیں۔ اس حرص کی وجہ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ دین سے محروم ہے حالانکہ ان کو تو مولانا نظامی کے قول پر عمل کرنا چاہیئے تھا ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے — کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود — کند کارے از مرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو طمع نہ ہو ضرورت کے موافق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہیئے اپنے اوقات ضائع نہ کرنا چاہیئے۔)

ان لوگوں کو چاہیئے تھا کہ جب خدا نے ان کو فراغت دی تھی تو بے فکر ہو کر دین کی خدمت میں لگتے اور ساری عمر اسی میں ختم کر دیتے پھر آپ دیکھتے کہ علماء میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوتے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں مشغول ہو کر ان کو وہ لذت آتی کہ کبھی سیری نہ ہوتی۔ یہ تو خدا کا راستہ ہے کہ قطع کرنے سے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کی طلب کبھی کم نہیں ہوتی وہ حال ہو جاتا ہے ؎

نگویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں)

بخدا بعض دفعہ جو کوئی نیا علم قلب پر وارد ہوتا ہے اس کا لطف ایسا ہوتا ہے کہ

اگر کوئی مجھے اس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی دینا چاہے تو میں ہرگز گوارا نہ کروں۔ اگر قدر شناسی ہو تو ایک نکتہ علم کا ایسا ہوتا ہے جس کے سامنے ساری دنیا گرد ہے۔ چنانچہ شعرا جب کوئی عمدہ شعر کہتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ شعر ہزار روپیہ کا ہے، لاکھ روپیہ کا ہے۔

ایک شاعر تھا ایک لڑکا اس سے شعر سیکھتا تھا اس نے ایک بیاض بنا رکھی تھی اس میں استاد کا کلام جمع کرتا رہتا تھا کبھی استاد اس سے یہ کہتا کہ یہ شعر پانچ سو روپیہ کا ہے۔ کبھی یہ کہتا کہ یہ شعر ہزار روپے کا ہے وہ لڑکا خوش ہو کر سب شعروں کو لکھتا جاتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ تو کیا کرتا ہے نہ کچھ کماتا ہے نہ لاتا ہے اس نے کہا کہ میرے پاس اس وقت لاکھوں روپے کے اشعار جمع ہیں کوئی شعر پانچ سو کا ہے کوئی ہزار کا ہے اس کی ماں نے کہا کہ اچھا آج تو ہمیں ایک پیسہ کی ترکاری لا دے اس نے کہا بہت اچھا آپ کنجڑن کے پاس گئے کہ مجھے ایک پیسہ کی ترکاری دیدے اس نے کہا لاؤ پیسہ تو آپ نے ایک شعر اس کو سنا دیا کہ ہمارے پاس پیسہ تو نہیں البتہ یہ شعر تم لے لو یہ پانسو روپیہ کا ہے اس نے کہا کہ مجھے ان پانچسو روپے کی ضرورت نہیں مجھے تو آپ ایک پیسہ لا دیجئے جب ترکاری ملے گی۔ لڑکے کو بہت غصہ آیا اور استاد سے جا کر کہا کہ لیجئے اپنی بیاض آپ نے مجھے بہت دھوکہ دیا یہ اشعار تو ایک پیسہ کے بھی نہیں اور آپ کہا کرتے تھے کہ یہ ہزار کا ہے یہ دو ہزار کا ہے اس نے پوچھا کہ صاحبزادے تم ان اشعار کو کس کے پاس لے گئے تھے کہا میں نے ایک کنجڑن کو ایک شعر دینا چاہا تھا اس نے ایک پیسہ کو بھی نہ لیا استاد نے کہا کہ تم نے بڑی غلطی کی ان جواہرات کے فروخت کرنے کے لئے وہ بازار نہ تھا جہاں تم ان کو لے گئے ان کا بازار دوسرا ہے وہاں ان کی قیمت معلوم ہو گی اچھا اب تم ہمارا فلاں قصیدہ بادشاہ کے دربار میں جا کر پڑھو اور کہدینا کہ یہ قصیدہ میں نے خود لکھا ہے پھر تم کو ان کی قدر معلوم ہو گی چنانچہ لڑکا دربار شاہی گیا اور وہاں جا کر وہی قصیدہ بادشاہ کو سنایا پھر تو

ہزاروں روپے انعام میں ملے اور خلعت وغیرہ بھی دیا گیا اس وقت لڑکے کو معلوم ہوا کہ واقعی میں استاد سچا تھا میں نے ہی غلطی کی کہ ان جواہرات کو دوسرے بازار میں لے گیا اگر قدر نہ ہو تو واقعی علمی زکات ایک پیسہ کے بھی نہیں جیسے اس کنجڑن نے کہا تھا اور اگر قدر ہو تو پھر ان کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

دہلی میں ایک شاعر کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرع نکل گیا۔ ع

لختے بردا از دل گذر دہر کہ زپیشم

(جو حسین) بھی میرے سامنے گذرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے)

اب آگے دوسرا مصرع نہیں آتا تھا بہت پریشان ہوا مگر اگلا مصرع ہی نہ آیا ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خربوزہ بیچنے والا گذرا جس نے کسی شاعر سے ایک مصرع بنوالیا تھا یا خود اسی نے بنالیا تھا اور وہی مصرع صدا کے بجائے کہتا جارہا تھا یعنی ع

من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

(میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں)

شاعر اس مصرع کو سنتے ہی پھڑک اٹھا اور دوڑا ہوا اس کنجڑہ کے پاس گیا کہ بھائی یہ مصرع تو تو مجھ کو دیدے اور جتنے روپے تو کہے مجھ سے لے لے کیونکہ میرا ایک مصرع ناتمام پڑا ہوا ہے اس کا جوڑ یہی مصرع ہو سکتا ہے غرض پانچ سو روپے میں یہ بات طے ہوئی اور شاعر پانچ سو روپے میں ایک مصرع خرید لایا اب اس کے پاس پورا شعر ہو گیا ہے

لختے بردا ز دل گذر دہر کہ زپیشم
من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

(جو حسین میرے سامنے گذرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لیجاتا ہے میں اپنے صد پارہ دل کی ایک پھانک بیچتا ہوں)

شاید آپ کی سمجھ میں مصرع خریدنے کا مطلب نہ آیا ہوگا اس کا مطلب یہ تھا کہ

یہ مصرع تو میری طرف منسوب کر دیا کرنا اپنی طرف منسوب مت کرنا۔ بس اتنی بات کے اس نے پانچسو روپے دیئے تھے سو دیکھ کیا تھی وہی قدردانی۔ کیونکہ شاعر ہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ تو صاحبو! قدر وہ چیز ہے کہ اس کے ہوئے ایک علمی نکتہ ہزار مال و دولت سے بہتر ہوتا ہے۔ اس پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ دہلی میں احمد مرزا فوٹوگرافر ہیں فوٹو اتارنے میں یہ اپنے فن میں ماہر ہیں مگر حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کے بعد انھوں نے زندہ کی تصویر بنانے سے توبہ کر لی ہے وہ اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک جنٹلمین میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے پاس مہدی علی خاں کا فوٹو ہے یا نہیں وہ کہتے تھے کہ میں نے اس سے کہدیا کہ بھائی اب تو میں نے اس سے توبہ کر لی ہے اور سب فوٹو تلف کر دئے ہیں کہنے لگا شاید کوئی پڑا ہوا نکل آوے انھوں نے کہا تم اس ردّی میں تلاش کرلو شاید اس میں ہو اس نے ردی میں تلاش کیا تو وہ فوٹو مل گیا جو نہایت صحیح فوٹو تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی قیمت کیا ہے احمد مرزا نے کہدیا کہ اب تو کچھ بھی نہیں۔ اُس نے کہا کہ میں اس شخص کا فوٹو مفت نہیں لے سکتا کیونکہ یہ اس شخص کی نہایت توہین ہے۔ یہ ایسا شخص نہیں جس کا فوٹو بلا قیمت لیا جائے احمد مرزا نے کہا کہ مجھے تو اس کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ شرعاً یہ مال متقوم نہیں اس نے کہا پھر میں تو مفت نہ لوں گا آپ اس کو قیمت نہ سمجھیں میری طرف سے ہدیہ سمجھ لیں اور یہ کہکر جیب میں ہاتھ ڈالا تو تیرہ روپے نکلے اس نے وہ سب ان کو دیدیئے اور کہا افسوس ہے کہ اس وقت میری جیب میں اتنے ہی روپیے تھے ورنہ میری نیت پچاس روپے دینے کی تھی اس وقت تو آپ اسی رقم کو ہدیۃً قبول کر لیجیے غرض بہت اصرار سے وہ شخص تیرہ روپیے ایسے مال کے دے گیا جو مالک کے نزدیک ایک کوڑی کا بھی نہ تھا۔ غرض ہر فن کی قدر کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ کیسی قابل قدر چیز ہے پھر یہ تو دنیا کا علم تھا اس علم کا کیا پوچھنا جو کہ دین کا علم ہے جو کہ آخرت کا ساتھی اور رضائے حق کا وسیلہ ہے ؎

علم چوں بر دل زنی یارے شود　　علم چوں بر تن زنی مارے شود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت و خلوص پیدا ہو جائے تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا۔ اور اگر تن پر اثر کرے یعنی زبان پر تقریر رہی یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو نرا بوجھ اور وبال ہے)

میں بیان کر رہا تھا کہ سب سے زیادہ علم سے بے فکر بڑے طبقہ کے لوگ ہیں حالانکہ خدا نے جو ان کو نعمتیں دی ہیں اس کا شکر یہی تھا کہ یہ لوگ فارغ ہو کر علم دین میں تبحر حاصل کرتے اور اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے۔ صاحبو! جس طرح مال میں زکوٰۃ ہے اسی طرح اولاد میں بھی زکوٰۃ ہے پس اولاد کی بھی زکوٰۃ نکالو مگر یہاں چالیس کا عدد نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ کا نام سن کر خوش ہوئے ہوں گے کہ بس جب چالیس لڑکے ہو جائیں گے اس وقت زکوٰۃ نکال دیں گے نہیں یہاں دو میں سے ایک کو زکوٰۃ میں نکالو اُسے عربی پڑھاؤ۔ مگر نہایت التجا کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ خدا کے لئے چھانٹ چھانٹ کر بیوقوفوں کو عربی کے لئے انتخاب نہ کرنا۔ آجکل رؤسا اول تو اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے ہی نہیں اور جو کوئی پڑھاتا بھی ہے تو لڑکوں میں جو سب سے زیادہ نکما بیوقوف ہو اُسے عربی کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے اور ہوشیار لڑکوں کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے جب کوئی دوست اُن کے گھر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آپ کے لڑکے کیا کیا پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے انگریزی پڑھنے والوں کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بی۔اے پڑھتا ہے یہ انٹرینس کے درجہ میں ہے یہ مڈل پاس کرنے والا ہے۔ اخیر میں عربی والے کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ذرا ملانی طبیعت کا احمق سا ہے اس کو عربی پڑھا دی ہے۔ سبحان اللہ! آپ نے دین کی خوب قدر کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی یہی قدر ہے خدا تعالےٰ کے کلام کی یہی عظمت ہے بھلا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو سمجھنے والے یہی بیوقوف ہو سکتے ہیں جن کو آپ انتخاب کرتے ہیں اسی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ علماء کے اندر وہ بات آج نہیں ہے جو ان میں ہونی چاہیئے تھی پھر اس پر لوگ کہتے ہیں کہ آجکل غزالی اور رازی پیدا نہیں ہوتے میں کہتا ہوں کہ تم یہ الزام کس کو دیتے ہو

ان بیوقوفوں کو غزالی اور رازی کون بنادے تم اپنی اولاد میں سے ذہین ذہین لڑکوں کو عربی پڑھاؤ دیکھو وہ غزالی اور رازی بنتے ہیں یا نہیں۔ خدا کی قسم غزالی اور رازی اب بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ غزالی اور رازی سے کچھ کم تھے واللہ بعض تحقیقات میں حضرت ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے مگر جب تم احمقوں کو دین کے واسطے منتخب کروگے تو ظاہر ہے کہ تمہارے مقتدا بھی احمق بنیں گے ان میں عقل ہم کہاں سے پیدا کردیں ؂

شمشیر نیک زا ہد بد چوں کند کسے

ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

(عمدہ تلوار بُرے لوہے سے کیونکر کوئی شخص بنائے نااہل تربیت سے لے عقلمند آدمی نہیں ہو سکتا)

مگر ان احمقوں کو تو ان کی حماقت ہی مبارک ہوگئی اگر وہ احمق نہ ہوتے تو ان کو بھی انگریزی میں ٹھونس کر آپ جہنم کا کندہ بنادیتے اب وہ دین میں لگ گئے خدا کو راضی کرنے کا طریقہ ان کو معلوم ہوگیا اور ان شاء اللہ تعالیٰ وہ جنت کے مالک ہوں گے۔ قیامت کے دن اُن کی حماقت کام آئے گی اور دنیا میں بھی وہ علمِ دین کی برکت سے تمہارے مقتدا ہوگئے۔ اس حماقت کے مبارک ہونے پر مجھے عارف شیرازیؒ کا قصہ یاد آگیا وہ یہ کہ بالہام غیبی حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کو حافظؒ کی تربیت کا حکم کیا گیا اور پتہ بتلا دیا گیا کہ حافظ فلاں رئیس شخص کے بیٹے فلاں جگہ کے رہنے والے اور ایسے ایسے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ منازل طے کرتے ہوئے شیراز پہونچے اور حافظ صاحب کے والد کے یہاں مہمان ہوئے انھوں نے بہت تعظیم اور خاطر داری کی اور پوچھا کہ حضرت نے کیسے تکلیف فرمائی۔ فرمایا کہ ہم تمہارے بیٹوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تم اپنی اولاد کو ہمارے سامنے پیش کرو انھوں نے اپنے لڑکوں کو پیش کردیا جو متعدد تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ نے سب لڑکوں کو دیکھا مگر جس کی تلاش تھی وہ ان میں نہ ملا۔ فرمایا کہ تمہارے اور کوئی لڑکا نہیں انھوں نے کہا

کوئی نہیں وہ حافظ کو کالعدم سمجھتے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ ضرور ہے۔ حضرت حافظ صاحب کے والد نے فرمایا کہ ہاں حضور ایک لڑکا دیوانہ سا ہے میں نے اس کو اسی لئے پیش نہیں کیا کہ وہ تو پاگل ہے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دیکھئے انھوں نے حضرت حافظ کو ایسا کالعدم سمجھا کہ ایک بار تو انکار ہی کر دیا کہ میرے اور لڑکا ہی نہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھے اسی دیوانہ کی ضرورت ہے اسی کو بلاؤ حافظ صاحبؒ کے والد نے نوکر سے کہا کہ ارے اس باؤلے کو ذرا تلاش کر لا کہیں جنگل میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ چنانچہ نوکر گیا تو واقعی جنگل میں پھر رہے تھے اور اس حلیہ سے تشریف لائے کہ پنڈلیوں تک کیچڑ لگا ہوا تھا بال کھلے ہوئے لباس بھی خراب وخستہ جوں ہی حضرت حافظ نے قدم رکھا اور شیخ نجم الدین کبریٰ رح پر نظر پڑی تو فوراً پہچان گئے کہ یہ شیخ کامل اور میرے مربیّ ہیں اسی وقت بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

(وہ لوگ جو نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں کیا وہ ہم پر ایک نظر کریں گے)
حضرت نجم الدین کبریٰ رح نے کھڑے ہو کر حافظ رح کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا بتو نظر کردم بتو نظر کردم (میں نے تم پر نظر کی میں نے تم پر نظر کی) اور جو کچھ ان کو دینا تھا اسی وقت عطا فرما دیا اور تشریف لے گئے۔

تو حضرت بعضے احمق ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلمندوں سے اچھے بڑھے رہتے ہیں۔ غرض ان لوگوں کو تو ان کی حماقت مبارک ہوگئی مگر تم نے تو اس خیرخواہی کا قصد نہ کیا تھا تم تو ان کو عربی میں نکما اور ناکارہ سمجھ کر ہی ڈالتے ہو سو یہ کس قدر بے ہودہ بات ہے تم کو چاہئے کہ علم دین کے واسطے ذہین ذہین لڑکوں کو انتخاب کرو۔ اور جب خدا نے تم کو فراغت دی ہے تو بے فکری کے ساتھ ان کو مکمل نصاب کی تعلیم دو اور اگر پوری تعلیم نہیں دے سکتے تو عربی کا مختصر نصاب ہی ان کو ضرور پڑھا دو کہ بقدر ضرورت وہ بھی کافی ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اردو میں تو ضرور اُن کو

دین سے آگاہ کردو اور چند روز کے لئے کسی کامل کی صحبت میں ان کو چھوڑدو تاکہ وہ مسلمان تو بن جائیں۔ شاید تم یہ کہو کہ جب اردو میں مسائل معلوم ہوسکتے ہیں اور اس طرح بھی دین سے واقف ہوسکتے ہیں تو پھر عربی پڑھانے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ تعلیم دین کے عام ہونے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عربی کی ضرورت نہیں۔ عربی تعلیم سے استغنا کبھی نہیں ہوسکتا میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر تم عربی نہ پڑھانا چاہو تو کم از کم اردو ہی میں دین سے واقف کردو باقی اردو پڑھنے والا عربی پڑھنے والے کی برابر کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ ایک بچہ نے بتلائی اور واقعی غضب ہی کردیا کہ اس نے ذرا سی عمر میں ایسی گہری بات کہی۔ میرا ایک عزیز ہے اس کے والد نے بچپن ہی سے اس کو انگریزی تعلیم میں ڈالدیا تھا ایک مرتبہ وہ شوخی کرتا پھرتا تھا میں نے بلایا کہ ادھر آؤ باتیں کریں وہ آیا میں نے کہا بتلاؤ کہ عربی اچھی یا انگریزی بے ساختہ بولا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں کہنے لگا کلام اللہ عربی میں ہے عربی پڑھنے سے کلام اللہ خوب سمجھ میں آتا ہے۔ مجھے اُس کے اس جواب پر حیرت ہوگئی۔ پھر میں نے کہا کہ یہ تو صحیح ہے مگر اس سے دنیا نہیں ملتی نہ اس سے بڑی بڑی نوکریاں ملتی ہیں اور انگریزی پڑھنے سے بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں تو عربی پڑھ کے کھائے کہاں سے۔ اس کا جواب بھی کس قدر گہرا دیا کہنے لگا کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے تو وہ اللہ کا ہوجاتا ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ اس کی خدمت کرو لوگ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پریشان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر یہ ذلت کی صورت ہے کہ لوگوں کے نذرانوں پر پڑا رہتا ہے۔ کہنے لگا کہ ذلت تو خود مانگنے میں ہے اور اس میں کیا ذلت ہے کہ لوگ اس کو خوشامد کرکر کے دیں۔ میں نے کہا واقعی تم خوب سمجھے۔ پھر میں نے کہا کہ تم کیوں انگریزی پڑھتے ہو۔ کہنے لگا ہم کیا کریں ابا ہی پڑھواتے ہیں۔ میں نے اس کے والد سے کہا کہ تم نے ناحق اس لڑکے کو انگریزی میں ڈالا اس کو تو عربی ہی سے مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ واقعہ میں نے اُن کو

سنا یا وہ بھی آخر اسی کے باپ تھے کہنے لگے کہ اس کو عربی سے تو خود ہی مناسبت ہے اس لئے اس کو تو وہ خود حاصل کر لے گا اور انگریزی سے اس کو مناسبت ہے نہیں وہ میں نے پڑھا دی کیونکہ اس کو وہ خود حاصل نہ کرتا اور آجکل اس کی بھی ضرورت ہے میں نے کہا کہ اس کو عربی سے آج تو مناسبت ہے مگر مدت تک انگریزی پڑھنے کے بعد یہ حالت نہیں رہے گی۔ مگر انھوں نے اس کو انگریزی ہی میں رکھا چنانچہ اب تک وہ انگریزی پڑھ رہا ہے۔ لیکن اب بھی اس میں ایک رگ ملانوں کی ہے جس سے امید ہے کہ ان شاء اللہ ایک دن وہ ادھر ہی کھنچے گا۔ تو صاحبو! عربی پڑھنے میں یہ بات ہے جو اس بچہ نے بتلائی کہ قرآن حدیث کی پوری سمجھ عربی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اگر کوئی یہ کہے کہ ہم ترجمے دیکھ کر سب سمجھ لیں گے سو یاد رکھو کہ ترجموں سے کلام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ علم ذوق کا نام ہے اور ذوق جبھی حاصل ہو گا جبکہ قرآن و حدیث کی زبان میں اس کو پڑھا جاتے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اہل علم کو جو لطف قرآن میں آتا ہے وہ ترجمہ دیکھنے والے کو نہیں آسکتا اور قاعدہ یہی ہے کہ جو کتاب جس زبان کی ہو اس کا لطف جبھی آسکتا ہے جبکہ اس زبان کو آپ جانتے ہوں۔

بہت سے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے قرآن میں پیدا ہو جاتے ہیں جس کا جواب ذوق لسان ہی سے ہو سکتا ہے بہت سے اشکالات نحو و صرف کے نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان علوم الیہ کی بھی ضرورت ہے بلکہ کچھ منطق و کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات ان ہی علوم کے جاننے سے رفع ہو جاتے ہیں۔ بعض اشکالات سے ان علوم کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی اور اس کے نظائر بہت ہیں مگر میں نمونہ کے لئے چند مثالیں بیان کرتا ہوں جو طالب علموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ کو کچھ پوچھنا ہے مگر اول اس آیت کا ترجمہ کر دو وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ۔ میں سمجھ گیا اور میں نے ترجمہ اس طرح کیا کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ یہ ترجمہ سنکر وہ میرے منہ کو تکنے لگے میں نے کہا اب پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ کہنے لگے کہ اب تو وہ اشکال ہی نہ رہا۔ میں نے کہا تو کیا

آپ کا یہ خیال تھا کہ اس جگہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ سے کروں گا اور وہ ترجمہ بھی غلط نہیں ہے مگر غلط فہمی زبان نہ جاننے سے ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ اردو میں تو گمراہ کا مفہوم صرف یہی ہے کہ باوجود وضوح حق کے اس کو قبول نہ کرے اور عربی میں ضلال اور فارسی میں گمراہی کا اطلاق عام ہے۔ اس معنے کو بھی اور عدم وضوح کو بھی پس ضال کے معنے گمراہ کے بھی ہیں اور بے خبری اور ناواقفی کے بھی ہیں۔

ایک اشکال ترجمہ پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ؀ (ترجمہ) اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالےٰ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ یعنی غلبہ۔

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بارہا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بہت سے جواب علماء نے دیئے ہیں لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق ومناسبت ہو تو یہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق وسباق کو بھی دیکھے گا چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لئے ہوا کہ لوگوں نے لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ؀ (حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ دینگے) کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے یعنی قیامت میں کفار ومسلمین کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر اس کے بعد فرماتے ہیں وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ؀ اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہوگا اب کوئی اشکال نہ رہا۔ بعض دفعہ قاعدۂ صرف کے نہ جاننے سے اشکال پڑتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ اخباروں میں یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں۔

اس سے بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ یہ تو قرآن کے منافی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لرجل مِّنْ قَلْبَيْنِ فِیْ جَوْفِهٖ ط یعنی خدا تعالےٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا

کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت زیادہ قوی ہو اس لئے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو یہ جواب تو بطور منع کے ہے اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں مَاجَعَلَ صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے۔ پس اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں اور بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے۔

چنانچہ میرے پاس ایک ملاجی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے۔ قرآن میں تو پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا قرآن میں کہاں ہے کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور یہ آیت دکھائی فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔

ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا (پس دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک) شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ کے موافق کر دیا۔ ورنہ بعضے تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ اور دھوؤ اپنے پیروں کو دونوں ٹخنوں تک اور بعض ترجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے۔ اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا تو اس میں لفظ نہیں آیا۔ اس ترجمہ پر کچھ اشکال نہیں ہو سکتا مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھرا۔ اب اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے۔ بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا میں نے کہا افسوس

یا تو علماء اتنے ایماندار ہیں کہ اگر وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہدیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مرض کہیں تو جھوٹے۔ اس پر چپ ہوئے میں نے کہا خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بیشک ناجائز ہے۔ اسی طرح بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم آلیہ پر موقوف ہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیئے۔ غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں اَرْجُلَکُمْ کا عطف وُجُوْھَکُمْ پر ہے خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں بڑا اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قرارت متواترہ میں وَاَرْجُلِکُمْ بالجر بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رُؤُسِکُمْ کے اوپر اور فَامْسَحُوْا کے تحت میں ہے اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں جر جوار ہے ورنہ حقیقت میں اس کا عطف فَاغْسِلُوْا کے تحت میں ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عطف فَامْسَحُوْا کے تحت میں ہے جب بھی پیروں کے لئے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کی ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار کے لئے ایک ہی فعل کے تحت میں بیان کر دیتے ہیں مثلاً دعوت کے موقعہ پر کہا کرتے ہیں کہ کچھ دانا پانی ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا۔ حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی چیز نہیں۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ کچھ دانہ کھا لیجئے گا۔ پانی پی لیجئے گا۔ مگر اختصار کے لئے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ زردہ دودھ دہی گوشت کھایا تھا۔ حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ دودھ[1] پیا تھا باقی چیزیں کھائی تھیں جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اَرْجُلِکُمْ کا عطف اگر فَامْسَحُوْا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ پیروں کے لئے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ رُؤُس و اَرْجُل کا تعلق اصل میں

---

[1] یعنی ایسے مقام پر جہاں دودھ پینا بولا جاتا ہے دودھ کھانا نہ بولا جائے ۱۲ منہ

دو فعلوں سے تھا ایجازاً ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فَامْسَحُوا کے متعلق کر دیا گیا۔ اور مطلب وہی ہے کہ سر کا مسح کرو اور پیروں کو دھوو۔ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے عَلَفْتُهُ تِبْنًا وَّمَاءً بَارِدًا۔ (میں اس کو گھاس اور ٹھنڈا پانی چرایا) اور اگر وَامْسَحُوا کے حکم کو بھی اَرْجُلَکُمْ کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قرا‌ئتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں جس طرح دو آئتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قرا‌ئتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں پس ارجلکم میں قراءت بالجر ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ پیروں کے لئے مسح کا بھی حکم ہے رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قراءت نصب غسل کو لازم کر رہی ہے تو مجموع قرا‌ئتین سے یہ ثابت ہوا کہ پیروں کے لئے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے اس طرح کہ قراءت جر بحالت لبس خف (موزہ پہنے) ہے اور قراءت نصب بحالت عدم خف ہے یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔ اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی وہ یہ کہ مسح کے معنے ملنے کے ہیں خواہ بدون غسل کے یا مع غسل کے پس دھونا تو ایک قراءت سے اور حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا قراءت جر سے مامور بہ ہوا بمعنے مستحب جس کی وجہ یہ ہے کہ پیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادۃً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا ملنے سے پانی پہنچتا ہے چنانچہ فقہاء نے اسی اہتمام کے لئے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے پھر آخر وضو میں دھویا جاوے۔

غرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت یہ ہے فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ط اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے ارشاد فرماتے ہیں فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (یعنے قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو

تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔ اس سے اُس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں اس تقریر سے ایک عالم کو شبہ پڑ گیا اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کونسا ہے حملیہ یا شرطیہ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو۔ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری کوئی اور صورت ہو کیونکہ مانعۃ الجمع کا حکم یہی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہے مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یوں کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو نا ممکن ہے ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من و فدار دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے تو اب اس سے غلامی کی نفی کیونکر ہوئی سو دیکھئے جو شخص مانعۃ الجمع و مانعۃ الخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں دوسرا اشکال ہے آیت یہ ہے۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے۔

ترجمہ یہ ہے۔ کہ اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے اور اگر اُن کو سنا دیتے تو وہ اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے

لَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْہِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَہُمْ یعنی اگر حق تعالےٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ بیٹھ موڑ دیتے حالانکہ یہ نتیجہ محال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالےٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوتی اُس صورت میں تو وہ بات کو قبول کرتے اس حالت میں اعراض کیونکر ممکن تھا کیونکہ اعراض تو شر ہے خیر کے ساتھ اس کا اجتماع نہیں ہوسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں لَاَسْمَعَہُمْ اول سے مراد تو یہ ہے لَاَسْمَعَہُمْ فِیْ حَالَۃِ عِلْمِ الْخَیْرِ فِیْہِمْ اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ لَوْ اَسْمَعَہُمْ فِیْ حَالِ عَدَمِ علم اللّٰہِ فِیْہِمْ خَیْرًا حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالےٰ کو ان میں بھلائی کا ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنادیتے اور وہ ان کو قبول بھی کرلیتے اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنادی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے اب وہ اشکال رفع ہوگیا۔ اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی اسی طرح علم کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ قرآن میں بعض مضامین ایسے مذکور ہیں جس کا ظاہری مضمون جو عام طور پر سمجھ میں آتا ہے مراد نہیں مثلاً فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ یَدَاہُ مَبْسُوْطَتَانِ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِہٖ ط یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جدھر تم مُنھ کرو خدا کا رُخ ادھر ہی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپیٹے ہوتے ہوں گے۔ تو اس سے بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ جوارح اور مکان و زبان سے پاک ہے اس کے لئے ان چیزوں کا ثابت ہونا حقیقۃً ممکن نہیں ہاں مجازاً

کوئی دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو ممکن ہے۔ چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کئے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے۔ تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ کے لئے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس لئے دوسرے علوم کی بھی ضرورت ہے اور وہ علوم عربی میں مدون ہیں لہٰذا عربی کی سخت ضرورت ہے شریعت کا علم کامل بغیر علوم عربیہ کے حاصل نہیں ہوسکتا لیکن اگر کسی کو علم کامل کی فرصت نہ ہو وہ ناقص ہے تو محروم نہ رہے۔

مَالَا يُدْرِكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ (جو کل کو حاصل نہیں کرسکتے کل کو ترک بھی مت کرو)

پس عوام نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے اردو میں بھی علم نہ سیکھا اور علماء نے یہ غلطی کی عربی تو سیکھی مگر بعضے علوم غیر نافعہ میں مشغول ہوگئے۔ ان دونوں غلطیوں پر اس آیت میں تنبیہ ہے۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

(یہ لوگ ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں اور ضرور یہ بھی جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے کاش کہ ان کو عقل ہوتی)

اس آیت میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ حق تعالےٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو معلوم ہے کہ جو شخص علم مضر کو اختیار کرے آخرت میں اس کے لئے (اس علم کی وجہ سے) کچھ حصہ نہیں آگے فرماتے ہیں۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (کاش وہ جاننے والے ہوتے) اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ جانتے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ کاش وہ جانتے ہوتے

اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ بمنزل جہل کے ہے اس لئے یہودیوں کا وہ جاننا تو نہ جاننے کے برابر ہو گیا اب آئندہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ کاش اب بھی جان لیں یعنی اپنے علم پر عمل کرنے لگیں اور یہاں سے میں ایک اور غلطی پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس آیت سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ علوم نافعہ وہ ہیں جو آخرت میں کام آئیں مطلق علوم مراد نہیں اب آجکل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ علم کی فضیلت میں آیات و احادیث لکھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ شریعت میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید ہے اور اس کے بعد ان تمام فضائل کو انگریزی تعلیم پر چسپاں کرتے ہیں اس تمام تمہید کے بعد وہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ثابت کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ہیں جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گویا انگریزی پڑھنے سے یہ تمام فضائل حاصل ہو جائیں گے سو خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ سخت دھوکہ دیتے ہیں شریعت میں جتنے فضائل علم کے مذکور ہیں ان سے مراد وہ علم ہے جو آخرت میں مفید ہو یعنی علم شرائع و احکام انگریزی تعلیم اس سے مراد نہیں ہاں اگر انگریزی میں دینی مسائل کا ترجمہ ہو جائے تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ اردو میں دینی رسائل کا پڑھنا مگر شرط یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا محض انگریزی داں نہ ہو بلکہ محقق عالم ہو یا کسی انگریزی داں محقق عالم نے اس کی اصلاح اور تصدیق کر دی ہو ایسا ترجمہ نہ ہو جیسا کہ ایک صاحب نے انگریزی میں شرع محمدی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تعجب کی حالت میں طلاق نہیں پڑتی مجھے اس کی خبر اس طرح ہوئی کہ ایک مقام پر ایک واقعہ طلاق کا پیش آیا تھا اس میں طلاق دینے والے کے بعض خیر خواہوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح کچھ گنجائش نکل آوے تو چھپا چھپی کر دیں چنانچہ مختلف کتابیں دیکھی گئیں ان میں وہ شرع محمدی بھی نکالی گئی اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ تعجب کی صورت میں طلاق نہیں ہوتی جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کی بیوی نے خلاف عادت ایک دن خوب

زینت و آرائش کی شوہر کو یہ حالت دیکھ کر تعجب پیدا ہوا اس نے تعجب میں کہدیا کہ تجھے تین طلاق اب یہ انگریزی مفتی فرماتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی کیونکہ تعجب میں دی گئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ جب میرے پاس یہ کتاب لائی گئی میں نے کہا کہ یہ مسئلہ تو بالکل غلط ہے اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مدہوش کی طلاق نہیں ہوتی مدہوش عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں از عقل رفتہ یعنی غصہ وغیرہ میں اگر کوئی شخص ایسا حواس باختہ ہوجائے کہ اس سے مجنونانہ حرکتیں صادر ہونے لگیں مثلاً دیواریں سر مارنے لگے یا اپنے ہاتھ میں کاٹنے لگے غرض ایسا بے تاب ہو کہ عقل زائل ہوجاوے تو اس کی طلاق نہیں ہوتی اُن حضرت نے لفظ تو عربی دیکھا اور ترجمہ کیا اردو محاورہ کے موافق اردو میں مدہوش حیرت زدہ کو بھی کہدیتے ہیں۔ پس شاید مدہش کا ترجمہ متحیر کا کیا ہوگا پھر متحیر کا ترجمہ متعجب کردیا ہوگا۔ یا نہ معلوم انھوں نے انگریزی کا کونسا لفظ مدہوش کے ترجمہ میں اختیار کیا ہوگا پھر اس کا ترجمہ اردو میں ہوا تو وہ کچھ سے کچھ ہوگیا یعنی ٹیڑھی کھیر ہوگئی۔ ٹیڑھی کھیر کی حکایت شاید آپ نے نہ سنی ہوگی۔

ایک لڑکے نے اپنے اندھے میاں جی سے کہا کہ آج آپ کی ہمارے یہاں دعوت ہے۔ کہا کیا کھلاوے گا اس نے کہا کھیر۔ کہنے لگے کہ کھیر کیا ہوتی ہے لڑکے نے کہا کہ چاولوں میں مٹھائی ڈال کر پکاتے ہیں۔ حافظ جی نے پوچھا وہ کیسی ہوتی ہے اس نے کہا کہ سفید ہوتی ہے۔ اندھے میاں نے سیاہ و سپید کیوں دیکھا تھا کہنے لگے سفید کیسا ہوتا ہے لڑکے نے کہا جیسے بگلا انھوں نے بگلا بھی نہ دیکھا تھا بولے کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے بگلے کی صورت اپنے ہاتھ پر بنا کر اس پر حافظ جی کا ہاتھ پھیرا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھے کہ بس کھیر بھی اسی شکل کی ہوتی ہوگی۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے گلے سے بھی نہ اترے گی۔ تو دیکھئے بات کیا تھی اور کہاں پہونچ گئی۔ اسی طرح مدہوش کا مسئلہ

ترجمہ در ترجمہ ہم نے سے یہاں تک پہونچ گیا کہ تعجب میں طلاق نہیں پڑتی۔ پھر غضب یہ ہے کہ وہ کتاب قانون میں داخل ہے اسی کے موافق فیصلے ہوتے ہونگے نہ معلوم کس کس کو اس مسئلہ کے موافق طلاق سے بری کر دیا گیا ہوگا۔ پس یہ مترجم رہ گئے ہیں اور ان کی کتابیں قانون میں داخل ہیں جن کو شریعت سے ذرا بھی مس نہیں۔ بس وہی حال ہو رہا ہے ؎

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی حاکم کتا وزیر اور چوہے کو دیوان بنا دیں تو ایسے اراکین سلطنت ملک کو ویران کر دیں یعنی نا اہلوں سے ملک برباد ہو جاتا ہے)

اذا كَانَ الغُرَابُ دَلِيلَ قَومٍ
سَيَهدِيهِم طَرِيقَ الهَالِكِينَا

(یعنی جب نا اہل کسی قوم کا رہبر ہو تو اس کو ہلاک ہونے والوں کے راہ پر چلائے گا)

صاحبو! اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اس غلطی کی بہت جلد اصلاح کی جاوے یہ مسئلہ بالکل غلط ہے اور جس قدر ترجمے قانون میں داخل ہیں ان کو دو چار محقق عالموں کو دکھا کر پاس کیا جائے محض ایک شخص کے ترجمہ کر دینے سے اس کے موافق فیصلے نہ کئے جائیں دیکھئے یہ کام کرنے کا ہے مگر مسلمان ایسے کام نہیں کرتے جن کی ضرورت دینی اعتبار سے فوری ضرورت ہے کہ نہ معلوم اس غلط مسئلہ کی وجہ سے کتنی بدکاریاں مسلمانوں میں ہوتی ہوں گی۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ اگر مسلمان گورنمنٹ سے اس کی اصلاح کی درخواست کریں۔ تو وہ فوراً اس پر توجہ کرے گی۔ مگر آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو کام ہو سکتا ہو جس کی تدابیر ان کے اختیار میں ہوں جس کی کامیابی کی پوری امید ہو وہ کام تو کرتے نہیں اور جو کام اختیار سے باہر ہو جو

ان سے نہ ہو سکے اُس کے پیچھے پڑتے ہیں جیساکہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں

س آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ ‌ ‌ ‌ برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کی خواہش کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق خواہش کرو ایک گھاس کا
پتہ پہاڑ کو نہیں اٹھا سکتا)

اور یہ مذاق بھی اسی جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اگر لوگ دین سے واقف ہوتے تو الاہم فالاہم پر عمل کرتے غرض ہر کام کے لئے علم دین کی سخت ضرورت ہے علم دین کے بغیر یہی نہیں کہ معلوم ہو تاکہ ضروری کونسی چیز ہے اور غیر ضروری کونسی چیز ہے۔ پس اگر انگریزی میں کسی محقق نے دینی مسائل لکھ دیئے ہوں تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ثواب میں داخل ہے۔ باقی عام لوگوں کی انگریزی کتابیں خواہ وہ دین ہی کی طرف منسوب ہوں قابل اعتبار نہیں اور جن میں دین کا نام بھی نہ ہو وہ تو محض دنیا ہے ایسی کتابوں کی تعلیم و تعلم پر علمی فضیلت کی احادیث و آیات کو منطبق کرنا تو نری جہالت ہے۔ اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بہت دیر ہوگئی ہے نماز ظہر کا بھی وقت آگیا ہے۔ بس میں خلاصۂ وعظ بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تعلیم علم دین کو وسیع کرنا چاہیئے۔ علم دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیئے اور اس کے ضمن میں لے ہر طبقہ کی تعلیم کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ عربی کو فضول نہ سمجھیں جو لوگ معاش سے فارغ ہوں ان پر عربی پڑھنا اور اولاد کو پڑھانا سب سے زیادہ ضروری ہے لیکن معلمین کو بھی میں ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنا طرز تعلیم بدلیں طالب علم کی حیثیت کے موافق تقریر کیا کریں۔ میزان الصرف میں شرح ملا جامی نہ پڑھایا کریں۔ میں نے ایک مدرس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے بندے میزان میں یہ بیان کر رہے تھے کہ الحمد میں جو الف لام ہے یہ استغراق کا ہے الف لام کی چار قسمیں ہیں ایک جنسی ایک عہد خارجی ایک عہد ذہنی ایک استغراقی۔ بھلا یہ مضامین میزان میں بیان کرنے کے ہیں۔ بس وہ مدرس صاحب بیان کر رہے تھے اور طالب علم

ان کا منہ تک رہا تھا میں نے کہا کہ اس بیچارہ کے نزدیک تو الف لام استغراق ہی کا ہوتا ہے اور کہیں کا نہیں ہوتا کیونکہ اس الف لام نے اس کو تو مستغرق بنا دیا ہے۔ اسی طرح مدرسوں کو چاہیئے کہ ہر طالب علم کو پوری عربی پڑھانا ضروری نہ سمجھیں جس کے اندر مناسبت دیکھیں اور فہم سلیم پاویں اس کو سب کتابیں پڑھا دیں اور جس کو مناسبت نہ ہو یا جس کی فہم سلیم نہ ہو اس کو بقدر ضرورت مسائل پڑھا کر کہدیں کہ جاؤ دنیا کے دھندے میں لگو۔ تجارت و حرفت کرو۔ کیونکہ ہر شخص مقتدا بننے کے لائق نہیں ہوتا بعضے نالائق بھی ہوتے ہیں ایسوں کو فارغ التحصیل بنا کر مقتدا بنا دینا خیانت ہے ؎

بد گہر را علم و فن آموختن

دادن تیغ ست دست راہزن

(بدذات اور نا اہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

مگر آجکل مدرسین و مہتممین اس کا بالکل خیال نہیں کرتے کیا جتنے طلبہ ان کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں سب ہی کو علم سے پوری مناسبت ہوتی ہے اور سبھی کی فہم سلیم ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ طلبہ کا انتخاب نہیں کرتے ایسے لوگوں کے لئے ایک مقدار معین کر لینا چاہیئے کہ اس سے آگے ان کو نہ پڑھایا جائے اور وہ مقدار ایسی ہو جو دین کے ضروری ضروری مسائل جاننے کے لئے کافی ہو اور عام لوگوں کے واسطے اردو کا نصاب مقرر کرنا چاہیئے۔ الحمدللہ کہ ضرورت کے موافق علم کے متعلق اس وقت کافی بیان ہو گیا اب حجت ختم ہو گئی ہے اب بھی اگر کوئی علم دین حاصل نہ کرے تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالے ہم کو عمل کی توفیق دے۔ وصلے اللہ علی سیدنا و مولانا محمد

وعلے آلہ واصحابہ وسلم

وشرف وکرم آمین والحمد للہ رب العلمین

بالخیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

ذم النسیان

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ورحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ——— دفتر الابقار

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الواعظ المسمیٰ بہ

ذم النسیان

الاشتات	من ضبط	مزای شان	ماذا	لم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمیناً تعداد	کیا مضمون تھا	کیوں بیان کیا	کیسے بیان کیا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
غالباً یہ وعظ برادرم مرحوم کا آخری قلمبند کیا ہوا ہے کیونکہ شروع جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ میں ان کا انتقال ہو گیا ناظرین ان کو دعائے خیر میں یاد رکھیں حقیقت میں ضبط مواعظ کا کام وہ سب سے اچھا کرتے تھے اور یہ فیض ان کا ان شاء اللہ تعالیٰ تا ابد جاری رہیگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ جنت میں عطا فرمائیں۔ ورضی عنہ وارضاہ اور ہم پسماندگان کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ ظفر	مولانا مولوی سعید احمد صاحب مرحوم برادر خورد مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی	تقریباً سو آدمی اور طلبہ و ذاکرین خصوصاً	سہو و نسیان کی مذمت اور اس کے علاج کا بیان اور اس کے اقسام و احکام	نسیان کے متعلق بیان ہوا	بیٹھ کر بیان فرمایا	دو گھنٹہ ۱۰ منٹ	۷ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ[1]	جامع مسجد تھانہ بھون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا

[1] یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی بھی ماہ ربیع الثانی میں ہوا ہے مگر بجائے ۷ تاریخ کے آج ۱۹ تاریخ ہے اور بجائے جمعہ کے پیر کا دن ہے اور بجائے ۱۳۴۲ھ کے ۱۳۵۲ھ ہے ۱۲ ظفر

محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ آلہ و اصحابہ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ؕ

(اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنھوں نے اللہ سے بے پروائی کی تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا یہی لوگ نافرمان ہیں)

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورۂ حشر کے آخر کی جس میں مثل دوسری آیتوں کے ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے۔ اور میں نے تشبیہ کا صیغہ اس لئے استعمال کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ اسی آیت کی تخصیص نہیں بلکہ قرآن کی تمام آیات کی یہی شان ہے کہ ہر آیت میں ضروری ہی مضمون ہے اگر میں تشبیہ کا ذکر نہ کرتا تو ممکن تھا کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ شاید دوسری آیتوں میں ضروری مضمون نہیں بس خاص اسی آیت میں یہ بات ہے۔ گو اس شبہ کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ کیونکہ تخصیص ذکری سے تخصیص حکمی لازم نہیں آتی مگر شاید کسی کو بلا وجہ ہی شبہ پڑتا۔ اس لئے میں نے تشبیہ کے صیغہ سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کر دیا۔ کہ اس آیت میں بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے جیسا کہ دوسری آیتوں کی بھی یہی شان ہے قرآن کا تو ہر ہر جزو ضروری ہے اس میں غیر ضروری کوئی بات بھی نہیں ہے حتی کہ جن آیات میں واجبات و فرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے مضمون ان کا بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے (دو وجہ سے ایک اس لئے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا یا فرض و واجب نہ خیال کرے گا یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے۔ اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے دوسرے اس لئے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں جن پر مطلع نہ ہوتا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے

اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارہ میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے (یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجے میں ہے) غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالےٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے۔ کہ اللہ ورسول صلے اللہ علیہ وسلم نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلا دیا جو اللہ تعالےٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کیا کرتا اُن کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی میں کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ (دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا رہوں۔ اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جان نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر

اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو کام بھی ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے۔ وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دبائے گا پنکھا بھی جھلے گا۔ اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا سامان کرے گا اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انھیں کیوں کروں بلکہ اس کی محبت اور جان نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیئے)

صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالےٰ شانہٗ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد ہیں محض قانونی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالےٰ کے ساتھ محبت اور جاں نثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کر سکتے۔ بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالےٰ کو یہ بات پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالےٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے کوسوں دور بھاگتے اور اس کی تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم۔ عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ کبھی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب و حبس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔ اور رُخ پھیر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رُخ ہو جائے اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب و حبس بھی ہو وہ تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا۔

مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کر لیں گے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے میں ان لوگوں کی طرفداری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالے سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالے کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کیا ضرورت تھی کہ یہ کیا بڑا گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے خدا تعالے بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لئے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے۔ غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالے کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا اور یہ بات ایک درجہ میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ بلا بود ے اگر ایں ہم نبود ے (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔

دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے۔ حالانکہ وہ ایک نہایت ہی ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لئے

وہ کام کئے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو۔ اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے۔ مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے۔ تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے چنانچہ مرد کے ذمے بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے۔ زیور اور ریشمی لباس لازم نہیں نہ اس کی دوا دارو لازم ہے۔ نہ اس کے کنبے والوں کی دعوت ضیافت ضروری ہے۔ مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے۔ مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے۔ اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لئے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالےٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا ہو حالانکہ خدا تعالےٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کی برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا۔

تعلق کا بقاء استحکام پر موقوف ہے نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالےٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے

ہرگز نہیں پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدون

(اے شخص بیوی بچوں سے تجکو صبر نہیں ہے خدا تعالیٰ سے تجھ کو صبر کیونکر آگیا حقیر اور ذلیل دنیا سے تجھ کو صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ سے تو نے کیونکر صبر کر لیا۔)

ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو صبر نہیں ہو سکتا۔ مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آگیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ضعیف ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے۔ مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں یہ تو کفار ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں اور بعض لوگ ضعف تعلق پر راضی ہیں۔ یہ ہم آجکل کے مسلمان ہیں حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آجکل ہم کو مستحب کی خبر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند تھا مگر منیۃ المصلی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو تنبیہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجا لائیں اور ان کے علاوہ جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں ان کو نہ بجا لائیں۔ تو کیا ہم دنیا میں اپنے مربیوں کے ساتھ

بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں ہرگز نہیں دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں تو کیا خدا تعالےٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیئے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالےٰ کی اطاعت میں اسی قدر اکتفا کرتے ہیں جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجے میں بھی ضروری نہیں سمجھتے یہ ضرور ہے کہ خدا تعالےٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی طاعت کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس حق کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحباب میں ہماری کوتاہی کا کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہوگیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لئے زیادہ کوشش کریں مگر یہ سخت غلطی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کرسکتے مگر اپنے مقتضائے حال کے موافق تو کرسکتے ہیں۔ دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایا و تحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہوسکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہوتا کہ ہدیہ دینا ہی موقوف کردیں بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے کوشش کرکے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو) پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق تو عمل کرنا چاہیئے اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالےٰ کو راضی کرنے کے لئے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کرسکتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجیے۔ حق تعالےٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت وہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کیتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لئے ترک کردیں کہ حق تعالےٰ کا حق تو ادا

ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے (مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقار کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں ۱۲) یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت ترک مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔

اِنَّ نَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ لعينك حقا الخ

(یعنی تمہارے جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے)

مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے کیونکہ یہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَ الْكَسَلِ (خدایا! عجز اور سستی سے آپ سے پناہ مانگتا ہوں)

خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو ترک مستحبات و تقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ نے پناہ مانگی ہے (اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کر چکا ہو اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو جاکر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا کر کے عمل کو چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے ۱۲)

غرض خدا تعالے کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے اس کے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں۔ یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے کام کا ہر ہر جزو ضروری ہے۔ چونکہ قرآن میں مستحبات کا بھی ذکر ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلا دیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے برکات و

چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں (کیونکہ جو شخص تہجد و اشراق کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار تہجد گزار مشہور ہو جاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے ۱۲) اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چنانچہ سیبویہ ایک نحوی ہے۔ جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی ہے۔ اور عقائد فاسدہ پر سخت عذاب نار کا استحقاق ہوتا ہے مگر مرنے کے بعد ان کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، کہا مجھے بخش دیا پوچھا کس بات پر بخشدیا کہا ایک نحو کے مسئلہ پر میری نجات ہوگئی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں نحاۃ نے اختلاف کیا ہے کہ اعرف المعارف کون ہے۔ کسی نے ضمیر متکلم کو اعرف المعارف کہا کسی نے ضمیر مخاطب کو میں نے یہ کہا کہ لفظ اللہ اعرف المعارف ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ متعین نہیں کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذات حق کے کسی کا احتمال ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا کہ تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی جاؤ تم کو بخشا گیا۔ دیکھئے اس نحوی کی مغفرت ایسے عمل مستحب پر کی گئی جو اس نے نیت ثواب بھی نہ کیا تھا بلکہ مسئلہ نحو کے طور پر ایک بات کہی تھی۔ مگر اسی پر فضل ہو گیا۔ اور باوجود فساد عقیدہ اور استحقاق نار کے بخشدیا گیا۔

اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں چلے جا رہے تھے راستے میں ایک بلی کا بچہ دیکھا جو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا ان کو رحم آیا اور اسے گود میں اٹھا کر گھر لائے اور لحاف میں چھپا لیا۔ جب انتقال ہو گیا تو پوچھا گیا بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انھوں نے بہت سوچ ساچ کر یہ خیال کیا کہ

اور اعمال تو میرے کسی قابل ہیں نہیں ان کو کیا پیش کروں لیکن الحمد للہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے اس میں ریا وغیرہ بھی کچھ نہیں ہو سکتا بس ایمان کو پیش کرنا چاہیئے۔ اسی لئے عرض کیا کہ میں توحید لایا ہوں، وہاں سے اعتراض ہوا اَتَذْکُرُ لَیْلَۃَ اللَّبَنِ ط یعنی وہ دودھ والی رات بھی یاد ہے اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات ان بزرگ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا صبح کو ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ رات دودھ پیا تھا اس سے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے اس واقعہ کو یاد دلا کر توحید پر گرفت فرمائی کہ یہی توحید کا دعویٰ ہے کہ ہم کو چھوڑ کر تم نے دودھ کو موثر کہا اور درد کے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا۔ اب تو یہ بیچارے تھرا اٹھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم نے اپنے دعوے کی حقیقت کو دیکھ لی اب ہم تم کو ایک ایسے عمل پر بخشتے ہیں جس کی بابت تم کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہو جائے گا۔ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو جو سردی میں مر رہا تھا اپنے لحاف میں سلایا تھا اس نے تمہارے حق میں دعا کی تھی۔ جو ہم نے قبول کر لی۔ جاؤ آج اس بلی کے بچے کی دعا پر تم کو بخشتے ہیں تم نے ہماری ایک مخلوق پر رحم کیا تھا تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر رحم کریں۔

تو صاحبو! مستحبات میں یہ عنایات و برکات ہوتی ہیں احادیث میں ایسے بہت واقعات آئے ہیں کہ بعض لوگوں کی ایک ادنیٰ فعل مستحب پر مغفرت ہو گئی چنانچہ ایک فاحشہ عورت کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ اس نے گرمی کے دوپہر میں ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے زمین کی تر مٹی چاٹ رہا تھا۔ اس کو رحم آیا اور پاس ہی ایک کنواں تھا اس سے پانی نکال کر کتے کو پلانا چاہا مگر دیکھا تو کنویں پر ڈول ہے نہ رسی، اب وہ سوچنے لگی کہ پانی کیونکر نکالوں مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی وہ یہ کہ اپنی اوڑھنی کو تو رسی بنایا اور پیر میں چمڑے کا موزہ تھا اسے ڈول بنایا

اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اس فاحشہ کی مغفرت اس عمل پر ہو گئی۔ لیجئے ساری عمر تو سیہ کاری میں گزاری اور ایک ذرا سے عمل مستحب پر مغفرت ہو گئی (واقعی سچ ہے ؎

رحمتِ حق بہانہ می جوید
رحمت حق بہا نمی جوید

(اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے رحمت حق قیمت نہیں مانگتی)
اس لئے عمل کو حقیر نہ سمجھو نہ معلوم کونسا کام اس کو پسند آجائے ۱۲)
مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمت پر بھروسہ کر کے عمل ہی چھوڑ دو۔ آجکل اس مذاق کے لوگ بھی ہیں جن پر واقعات رحمت کے سننے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بات یہ ہے کہ ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے اور یہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں سب کی یہی مثال ہے تو بارش فی نفسہ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اس کا اثر ہر محل کی قابلیت وعام قابلیت کے مناسب جدا ہوتا ہے۔ اگر عمدہ زمین ہے تو بارش سے اس میں پھول پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہوں گے اور اگر شور زمین ہے تو اس میں جتنی بارش ہوگی اتنے ہی کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوں گے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(بارش کہ اس کی لطافت طبع میں اختلاف نہیں بلکہ زمین کی قابلیت میں اختلاف ہے باغ لالہ اگتا ہے اور بنجر زمین جھونڈ جھنکاڑ)
اسی طرح واقعات رحمت کو سن کر دو اثر ہوتے ہیں جو لوگ علیل المزاج ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ایک ذرا سے نکتہ پر بخش دیتے ہیں تو عمل صالح کی کیا ضرورت ہے اور جو شریف المزاج ہیں وہ اس کو سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرتے ہیں اور

کہتے ہیں ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمبدم عنایت

بلکہ میں ایک نئی بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات بدون سزا کے معافی دیدینے پر اہل دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے سزا مل جانے پر تو کچھ شرمندگی کم ہو جاتی مگر سنگین جرم کو ویسے ہی معاف کر دینا تو گویا ان کو ذبح کر دینا ہے۔ اب تو مارے ندامت کے وہ زمین میں گڑے جاتے ہیں یہ ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے اور جس نے اس حالت کو سمجھا ہو گا وہ اس آیت کی تفسیر بے تکلف سمجھ لے گا فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے)

اس کا قصہ یہ ہے کہ جنگ احد میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک غلطی ہو گئی تھی وہ یہ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس آدمیوں کو پہاڑ کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ ہی حالت گزر جائے۔ اس گھاٹی کی اس قدر حفاظت کی یہ ضرورت تھی کہ اس راستے سے دشمن کے آجانے کا اندیشہ تھا اور یہ گھاٹی لشکر اسلام کی پشت پر تھی اگر دشمن کی فوج کا ایک دستہ ادھر سے آجاتا اور ایک دستہ مقابل ہو کر لڑتا تو مسلمان بیچ میں گھر جاتے اور ظاہر ہے کہ آگے پیچھے دونوں طرف سے لشکر کا گھر جانا سخت خطرناک ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صف بندی کرتے ہوئے اس گھاٹی پر ایک جماعت کو تاکید کے ساتھ متعین فرمایا۔ خدا تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوت انتظام بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ غیر اقوام بھی اس کو تسلیم

کرتی ہیں حتیٰ کہ وہ تو اشاعت اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ ہم سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ کے معتقد ہوئے کہ جس چیز کو ہم امداد غیبی کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ پر محمول کرتے ہیں اس انتظام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو حملے کی اجازت دی اور الحمد للہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو کھلی فتح حاصل ہوئی کہ ابو سفیان بن حرب جو اس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر کے بھاگ پڑے (اور جھنڈا بھی گر پڑا) حضرت ابو سفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی بھاگیں اور بھاگتے ہوئے ان کے خلخال اور پنڈلیاں تک کھل گئیں غرض کفار کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان ان کے تعاقب میں دوڑے۔ اب ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا جو گھاٹی پر متعین تھے۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین فرمایا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہو گی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ نہیں کیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیئے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز کچھ نہ کرنا چاہیئے مگر پہلی رائے[۵] والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک ان کے افسر رہ گئے۔

حضرت خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور اس جنگ

---

[۵] لطیفہ اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی۔ جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ ۱۲ ظ

میں وہ لشکر کفار کی طرف تھے یہ ہمیشہ سے بڑے مدبر اور جنگ آزمودہ ہیں۔ انھوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تاکہ اس گھاٹی کی خبر وقتاً فوقتاً ان کو پہونچاتے رہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ حضرت خالد مع تمام لشکر کفار کے بھاگے جارہے تھے ان کے جاسوس نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس گیارہ آدمیوں کے وہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت خالد نے بھاگتے بھاگتے اپنا رخ پلٹا اور پانچسو جوانوں کو ساتھ لے کر اس گھاٹی پر پہونچ گئے۔ دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی رہ گئے تھے ان سے مقابل ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سب شہید ہوگئے اور حضرت خالد نے مسلمانوں کے پیچھے سے آکر ان پر حملہ کردیا یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر بھی لوٹ پڑا اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغے میں آگئے اور جس خطرے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت فرمائی تھی بعض صحابہ کی اجتہادی غلطی سے اس خطرے کا سامنا ہوگیا۔ چنانچہ ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہوگئے۔ بہت سوں کے پیر اکھڑ گئے اور جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا (یہ سب کچھ ہوا مگر باینہمہ مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ شکست کے معنے یہ ہیں کہ لشکر مع سردار کے بھاگ جائے۔ اور یہاں ایسا نہیں ہوا کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جان نثاروں کے میدان میں برابر جمے رہے آپ کبھی نہیں بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ بھاگے والوں کو پکارے تو فوراً میدان میں سب مسلمان آموجود ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی ۱۲ ظ)

حق تعالےٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ أَرَاكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (اور تم کہنے پر

نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھا دی گئی تھی)
اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی
مَا فَاتَکُمْ یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے
نافرمانی کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی
حکمت ارشاد فرماتے ہیں لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ تاکہ تم کو (انتقام
لینے کے بعد) اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہو گئی تھی یہ وہی بات ہے
جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے
ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔
اسی بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دیدی تاکہ بدون
سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے
اس جگہ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا (تاکہ تم مغموم نہ ہو) میں لا، نافیہ کو زائد مانا ہے۔ ان کو
یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لئے دی جاتی ہے
پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لئے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے
نزدیک لَا کو اپنے معنے پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لئے انھوں نے لَا کو زائد
کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو۔ مگر جس نے اس
حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ
عنہم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے اگر ان کی خطا بدون کسی انتقام
کے معاف کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے اس لئے ان کو
تھوڑی سی مصیبت دیدی گئی۔ تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو پس یہ کہنا غلط ہے کہ
سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لئے ہوا کرتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ رنج کو کم کرنے
کے لئے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف
ہے۔ اور لَا، کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اب بتلایئے جس شخص کی یہ حالت
ہو کہ خطا کرکے بدون سزا کے اسے چین ہی نہ پڑے وہ واقعات رحمت سنکر گناہوں

پر دلیر ہو گا یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقیناً جو لوگ صحیح المزاج ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعات رحمت سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرمیں گے۔ نمک حرام ہے وہ نوکر جس کی خطا بدون سزا کے معاف کردی جائے۔ تو ناز کرنے لگے اور نافرمانی پر دلیر ہو جائے شریف وہ ہے جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لئے گڑ جائے اس لئے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو واقعات رحمت سننے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں ان میں مرض ہے ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت پیدا کرنا چاہیئے پھر ان پر مستحبات کے یہ برکات و منافع سن کر الٹا اثر نہ ہوگا۔ غرض بعض مستحبات کی بدولت عمر بھر کا دلدر دھل جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی۔ اب وہ شبہ بالکل جاتا رہا کہ قرآن کا ہر جزو ضروری کہاں ہے بلکہ بعض مستحبات بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مستحبات بھی تعلیم کے درجے میں تو نہایت ہی ضروری ہیں اور باعتبار ثمرات کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں اب وہ دعویٰ صحیح رہا کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر جزو ضروری ہے۔ اور میرا کہنا بھی صحیح ہو گیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیات کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر اسی کو کیوں اختیار کیا گیا تو اصل یہ ہے کہ ضروری تو سب ہیں مگر کسی وقت کسی خاص مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص مضمون کو ترجیح ہو جاتی ہے۔ کبھی ایک تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے کبھی دوسری تعلیم کی اور اس کے لئے خدا تعالیٰ ہر ضرورت کے موقعہ پر اپنے بندوں کے دل میں القاء کر دیتے ہیں کہ اس وقت اس مضمون کو بیان کرنا چاہیئے یہ کام بھی وہ خود ہی

کرتے ہیں ورنہ بیان کرنے والے کو کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ اس وقت سامعین کو کس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں خود اپنی حالت دیکھتا ہوں کہ بعض دفعہ سوچنے سے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا بلکہ اکثر خود بخود القا ہوجاتا ہے سفر میں جہاں کہیں بیان ہوتا ہے تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ کیونکہ بیان ان کی حالت کے مناسب ہوتا ہے۔ مگر الحمد للہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی حالت کا تجسس کروں نہ مجھ سے فرمائشی مضمون کبھی بیان ہوسکے۔ بلکہ توکل علی اللہ بیان شروع کردیتا ہوں اور جو باتیں اللہ تعالےٰ دل میں ڈال دیتے ہیں بیان کردیتا ہوں اور وہ اکثر سامعین کی ضرورت و حالت کے مطابق ہوتی ہیں اس سے لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کو کشف سمجھیں مگر مجھے تو عمر[1] بھر بھی کشف نہیں ہوا اور اس میں کشف کی کیا بات ہے بس حق تعالےٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں اتنی بات تو ہے کہ بحمد اللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہوجو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو جس سے ان کی اصلاح ہوجائے۔ خدا تعالےٰ کو تو علم غیب ہے وہ سب کی حالت جانتے ہیں وہ اس نیت کے بعد ضرورت و حالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ہفتوں میں کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج یہ آیت بیان کے لئے ذہن میں آئی تو میں سمجھتا کہ اس مضمون کی دوسرے مضامین سے

---

[1] میں کہتا ہوں کہ کشف نہ سہی تو الہام ہونے میں تو شک نہیں ۱۲ ظ

ضرورت زیادہ ہے اس لئے اس کو اختیار کیا۔
بہرحال اس آیت میں ایک ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالےٰ نے ہماری بدحالی کا ایک نہایت سہل علاج بیان فرمایا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ہیں کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے کسی کی زیادہ باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں الا ماشاءاللہ اور جن کی تباہی کم ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں جن کی تباہی زیادہ ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت انہی لوگوں کو ہے جو بہت تباہ حال ہیں۔ اور جو کم تباہ حال ہیں ان کو ضرورت ہی نہیں یا کم ضرورت ہے۔ بلکہ برعکس حالت یہ ہے کہ جن کی تباہی کم ہے ان کو اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں۔
اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم نے اپنے بعض دوستوں کو دیکھا ہے جن پر قرض بہت زیادہ ہے کہ وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ بے فکر ہیں جن پر قرض تھوڑا سا ہے۔ بس ان کو تو قرض کی عادت ہوگئی اور اس کے بار کا حس ہی نہیں رہا اب وہ قرض لینے میں بڑے دلیر ہوگئے ہیں اور جس کو قرض کی عادت نہیں اور اسکے ذمہ تھوڑا سا قرض ہوگیا ہے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہے وہ زیادہ پریشان ہے بعض دفعہ اس کو راتوں کی نیند نہیں آتی اور وہ ان لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہو کر بھی رات کو چین سے سوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے زوال کی امید ہو۔ اور جب زوال کی امید نہ رہے تو اب فکر نہیں رہتی بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ کم گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ مغموم و پریشان ہیں اور جو زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو بے حس ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میری مغفرت تو ہو ہی نہیں سکتی پھر لذات میں بھی کیوں کمی کروں پھر وہ دل کھول کر گناہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب مرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس وقت بھی توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اگر اس سے توبہ کو کہا جائے تو صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کافی ہو گی۔

چنانچہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہو گا۔ میرے تو گناہ اس قدر ہیں کہ ان کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے یہ مایوسی تھی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

تو بعض دفعہ کثرت گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہونچا دیتی ہے (خدا ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین) کثرت گناہ میں تو یہ اثر ہے ہی مگر آپ حیرت کریں گے کہ بعض دفعہ یہی اثر اطاعت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ مگر قربان جائیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا ہے۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گا کہ واقعی ہم کو کیسے کامل و اکمل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عطا ہوئے ہیں کہ آپ کی نظر کہاں تک پہنچی ہے اور یہی چیز ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوئی ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم السلام حکماء سے ممتاز ہیں حکماء کے پاس صرف محسوسات کا علم ہے اور وہ محسوسات ہی کے خواص کو جانتے ہیں۔ انہی کی ترکیب و تحلیل کیمیاوی طریقہ سے کر سکتے ہیں بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معانی معقولہ کے خواص کو جانتے ہیں

اور جو چیز نظر نہیں آتی بلکہ محض اعتباری و عقلی شے ہے اس کے آثار کو انھوں نے ایسا صحیح سمجھا ہے کہ کیا کوئی کیمیاوی طریقے سے ان کی تحلیل کرکے سمجھیگا اور یہیں سے آپ کو فقہا کی بھی قدر ہوگی۔ کیونکہ یہ حضرات علوم انبیاء ہی کے حامل ہیں اور معانی معقولہ ہی کی ترکیب و تحلیل و بیان خواص میں مشغول ہیں۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی دیکھئے کہ اعمال شر پر بُرا اثر مرتب ہوتا تو کسی کی سمجھ میں آسکتا تھا مگر آپ کی نظر دور پہنچی کہ بعض دفعہ اعمال خیر پر بھی بُرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ کی شان تو یہ ہے عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَ اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ۔ (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس بہت اچھی ہوئی میری تعلیم اور اللہ تعالےٰ نے مجھ ادب دیا پس اچھی ہوئی میری تادیب) جس کو خدا تعالےٰ نے لکھایا پڑھایا ہو اس کی نظر جتنی دور بھی پہونچے کم ہے۔

بظاہر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت جتنی بھی ہو اچھی ہے طاعت کے لئے کوئی حد نہ ہونا چاہیئے۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ طاعت کے لئے بھی ایک حد ہے اور اسی حد تک وہ محمود ہے اس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ اثر بُرا پیدا ہوگا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو دوا کرنا اچھا ہے۔ اور ترک دوا بُرا ہے۔ لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوا اچھی شے ہے تو اس کے لئے کوئی حد ہی نہ ہو بلکہ اگر کوئی مقدار ضرورت سے زیادہ دوا کھائے گا تو اس پر نتیجہ بُرا مرتب ہوگا یہی حال طاعات کا ہے کہ ان کے لئے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہٖ اچھی چیزیں ہیں اس کو انبیاء علیہم السلام ہی نے سمجھا ہے۔ جو اطباء روحانی ہیں انھوں نے بتلادیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہیں جیسے ہر دوا کے لئے مقدار اکل و شرب

متعلق ہوتی ہے طاعات کے لئے بھی درجات معین ہیں۔ چنانچہ خوف الٰہی ایک بڑی طاعت ہے جس کا جابجا نصوص میں حکم ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے۔

ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ یعنی اے اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی میں حائل ہوجائے۔ اس میں آپ نے بتلا دیا کہ خوف (طبعی) کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ وہ اسی قدر مطلوب ہے کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے۔ کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خوف (طبعی) کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے کیونکہ ایسے شخص کو ہر وقت حق تعالٰی کے قہر ہی پر نظر ہوگی۔ تو کوئی عمل بدقابل معافی نہ ہوگا۔ اور عظمت پر نظر کر کے اپنا کوئی عمل قابل قبول نظر نہ آئے گا اور اس کو نجات کی توقع نہ رہے گی۔ نتیجہ یہ کہ رحمت حق سے مایوس ہوجائے گا۔ اور مایوسی کفر ہے۔ تو کیا ٹھکانا ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی رازدانی کا۔ بھلا کون عاقل اس کو تجویز کر سکتا ہے کہ طاعت بھی سبب کفر ہو سکتی ہے مگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ غلبۂ خوف بعض دفعہ سبب یاس ہوجاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یاس کفر فَاِنَّہٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (اللہ تعالٰی کی رحمت سے سوائے کافروں کو مایوس نہیں ہونا)

اس لئے آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگا دی مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں جو معاصی سے روک دے اور بس یہی وہ علوم ہیں جن کو دیکھ کر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے اور اسی لئے انھوں نے نبوت کی حقیقت کو اپنی کتابوں میں مانا ہے کہ بعض افراد ایسے ہوسکتے ہیں جن پر بلا واسطہ مبدا ار فیاض کی طرف سے

علوم فائض ہوں اور اسی لئے وہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی حکیم نے اپنے زمانہ کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کا اصحاب قوت قدسیہ ہونا تسلیم کیا وہ ان کے علوم کو دیکھ کر یہ کہہ اٹھے کہ اتنا بڑا علم کسی ریاضت یا تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوتا ہے کہ مبدا فیاض سے ان کو علم عطا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکماء نے ایک غلطی بھی کی وہ یہ کہ نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہا کہ یہ امیین کے واسطے نبی ہیں (یعنی جاہلوں کے واسطے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں اور نہ ہم کو ان کے اتباع کی ضرورت ہے۔ لانا قوم قد ھذبنا نفوسنا بالعلم کیونکہ ہم نے علوم سے اپنے نفوس کو مہذب بنا لیا ہے اب ہم کو کسی مصلح کی ضرورت نہیں قرآن میں بقول بعض مفسرین فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (اپنے علم سے جو ان کو حاصل ہے خوش ہیں) ایسے ہی حکما کے بارے میں ہے۔
ان کا یہ قول ایسا تھا جیسے بعض یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہتے تھے۔ کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہیں مگر اہل عرب کے واسطے ہیں۔ ہمارے واسطے نہیں ہیں کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے موید ہے۔ اس کا جواب علماء نے خوب دیا کہ تمہارے نزدیک وہ نبی تو ہیں اور نبی کے لئے صادق ہونا ضروری ہے اور وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے بدون میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہوسکتی تم ان کے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہو کہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی تو ان کو اس بات میں بھی سچا ماننا پڑے گا۔ اور اس بات کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے کذب کو مستلزم ہے کہ وہ خاص اہل عرب کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں۔ پس اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ تو جس طرح

یہود نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص اہل عرب کا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کہا تھا اسی حکماء بھی انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو تسلیم کرکے انھیں خاص عوام کے لئے نبی کہتے تھے اپنے واسطے نبی نہ کہتے تھے۔ خیر یہ غلطی تو ان سے ہوئی مگر انبیاء کے علوم عالیہ کی وجہ سے نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کرکے اپنی کتابوں میں علم النوامیس کے عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے اور آجکل کے حکماء جو حقیقت نبوت ہی کا انکار کرتے ہیں تو حقیقت میں یہ حکماء نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ واقع میں صناع ہیں کہ عجیب وغریب صنائع کے موجد ہیں گو صنعت بھی مفید چیز ہے۔ مگر اس سے آدمی حکیم نہیں بن سکتا حکمت علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکماء عصر کے پاس معانی خاک نہیں ہیں بس ان کے پاس جو کچھ ہے مشاہدہ ہے ان سے بہتر حکماء تو وہی تھے۔ یعنی حکماء یونانیین کیونکہ وہ لوگ اہل معانی تھے۔ گو معانی میں انھوں نے غلطیاں کی ہیں اور ایسی غلطیاں کی ہیں کہ علوم نبوت ظاہر ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک بچہ بھی ان غلطی پکڑ سکتا ہے مگر پھر بھی ان کے پاس کچھ معانی عقلیہ کا ذخیرہ تھا تو سہی۔ اسی لئے وہ حقیقت نبوت کا انکار نہ کرسکے حکماء عصر کے پاس تو علوم عقلیہ ہیں ہی نہیں۔ اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کے علوم کی قدر نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے اُن کے انکار نبوت کی۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی ہوجاتی ہے تو وہ دل کھول کر گناہ پر دلیر ہوجاتا ہے۔ اب اس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی (کیونکہ مثل مشہور ہے اَلْیَاسُ اِحْدَی الرَّاحَتَیْنِ کہ ناامیدی سے بھی گونہ راحت ہوجاتی ہے ۱۲ ظ) اور جس نے تھوڑے گناہ کئے ہیں وہ رحمت ومغفرت

سے مایوس نہیں ہے۔ بلکہ اس کو امید ہے اور امید کی وجہ سے معافی کی فکر بھی ہے تو وہ زیادہ پریشان ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں ان کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ وہ زیادہ پریشان ہیں۔

ظاہر میں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت سے غم زیادہ ہوتا ہوگا مگر واقع میں اس کا عکس ہے کہ تھوڑے گناہ والے کو زیادہ غم ہوتا ہے۔ اور ان میں سے جو خاص لوگ ہیں ان کی تو یہ حالت ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگر اس کی باطنی حالت میں ایک تنکا کم ہوجاتا ہے)

یعنی گناہ تو گناہ اگر اس کی قلبی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہوجاتا یا ایک دار بھی کم ہوجاتا ہے تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اگر اس وقت کوئی شیخ محقق مل گیا تو اس کی تسلی سے سنبھل جاتا ہے ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آجاتی ہے۔ چونکہ مولانا محقق ہیں اس لئے دوسری جگہ تسلی بھی فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو | آں صلاح تست آئیں دل شو
چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں | تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(اے سالک جب تجھ پہ قبض کی حالت پیش آئے تو نا امید مت ہو وہ تیری اصلاح کے لئے ہے جب کہ قبض پیش آئے تو اس میں بسط دیکھ خوش خرم ہو پیشانی پر بل نہ ڈال)

اس کا یہ مطلب کوئی صاحب نہ سمجھیں کہ قبض سے تنگ آنا اور پریشان ہونا زیبا

حرکت اور بری حالت ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ قبض سے پریشانی کا ہوتا تو طبعی اور لازمی امر ہے ہاں شیخ کی تسلّی کے بعد عقلاً پریشان رہنا یہ برا ہے۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو تسلّی قبض پر نہیں ہوتی یعنی شیخ کی تسلّی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود قبض کی ذات سے راضی رہو اور یہ بالذات مطلوب حالت ہے۔ اس پر خوش رہو بلکہ تسلی ان مصالح اور منافع پر ہوتی ہے جو اکثر قبض پر مرتب ہو جاتے ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار کی تسلّی کی جاتی ہے کہ میاں بخار آگیا تو کیا حرج ہے بدن کا تنقیہ ہو گیا یا گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ تو مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیماری مطلوب شے ہے۔ اس پر راضی رہو۔ بلکہ بیماری سے جو بدن کا تنقیہ ہو گیا ہے یا اور بعض فوائد حاصل ہو گئے ہیں ان پر تسلّی کی جاتی ہے۔ کہ ان منافع کا خیال کر کے پریشانی کو کم کرنا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح بیماری خود ذاتہ تسلی کے قابل نہیں ہے اسی طرح قبض اپنی ذات سے تسلّی کی شے نہیں ہے ۱۲ ظ)

ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اول وحی نازل ہوئی ہے تو اس کا قصہ حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف عظمت الٰہی سے آپ کو بخار آگیا۔ آپ گھبرائے ہوئے دولت خانہ پر تشریف لائے اور کمل اوڑھ کر لیٹ گئے جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالٰے عنہا سے آپ نے یہ واقعہ بیان فرمایا وہ آپ کو حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے وحی کا قصہ سن کر آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ افسوس آپ کی قوم آپ کو مکہ مکرمہ سے ایک دن نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ کی پوری مدد کروں گا۔

غرض ہر طرح آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوا ہوں اس کے بعد تین سال تک وحی منقطع ہو گئی اس وقت آپ اس قدر پریشان

تھے۔ کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھ کر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گرا کر اپنے کو ہلاک کر دوں۔ یہ قبض ہی کی حالت تھی۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر اپنی قلبی حالت میں ذرہ بھر بھی کمی پاتا ہے)

آپ اشتیاق وحی میں بے چین تھے اور اس بے چینی میں کسی وقت اپنے کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتے تھے کہ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپ کی تسلی فرماتے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اَبَدًا اَفْضَلُ مَا صَلّیٰ عَلیٰ اَحَدٍ مِنْ خَلْقِہٖ ۱۲ رحمت بھیجے اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ افضل اس رحمت جو اللہ تعالیٰ کسی پر اپنی مخلوق بھیجتے ہیں)

آپ اس امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں خدا تعالےٰ نے آپ کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بنایا ہے۔ تو جب قبض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو اس پر راضی ہو اور ذرا بھی پریشان نہ ہو، ہاں اس پر رضا اس طرح ہو جاتی ہے کہ اس کے مصالح ومنافع کے استحضار سے کسی قدر قلب کو شگفتگی ہو جاتی ہے۔ پھر ان مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جس کو مولانا نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو
آں صلاح تست آیس دل شو

(جب تجھ کو قبض پیش آئے ناامید مت ہو وہ تیری مصلحت کے لئے ہے)

محقق کے ارشاد سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتی ہیں ۔ یہ کوئی بری حالت نہیں جس سے سالک خواہ مخواہ اپنے کو مردود سمجھنے لگے۔ اور فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں
تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں
(جب تجھ کو قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا مشاہدہ کر کے
خوش و خرم ہو اور پیشانی پر بل نہ ڈال)

اس میں یہ بتلا دیا کہ قبض کے بعد بہت قوی ہوتا ہے۔ یہ کلمہ دراصل ایسا ہے جیسے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (یقیناً دشواری کے بعد آسانی) میں کلمہ مع بمعنی بعد تم اس کا خیال کر کے شاداں و فرحاں رہو پریشان نہ ہو۔ یہ تو اجمالی مصالح ہیں اور کبھی بعض مصالح کا تفصیلی علم بھی ہو جاتا ہے۔ تو اس سے پوری تسلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ بعض اوقات سالک پر بسط کی حالت میں کسی وارد کے عطا ہونے سے ایک نازکی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس وقت اگر حق تعالیٰ دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبر و عجب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاوے حق تعالیٰ نے اس کی یوں دستگیری فرمائی کہ قبض طاری کر دیا اور ساری کیفیات و واردات کو سلب فرمالیا۔ اب اس کی یہ حالت ہے کہ بجائے ناز و انداز کے یوں دیکھتا ہے کہ میں ساری دنیا سے زیادہ ذلیل ہوں اس وقت سچ مچ اس کو اپنے سے زیادہ ذلیل و حقیر کوئی نظر نہیں آتا چنانچہ ایک سالک نے قبض کی حالت میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور جب تک انسان ایسا ہی نہ بن جائے اس وقت تک اہل دل کا کلام سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف اس وقت تک عارف نہیں ہوتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے صاحب سالک پر واقعی ایسی حالت گزرتی ہے کہ وہ سچ مچ تمام مخلوق سے اپنے کو بدتر سمجھتا ہے۔ خیر اگر کسی پر یہ حالت نہ گزری ہو تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے

سمجھ لے کہ نہ معلوم میرا انجام کیسا ہو ممکن ہے کہ کافر فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہو جائے کیونکہ حالت یہ ہے کہ ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بہ لب گور بریم تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان بھی ہنستا ہے ایمان اگر قبر تک سالم لے جائیں تو ہماری پاکی اور ناپاکی کی تحقیق ہو)

تو اپنے دل کو یہی سمجھانا چاہیے کہ انجام معلوم ہونے سے پہلے مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں (اور گو سب سے بدتر ہونا بھی متیقن نہیں مگر محتمل تو ہے اور احتمال کی بنا پر اپنے کو اچھا سمجھنا مضر اور برا سمجھنا مفید ہے بشرطیکہ یاس کا درجہ نہ ہو اس لئے اپنے کو سب سے برا ہی سمجھنا چاہیے ۱۲ ظ)

ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا جائز ہے۔ اگر یہ اطمینان ہو کہ ہم اس سے اچھی حالت میں مریں گے۔ تو واقعی ہمیں کسی سے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کیا حق ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ انجام کی کچھ خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ خوب کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت چل مرکب مردان خدا نے سنگلاخ جنگل میں راستہ قطع کیا ہے اور ناامید مت ہو کہ رندان بادہ نوش اچانک ایک ہی نالہ میں منزل مقصود کو پہنچ گئے)

تو صوفیہ کے اس کلام کی ایک موٹی سی توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا خیال کر کے اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھتا رہے لیکن یہ تو عقل کے سمجھنے کے واسطے توجیہ ہے اور اہل

حال تو خاتمہ کے خیال سے قطع نظر کر کے بھی حالت موجودہ ہی میں اپنے کو سب سے بدتر سمجھتے ہیں۔ باقی اس کو میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

گفتم کہ چو ما شوی بدانی

(کسی نے کہا کہ عاشقی کس کو کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ جب تو ہم جیسا ہو جائے گا اس کو جان لے گا)

بس اس وقت تو تقلیداً مان لیا جائے کہ سالکین پر ایسی حالت گزرتی ہے جیسا ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون وہامان سے بھی بدتر ہوں تو جب بسط میں غلبۂ واردات سے ناز کی سی کیفیت سالک میں پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت حق تعالٰی اس پر قبض طاری کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی عبدیت کا مشاہدہ کرے اور اپنے کو سب سے ذلیل وحقیر سمجھنے لگے اور دعوٰے اور ناز نہ کرے۔ تو دیکھئے یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس وقت قبض وارد نہ کیا جاتا تو بسط میں تو یہ تباہ ہو جاتا کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ سالک کے لئے انوار حجاب راہ بنے ہوئے تھے ذکر میں جو اس پر تجلیات وانوار کا انکشاف ہوتا تھا یہ انہی کی سیر میں مشغول ہو گیا اور انہی پر اکتفا کرنے لگا حالانکہ مقصود توجہ الی الحق ہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک حجاب ظلمانی، ایک حجاب نورانی۔ حجاب ظلمانی تو یہی وساوس و خطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے ہیں۔ ان پر توجہ کرنا تو ظاہر ہے کہ مضر ہے۔ اور حجابِ نورانی یہ ہے کہ عالمِ ملکوت کے انوار و تجلیات مکشوف ہوں وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے اس لئے اس کی کیفیات پر بھی توجہ نہ کرنا چاہئیے۔ حضرت حاجی صاحب

یہ بھی فرماتے تھے کہ حجاب نورانی ظلمانی سے اشد ہے۔ کیونکہ اس میں بوجہ نورانی ہیئت کے زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ایک نئی سی چیز ہے اس کو دیکھ کر سالک سمجھتا ہے کہ میں کامل ہوگیا حالانکہ وہ ہنوز غیر حق کے ساتھ الجھا ہوا ہے کیونکہ وہ انوار و تجلیات بھی اس کے شاغل عن الحق (حق سے پھیرنے والے) ہیں اور اس کو ان میں ایک لذت بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب ہوجاتے ہیں تو بڑا رنج ہوتا ہے تو یہ میاں اب تک اپنی لذت ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مقصود تک رسائی کہاں اس وقت حق تعالےٰ قبض طاری کرکے ان انوار و تجلیات کو سلب کر لیتے ہیں تاکہ سالک غیر حق سے ہٹ کر حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس میں بندہ کی بڑی مصلحت ہوتی ہے ورنہ مقصود سے رہ جاتا پس اگر کسی وقت تمام انوار کو چھپا دیا جائے۔ تو یہ حق تعالےٰ کی بڑی رحمت ہے ایسے وقت گھبرانا نہ چاہیئے غرض یہ چند مثالیں ہیں تفصیلی حکمتوں کی ان کے سوا اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم ہوجاتی ہیں تو ان اجمالی یا تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلی ہوجاتی اور کچھ شگفتگی قلب میں آجاتی ہے ورنہ در حقیقت قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے۔ دراصل تسلی تو جب ہی ہوتی ہے جب کسی قسم کا بسط ہو (معلومات دنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال و متاع کا چوری ہوجاتا یا لٹ جاتا تو موجب رنج ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ثواب آخرت کو سوچ کر یا مال جانے کے بعد جو حفاظت و نگہداشت سے بے فکری ہوگئی۔ اس راحت کو مستحضر کرکے دل کو سمجھا لیا جائے مگر نفس مال کا چوری جانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اس پر طبعاً راضی ہوجائے اس سے تو ایک دفعہ کو صدمہ ہو ہی گا۔ اور اس کا تصور قائم کر لینا بھی موجب الم ہوگا۔ ہاں اس کے تصور کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں دل کو لگایا جائے تو کچھ تسلی ہو سکتی ہے

اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لٹ جانا اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی وطبعی امر ہے گو اس کے مصالح ومنافع کی طرف قلب کو متوجہ کرکے تسلی حاصل ہو جائے۔ مگر خود نفس قبض پر دل راضی نہیں ہوتا نہ اپنی ذات سے تسلی کی شے ہے بلکہ جس طرح دنیا کے معاملات میں اصل تسلی کی چیز یہ ہے کہ روزانہ نئی آمدنی ہوتی رہے اور ہر دن چھنا چھن روپے ہاتھ میں آتے رہیں اسی طرح باطن میں اصل تسلی کی چیز بسط ہی ہے جس میں وقتاً فوقتاً یوماً فیوماً متاع باطن کو ترقی ہوتی رہتی اور جدید ولذیذ واردات ہر دم وارد ہوتے رہیں ۱۲ ظ)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم گناہ کرنے والوں میں جو خاص لوگ ہیں انکی حالت یہ ہے کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کر سکتے ہیں ایک ذرا سے قلبی تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی اُن کو قرار نہیں آتا اسی سے تو وہ بے چین اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سن لیا کہ سالکین کی قبض میں کیا حالت ہوتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑے گناہ والا بہ نسبت بہت گناہ والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے اور جس کے پاس بالکل گناہ نہیں وہ اُس سے بھی زیادہ پریشان ہے۔ جس کے پاس تھوڑے سے گناہ ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ہمیشہ سے اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سو پچاس روپے ہر وقت جمع رکھتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہو جائے تو سمجھ لیجئے اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے سے مقروض کو قلیل قرض سے وہ پریشانی نہ ہوگی جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہو جانے سے ہوگی کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو کبھی کسی سے ایک پیسہ کا ادھار نہ لیا ہو اس کو تو اس حالت کے

تصور سے بھی لرزہ آوے گا۔ کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے اور شاید مجھے دوسروں سے مانگنا پڑے۔ اہل اللہ کی یہی حالت ہے۔ کہ گناہ تو کیا وہ تو احتمال گناہ سے کانپتے ہیں۔ واردات کے کم ہو جانے سے ہی گھبرا جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بُعد کا وہم سا ہو جاتا ہے ۱۲)

یہ سلسلۂ کلام اس پر شروع ہوا تھا کہ تھوڑے گناہ میں غم زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی اس کو گناہ کے نشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان ہو جاتے ہیں وہ بھلا گناہ سے تو کیوں پریشان نہ ہوں گے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے کسی کو اس کا زیادہ احساس ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر نظر اور تاسف بھی نہ ہو تو اس کی یہ حالت خود قابل تاسف ہے اول تو اپنے گناہوں پر نظر کر کے ہم کو خود رونا چاہیئے اور جو کسی کو رونا نہ آوے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیئے کہ افسوس میں ایسا سنگدل ہوں کہ مجھے اپنی بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اس کو کسی بات پر رونا نہیں آتا تو اسی پر کیوں آئے گا تو سمجھ لیجئے کہ اس رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رونے کی کوشش کرنی چاہیئے چاہے رونا آئے یا نہ آئے تو رونے کی صورت بنانی چاہیئے اس کی دلیل حدیث ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکَوْا (اگر رو نہ سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو) اور اکثر قاعدہ تو یہ ہے کہ رونے کی کوشش کرنے سے رونا آ ہی جاتا ہے چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہو جاتا ہے۔ اور اگر رونا بھی نہ آئے تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تباکی ہی کو بکا کا بدل قرار دے دیا ہے اور جب کسی چیز کے لئے کوئی بدل ہوتا ہے تو وہاں مقصود کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اصل و بدل میں مشترک ہو۔ تو معلوم ہوا کہ رونے سے جو مقصود ہے وہ رونے کی کوشش کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طبیب جب کوئی

دوا لکھ کر اس کا بدل بتلاتا ہے تو وہاں اس کا مقصود ایک ایسا اثر ہوتا ہے جو دونوں دواؤں میں مشترک ہے۔ پس جب تباکی بکائے عین کا بدل ہے تو معلوم ہوا کہ بکائے عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ چیز ہے جو اس میں اور تباکی میں مشترک ہے وہ کیا چیز ہے وہ بکار قلب ہے جس کو دل کا رونا کہتے ہیں پس تباکی میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت موجود ہے یعنی دل کا رونا اور دل کا رونا کیا ہے۔ اس کی حقیقت ہے فکر اور رنج و ملال تو جو شخص رونے کی کوشش کرے گا ظاہر ہے کہ وہ اس سے خالی نہ ہوگا اس لئے اس تقریر پر شبہ نہ رہا۔

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے کہ حج سے آکر مجھے رونا ہی نہیں آتا گویا وہ اپنی اس حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ رونا نہ آنے پر رنج کرنا یہ بھی رونا ہی ہے۔ پہلے آپ کی آنکھ روتی تھی اس وقت ایک مصرع کے مصداق تھے۔

ع اے خوشا چشمیکہ آں گریان اوست

(وہ آنکھیں بہت اچھی ہیں جو اس کی محبت میں رونے والی ہیں)

اور اب دل روتا ہے اس وقت آپ دوسرے مصرعہ کے مصداق ہیں۔

ع اے خوشا آں دل کہ آں بریان اوست

(وہ دل بہت اچھا ہے جو اس کی محبت میں سوختہ ہے)

اور اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا مقصود نہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار وعظ فرمایا تو لوگوں نے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آپ نے فرمایا لَا تَشُقُّوْا جُيُوْبَكُمْ بَلْ شُقُّوْا قُلُوْبَكُمْ یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ دلوں کو چاک کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں گریبان چاک کرنے والے قابل ملامت ہیں بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اصل

مقصود دل کا چاک کرنا ہے اس میں سعی کرنا چاہیئے۔ اور یہ حالت جس کی وجہ سے کپڑے چاک کئے جارہے ہیں مقصود نہیں نہ یہ کچھ کمال ہے پس ایسے لوگ کامل نہیں ان کو اہل کمال تو نہ سمجھے مگر طعن بھی نہ کرے کیونکہ بعضے معذور بھی ہوتے ہیں چنانچہ اسی لئے شیخ سعدی شیرازیؒ جن کا لقب تاج الاولیاء ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست
کہ غرق ست ازاں می زند پا و دست

(درویش حیران و مست پر طعن تشنیع مت کرو کہ عشق میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے)

اس میں تو یہ تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو آگے ان کی حالت بتا کر عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند
چو طاقت نماند گریباں درند

(تسلیم کے ساتھ سر جھکا لیتے ہیں جب طاقت نہیں رہتی گریبان پھاڑتے ہیں)

پس یہ لوگ معذور تو ہیں مگر صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کپڑے پھاڑنے والوں کی حکومت صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے ظاہر ہی میں جو تصرف چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں باطن پر ان کی حکومت نہیں ہوتی۔ اور اہل کمال وہ ہیں جن کی حکومت ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے کہ وہ کسی قلبی حالت سے از جارفتہ نہیں ہو جاتے۔ وہ حالت ان پر غالب نہیں ہوتی بلکہ وہ خود حالت پر غالب ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہلاک ہو گیا

اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوگئی مگر حضرت جنید ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آگئی اور کامل پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور در حقیقت وہ بہت تیز جا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالا مال کون ہوا ہوگا مگر بجز ایک آدھ قصہ کے مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر بیہوش ہو گئے تھے۔ باقی صحابہ سے عموماً یہ بات ثابت نہیں ہے کہ کسی نے جوش و ولولہ میں کپڑے پھاڑ دیئے ہوں یا بیہوش ہو گئے ہوں یا ناچنے لگے ہوں اور اگر ایک آدھ سے کبھی اتفاقیہ بیہوش ہو جانا ثابت بھی ہے تو کون سے جو حضرت ابو بکر نہ تھے حضرت عمر فاروق نہ تھے۔ حضرت عثمان نہ تھے۔ حضرت علی نہ تھے رضی اللہ عنہم حالانکہ یہ حضرات اکمل الصحابہ ہیں تو ان کے سامنے موجود نہ ہیں تھے۔ ان میں ایک آدھ قصہ شاذ و نادر ایسا ہو گیا عموماً ان کی بھی یہ حالت نہ تھی۔ حضرات صحابہ میں جو سب سے زیادہ کامل ہیں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ وصال مسلمانوں کے لئے کچھ کم جانکاہ نہ تھا حضرات صحابہ اس پر جس قدر بھی روتے تھوڑا تھا۔ اور نہ معلوم ہمارے سامنے یہ حادثہ ہوتا تو ہم لوگ کیا سے کیا کر ڈالتے مگر حضرات صحابہ نے بجز آنسو بہا لینے اور تنہا بیٹھ کر رو لینے کے کچھ نہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بظاہر صحابہ میں سب سے زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ حواس باختہ ہو گئے اور تلوار ہاتھ میں لیکر پکار تے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔ یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں جا پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیقؓ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیقؓ سب سے زیادہ مضبوط نکلے ان کی زبان سے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا وَاخَلِیْلَاہُ وَاحَبِیْبَاہُ لَقَدْ طِبْتَ حَیًّا وَمَیِّتًا وَلَا نَتْ اَکْرَمُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ اَنْ یُّذِیْقَکَ الْمَوْتَ مَرَّتَیْنِ (رواہ کما قال) (ہائے خلیل ہائے محبوب آپ زندگی میں خوشبودار تھے موت میں بھی خوشبودار ہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم اس بات سے کہ دو مرتبہ موت کا ذائقہ چکھیں) اس کے بعد غایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے صحابہ تمام کے تمام حضرت صدیق کے منہ کو تک رہے تھے کہ دیکھیں ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے اور یہ کیا خبر سناتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے اول تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا عَلَی اُسْلُکَ یَا رَجُلُ۔ اے شخص بس ٹھہر جا مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور برابر اپنی اسی بات کو پکارتے رہے۔ اس کے بعد حضرت صدیق سیدھے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لے گئے اور خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا اَیُّھَا النَّاسُ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ط وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ط اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ یعنی اے لوگو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو تو وہ سن لے کہ آپ کا تو وصال ہو گیا۔ اور جو خدا تعالیٰ کو معبود سمجھتا ہو اس کی عبادت کرتا ہو تو وہ سن لے کہ خدا حی لایموت ہے وہ کبھی نہ مریگا اس کے بعد یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین حق سے اُلٹے پاؤں ہٹ جاؤ گے۔ اور جو اس طرح ہٹے گا وہ خدا تعالےٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دیگا (اپنا نقصان کرے گا) اور حق تعالیٰ (ایسے وقت میں) شکر وحمد کرنے والوں کو جزا دیں گے اور یہ آیت بھی پڑھی اِنَّکَ مَیِّتٌ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ آپ بھی ایک دن مرنے والے ہیں اور یہ کفار بھی پھر تم سب قیامت کے دن اپنا جھگڑا خدا کے پاس لیجاؤ گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہ مضمون اور یہ آیتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا۔ اب ان سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا۔

مارے غم کے تلوار ٹیک کے بیٹھ گئے اور رونے لگے صحابہ فرماتے ہیں کہ یہ آیات ہمارے ذہن سے اس وقت بالکل غائب ہو گئی تھیں جس وقت حضرت صدیقؓ نے منبر پر ان کو پڑھا ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی اتر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں سب صحابہ سنبھل گئے اور دین کے کاموں میں مشغول ہو گئے مگر جیسے حضرت صدیقؓ افضل الصحابہ تھے ویسے ہی اس وقت سب سے زیادہ صاحب ضبط و استقلال بھی نکلے۔

ایک واقعہ حضرت صدیقؓ کے استقلال کا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا اس لئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آجکل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت صدیقؓ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں (کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے۔ تو یہ لوگ فرض

قطعی کے منکر ہیں۔ اور) ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ (جو شخص آپ کے دین کو بدل دے پس اس کو قتل کر دو) اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا اَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ عِنَاقًا عِقَالًا كَانُوْا یُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاُقَاتِلَنَّهُمْ عَلَیْهِ اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا ایک بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس وقت قلب کی چنانچہ پھر سب صحابہؓ حضرت صدیقؓ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ اور بعد میں اقرار کیا کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہم لوگوں کو سنبھالا ورنہ ہم گمراہی میں پڑ چکے تھے کہ ان[1] لوگوں کو مسلمان سمجھتے تھے ۱۲ ظ) اس واقعہ سے حضرت صدیقؓ کے استقلال و قوت قلب کا

---

[1] کتب احادیث و تاریخ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ کہ مانعین زکوٰۃ کے مرتد ہونے پر حضرات صحابہؓ نے اجماع کر لیا تھا باوجودیکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے اور نماز پڑھتے تھے اور جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ ملے تھے تو یہاں ایک بدعی مقتدا ہے اہل حدیث کی غلطی واضح ہو گئی جو اس زمانہ میں جماعت قادیانی کے متعلق اپنی کی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شریعت میں مرتد وہ ہے جو جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار میں جا ملے۔ اور جو ایسا نہ کرے بلکہ اپنے کو مسلمان کہے وہ مرتد نہیں اس لئے قادیانی جماعت مرتد نہیں کیونکہ وہ اپنے کو حلقہ بگوش اسلام کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت بہت سے ضروریات اسلام کا صریح انکار کرتی ہے اس لئے اس کی وہی شان ہے جو مرتدین مانعین زکوٰۃ کی تھی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ قادیانی کو نبی کہتے ہیں۔ تو اب اس کی وہ شان ہے جو مسیلمہ کذاب کے متبعین کی تھی۔ کیونکہ مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے منکر نہ تھے اور بعض لوگ قادیانی کو نبی نہ کہیں مگر ولی اور مجدد کہتے ہیں حالانکہ وہ صریح کافر ہے۔ بیشمار کفریات اس کے اقوال میں موجود ہیں اور کافر کو ولی یا مجدد کہنا بھی کفر ہے اس لئے جماعت قادیانی کے سب فرقے مرتد ہیں ۱۲ ظ۔

بخوبی پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ کے اختلاف کرنے پر بھی وہ تنہا اس جماعت کے مقابلہ پر آمادہ ہے غرض صحابہ میں جو سب سے افضل تھے وہ سب سے زیادہ مستقل اور قوی القلب تھے اور یہ بات تو تمام صحابہ میں تھی کہ وہ غلبہ حالات وکیفیات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے تھے اسی لئے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے نہ کپڑے پھاڑتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ یہ کپڑے پھاڑنے والے گو معذور ہوں مگر صاحب کمال نہیں کامل کو ضبط کیفیت پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبد الحق رودلوی قدس اللہ سرہٗ کا ارشاد ہے۔ "منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ ایں جا مرد انند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند" یعنی منصور طریق سلوک میں بچے تھے کہ ایک قطرہ پی کر فریاد کرنے لگے اور جوش میں آکر انا الحق کہہ بیٹھے اور یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا شطح کی صورت سے نہیں بہتا البتہ ان کا دریا دوسری راہ سے نکلتا ہے یعنی افادات ونفع رسانی کی راہ سے کہ وہ اپنے جوش وخروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزارہا مخلوق درجۂ ولایت پر پہنچ جاتی ہے یا اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا تو ان کا دریا آنسوؤں کی راہ سے بھی کسی وقت بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں | یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمۂ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا دریا ہوگیا)

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں بہت ضبط کرتے ہیں ہاں کبھی ضبط پورا نہ ہوسکا تو آنکھوں سے آنسو بہا لیتے ہیں اور یہ نقص نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ نماز میں بعض دفعہ آپ روتے تھے تو سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہنڈیا پکتی ہو۔ الغرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو لوگ چلاتے چیختے اور کپڑے پھاڑتے ہیں وہ اہل کمال نہیں ہیں اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لَا تَشُقُّوْا جُيُوْبَكُمْ بَلْ تَشُقُّوْا قُلُوْبَكُمْ (اپنے دامنوں کو نہ پھاڑو اپنے دلوں کو چیرو)

ہاں صاحب حال ہیں اسی واسطے شیخ سعدی ان پر ملامت وطعن سے منع فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست | کہ غرق است ازاں می زند پا و دست

(درویش حیران ومست یعنی صاحب حال پر طعن مت کرو۔ اس لئے کہ وہ محبت میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پیر مارتا ہے)

کیونکہ صاحب حال معذور ہوتا ہے۔ مگر آجکل لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ بات بات پر وجد آئے رقت طاری ہو کپڑے پھاڑنے لگیں تو خوب سمجھ لو کہ یہ کمالات نہیں ہاں حالات ہیں اور حالات بھی ایسے جو مطلوب ہیں نہ مذموم کیونکہ حالات مطلوبہ تو وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہت ہوگی اتنا ہی زیادہ کمال ہوگا۔ باقی کیفیات نہ ضروری ہیں نہ کمال ہیں (گو مضر بھی نہیں بلکہ ان کا وجود علامت ہے تاثیر ذکر کی) اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا نہیں اصل مقصود نہیں۔ کیونکہ حدیث میں آچکا ہے فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا (اگر رونا نہ آتا ہو تو رونے کی کوشش کرو) اگر بکا ہی مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام نہ ہوتا بہر حال ہم لوگوں کی حالت قابل اصلاح ضرور ہے اور جو لوگ گناہوں میں کم بھی مبتلا ہیں ان کو بھی اس حالت پر تاسف ہونا چاہیئے اور جس کو تاسف نہ ہو اس کو اس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیئے۔ خاصکر جب یاد دہانی کیجائے کیونکہ بعض دفعہ خود اپنی کسی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہو جاتا ہے مگر خیر غنیمت ہے کہ جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف بھی نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے مقر تو ضرور ہیں کیونکہ گنہگار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے تو مرض کا احساس تو سب کو ہے مگر کوتاہی یہ ہے کہ علاج کی فکر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے تو علاج ڈھونڈنا ضروری ہوا۔ سو اس آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس مرض عام کا علاج موجود ہے۔ اسی لئے اس کو بیان کیلئے اختیار کیا گیا ہے میں اول ترجمہ کرتا ہوں اس کے بعد مقصود کی توضیح کروں گا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ جس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہو جانا اس میں جس قدر عنایت و لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہو سکتے ہو تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا اس لئے لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ (تم ان لوگوں کے مشابہ نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) فرمایا۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہو سکتا ہے کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے۔ اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا اس لئے مسلمانوں کو لَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللهَ (ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا۔ بلکہ ان کو تو لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ (تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے ہیں) ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔ اس پر مجھے حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آئی مولانا فرماتے تھے کہ جو مسلمان ہو گیا وہ کافر کبھی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ وغیرہ ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے ان کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے دل میں ایمان نہ ہو کیونکہ زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازم نہیں تو ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عند اللہ مسلمان نہ ہو بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ عند الناس بھی مسلمان نہیں تھے اور ہم لوگوں کا ان کو مسلمان سمجھنا محض حسن ظن پر مبنی تھا کہ نیک گمان کی وجہ سے ہم نے ان کی حالت میں غور نہیں کیا۔ اور اگر دعویٰ اسلام کی حالت ہی میں اُن کے اقوال و افعال کو غور سے دیکھا جاتا تو ہم کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا چنانچہ میں آپ کو ایک عجیب عبرت انگیز حکایت سناتا ہوں جو میں نے مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی تھی مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ دہان (تاجر روغن) نے جو مکہ مکرمہ کے ایک بڑے عالم تھے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں ایک عالم کا انتقال ہوا اور ان کو دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی دوسرے شخص کا انتقال ہوا تو اس کے وارثوں نے ان عالم صاحب کی قبر میں ان کو دفن کرنا چاہا مکہ مکرمہ میں یہ دستور ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی مردوں کو دفن کر دیتے ہیں چنانچہ ان عالم صاحب کی قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ ان کی لاش کے بجائے ایک نہایت حسین لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے اور صورت دیکھنے سے وہ لڑکی یورپین معلوم ہوتی تھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اتفاق سے اس مجمع میں یورپ سے آنے والا ایک شخص بھی موجود تھا اس نے جو لڑکی کی صورت دیکھی تو کہا میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی اور ایک

عیسائی کی بیٹی ہے یہ مجھ سے اردو پڑھتی تھی۔ اور در پردہ مسلمان ہو گئی تھی میں نے اس کو دینیات کے چند رسالے بھی پڑھائے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہو کر انتقال کر گئی اور میں دل برداشتہ ہو کر نوکری چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہو گئی کہ مسلمان اور نیک تھی لیکن اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ ان عالم صاحب کی لاش کہاں گئی بعض لوگوں نے کہا کہ شاید عالم کی لاش اس اس لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی اس پر لوگوں نے اس سیاح سے کہا کہ تم حج سے واپس ہو کر یورپ جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر ذرا دیکھنا کہ اس میں مسلمان عالم کی لاش ہے یا نہیں اور کوئی صورت شناس بھی ساتھ کر دیا چنانچہ وہ شخص یورپ واپس گیا اور لڑکی کے والدین سے اس کا یہ حال بیان کیا اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی کو دفن تو کیا جائے فرانس میں اور تم اس کی مکہ مکرمہ میں دیکھ لو اخیر رائے یہ قرار پائی کہ اس لڑکی کی قبر کو کھود و۔ چنانچہ اس کے والدین اور چند لوگ اس حیرت انگیز معاملہ کی تفتیش کے لئے قبرستان چلے اور لڑکی کی قبر کھودی گئی تو واقعی اس کے تابوت میں اس کی لاش نہ تھی بلکہ اس کے بجائے وہ مسلمان عالم مقطع صورت وہاں دھرے ہوئے تھے جن کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ شیخ دہان نے فرمایا کہ اس سیاح نے کسی ذریعہ سے ہم کو اطلاع دی کہ اس عالم کی لاش یہاں فرانس میں موجود ہے۔ اب مکہ والوں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا مکہ پہنچ جانا تو اس کے مقبول ہونے کی علامت ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی مگر اس عالم کا مکہ سے کفرستان میں پہنچ جانا کس بنا پر ہوا اس کے مردود ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سب نے کہا کہ انسان کی اصلی حالت گھر والوں کو معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس کی بی بی سے پوچھنا چاہیئے چنانچہ لوگ اس کے گھر گئے اور دریافت کیا کہ تیرے شوہر میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی اس نے کہا کچھ بھی نہیں وہ تو بڑا نمازی اور قرآن کا پڑھنے والا تہجد گزار تھا۔ لوگوں نے کہا سوچ کر بتلاؤ کیونکہ اس کی لاش دفن کے بعد مکہ سے کفرستان میں پہونچ گئی ہے کوئی بات اسلام کے خلاف اس میں ضرور تھی اس پر بی بی نے کہا ہاں میں اس کی ایک بات پر ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ کہ جب وہ مجھ سے مشغول ہوتا اور فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتا تو یوں کہا کرتا تھا کہ نصاریٰ کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کی لاش کو مکہ سے اسی قوم کی جگہ پھینک دیا جن کے طریقہ کو وہ پسند کرتا تھا۔ حضرات آپ نے دیکھا کہ یہ شخص ظاہر میں عالم متقی اور پورا مسلمان تھا مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں

ایک بات کفر کی موجود تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقے کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا تھا اور استحسان کفر کفر ہے۔ اس لئے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لاش منتقل ہو جایا کرے۔ مگر خدا تعالیٰ کہیں ایسا بھی کر کے دکھلا دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ بدحالی کا نتیجہ یہ ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہوتا ہے اس میں اول ہی سے کوئی بات کفر کی ہوتی ہے جو تفتیش اور غور کے بعد ہم کو بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر ہم غور نہیں کرتے اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان آریہ ہو گیا حالانکہ وہ پہلے ہی سے آریہ تھا اس میں اسلام تھا ہی نہیں مگر ہم کو اس کی بدحالی کا علم نہ تھا ورنہ جو مسلمان ہو گا وہ کبھی کافر نہیں ہو سکتا اسی لئے شیطان کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کہ وہ پہلے ہی کافروں میں سے تھا سجدۂ آدم علیہ السلام سے انکار کرنے کے وقت ہی کافر نہیں ہوا جس کا راز اہلِ تحقیق نے اس طرح فرمایا ہے کہ ؎

در لوح بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے ۔۔۔ بردم گماں بہرکس و برخود گماں نبود

آدم ز خاک بود و من از نور پاک او ۔۔۔ گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ بود

یعنی لوح محفوظ میں پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک شخص کافر ہو گا یعنی اس وقت اس کا کفر ظاہر ہو گا ۱۲) اور شیطان لوح محفوظ کو پڑھ کر اس واقعہ سے باخبر تھا کہ ایک شخص کافر ہونے والا ہے۔ مگر اس کو کبھی اپنے متعلق یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وہ میں ہی ہوں وہ اپنی طاعت و عبادت کی وجہ سے بیفکر تھا کہ بھلا اتنا بڑا عابد کبھی کافر ہو سکتا ہوں ہرگز نہیں یہ کوئی اور شخص ہو گا اس تکبر اور بیفکری ہی نے اسکو تباہ کیا (ورنہ ملائکہ کی یہ حالت تھی کہ اس خبر کو دیکھ کر سب کے سب تھرا گئے تھے کہ دیکھیے کس کی کمبختی آنیوالی ہے اس تواضع اور خشیت ہی سے وہ مقبول و مکرم رہے ۱۲) حاصل راز کا یہ ہوا کہ اس کا عجب و پندار اساس تھی کفر کی اور وہ اس میں پہلے ہی سے تھا جس کے لئے مردودیت لازم ہے۔ غرض شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا اس لئے مردود ہو گیا ورنہ جو مقبول ہو جاتا ہے وہ کبھی مردود نہیں ہوتا جیسے بالغ کبھی نابالغ نہیں ہوتا مگر یہ بھی خبر ہے کہ بالغ کون ہے۔ ہر زبان سے دعویٰ اسلام کرنیوالا بالغ نہیں بلکہ بالغ وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا ۔۔۔ نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(بجز مست عشق الٰہی کے تمام مخلوق (گویا) اطفال ہیں پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا) یعنی جس نے اسلام کے بعد حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہوا و ہوس کو فنا کر دیا ہو وہ بالغ ہے باقی سب نابالغ

ہیں پس جو شخص اسلام سے مرتد ہوکر اپنا نابالغ ہونا ظاہر کرتا ہے وہ ابھی تک بالغ ہوا ہی نہ تھا بلکہ اس وقت تک نابالغ تھا۔ حدیث میں بھی تو ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ان کے اسلام لانے سے پہلے دریافت کیا تھا کہ کیا اس دین کو اختیار کرکے کوئی شخص کراہت کے ساتھ اس کو چھوڑتا بھی ہے حضرت ابوسفیان نے کہا نہیں ہرقل نے اس پر کہا وَکَذٰلِکَ الْاِیْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَتَہُ الْقُلُوْبُ یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے کہ جب وہ قلوب میں پیوستہ ہوجاتا ہے پھر نہیں نکلتا کیونکہ ایمان ایک عشق ہے اور عشق اگر سچا ہو تو کبھی دل سے نہیں نکلتا حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی نہیں نکلتا جیسے کہ اگر کسی کو غیر اللہ سے محبت ہوجائے تو وہ بھی مرکر نہیں جاتی۔ اسی کو کہا ہے ؎

رفتم اندر تہ خاک و انس بتانم باقی ست (میں تہ خاک ہوگیا اپنے معشوقوں کی محبت باقی ہے)

اسی لئے اہل اللہ اپنے دل میں کسی ناجائز محبت کو بھی جمنے نہیں دیتے کیونکہ مرنے کے وقت اس محبوب کا خیال آوے گا اور ان کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب دنیا سے جاویں تو اس وقت کسی کی محبت بجز خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہ ہو اہل اللہ نے تو جنت کی بھی رغبت نہیں کی۔ حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کردی گئیں انھوں نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا ؎

اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ مَاقَدْ رَاَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

اگر آپ کے نزدیک میری محبت کی یہی قدر ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے ساری عمر یوں ہی برباد گئی فحجبت الجنان وتجلی لہ الرب تعالیٰ وطار روحہ فرحا بہ پس اسی وقت جنتیں چھپادی گئیں اور حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جان نکل گئی اور بالکل وہ حالت ہوگئی ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

(اگر منکر نکیر آکر مجھ سے سوال کریں کہو تمہارا رب کون ہے تو میں جواب دونگا وہی ہے جو ہمارے دل دیوانہ کو لے گیا)

اور جان نکلنے کے قریب یہ حالت تھی ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رُخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آجائے تو جب تک رُخ انور نہ دیکھ لوں جان نکلنے نہ دوں گا)

واقعی عمر بن الفارضؒ نے تو یہ کرکے دکھلا دیا کہ بدون تجلی الٰہی کے جان ہی نہ دی جیلان حضرات

کو جنت پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو دوسروں کی طرف تو کیا التفات ہوگا مگر یہ تو صاحب حال تھے ان کو جنت سے منہ پھیرنے کا حق تھا۔ ہم کو بدون اس حال کے ایسا دعویٰ نہ چاہیئے ہم کو تو اگر وہاں دنیا کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے بعض لوگ اکثر ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہ ہے۔ ہم کو حوروں کی کیا پرواہ ہے۔ یہ نہایت سخت بات ہے ہر شخص کا منہ اس بات کے قابل نہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز　　　عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ بدصورت کو ناز کرنا برا ہے آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو عیب میں شمار ہوتی ہے)

اور ؎ پیش یوسف نازش و خوبی مکن　　　جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یوسفؑ کے سامنے ناز اور اپنی مت بیان کرو سوائے نیاز اور آہ یعقوبی مت بیان کرو)

چوں تو یوسف نیستی یعقوبؑ باش　　　ہمچو او باگریہ و آشوب باش

(جب تم یوسفؑ نہیں ہو یعقوبؑ جیسے بنو ان کی طرح سے گریہ وزاری کرو)

غرض ہم لوگ اہل نیاز ہیں ہم کو ناز نہ چاہیئے بلکہ احتیاج ظاہر کرنا چاہیئے جو لوگ جنت سے لاپروائی کی ڈینگیں مارتے ہیں ان کو چار دن روٹی نہ ملے تو حقیقت کھل جائے اسی وقت لوگوں سے قرض ادھار یا خیرات مانگنے لگیں تو جس کو چار روٹیوں سے بھی استغنا نہ ہو اس کو جنت سے لاپروائی کا دعویٰ کب زیبا ہے۔ خیر وہ تو صاحب حال تھے۔ مگر یہی بات کہ محبت مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی دل سے نہیں نکلتی اس لئے اہل اللہ جائز محبت سے بھی بچتے ہیں ہم اگر ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو بچنا چاہیئے اس واقعہ سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ حق تعالیٰ کے چاہنے والوں کی یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ وہ مرتے وقت بجز جمال محبوب کے اور کسی خیال میں نہیں ہوتے واقعی جینا اور مرنا ان ہی کا ہے اور اگر ہم بھی ان کے ساتھ وابستہ ہو جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم کو بھی حاصل ہو جائیگی اور ہم بھی مرتے وقت ایسے ہی ہوں گے لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو ایسا تو ہونا چاہیئے کہ اس وقت کوئی ناجائز محبت دل میں نہ ہو۔ اور اسکا طریقہ یہی ہے کہ زندگی میں محبت حرام سے بچو اگر زندگی میں اس میں مبتلا ہو گیا تو مرتے وقت بھی وہ ستا رہے گی غرض عشق خواہ حلال ہو یا حرام دل سے کبھی نہیں نکل سکتا اسی لئے ہرقل نے کہا تھا کہ ایمان دل میں رچ جانے کے بعد نہیں نکلا کرتا کیونکہ ایمان نام ہے عشق خداوندی کا

چنانچہ نص وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اور مومن اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں) اس کی کافی دلیل ہے پس حاصل یہ ہے آیت میں تشبیہ کے اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا یعنی چونکہ مخاطب مسلمان ہیں اس لئے وہ خطاب وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ (تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں) کے محل نہیں ہو سکتے یعنی وہ کبھی خدا کو دل سے بالکل بھلا نہیں سکتے اس واسطے حق تعالیٰ نے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ (تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اللہ کو بھول گئے ہیں) فرمایا اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید ہی لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت و شفقت کی بنا پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والوں کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا"

آگے ارشاد ہے فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہو جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر فنا کے معنے یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے۔ تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنے کیا ہیں یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت کے ساتھ یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لپاڑ ہی لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لپاڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جا سکتا غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں دشمنی اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے۔ اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت

ے اور درحقیقت خدا کی یاد میں اپنے کو بھولنے والا واقع میں بھولنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے کو یاد رکھنے والا ہے گو درجہ التفات میں بھولا ہوا ہے۔ چنانچہ یاد کے معنے معلوم کر کے ابھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ۱۲ ظ

کر دیا اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کے روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو یاد کرتا ہوں غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولیگا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جاویگا اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھیگا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کریگا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کو بھی اور اپنی متعلقات کو بھی اسی حیثیت سے یاد کرتا ہے کہ یہ سب محبوب ہی کی چیزیں ہیں یہ ایسی بات ہے جیسے ہل پالتا تھا اور بیل کی حفاظت ایک تو مالک کرتا ہے وہ تو اپنی چیز سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے اور ایک نوکر حفاظت کرتا ہے وہ اپنی چیز سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی چیز سمجھکر ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کیلئے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لئے کھاتے ہیں اور یہاں سے لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو) کا راز بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان انہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیزیں ہیں اسلئے انھوں نے اپنی چیز میں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرمادیا اسی مرتبہ میں حکم ہے اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بلاشک جسم کا تجھ پر حق اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے) پس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا بارد کھا کر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہو جائے۔ عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہو گیا ہے اس لئے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہئے)

ایک دفعہ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا کہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا۔ اور گرم پانی پینے میں زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل شریک نہ ہوگا آپ نے دیکھا کہ لذائذ کے استعمال میں عارفین کی کیا نیت ہوتی ہے۔ عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس غرض سے

پیتے ہیں کہ مزا آئیگا پیاس کو تسکین ہوگی اور عارف اس لئے پیتا ہے کہ ہر بُن مُنہ سے حق تعالیٰ کی حمد نکلے گی
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ۔ (دیکھو تو راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے) اور اسی راز کے منکشف ہونے پر ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　　تو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیری گلی تک پہونچے ہیں ہردم اپنے ہاتھوں پر ہزاروں بوسہ دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اپنی آنکھوں پر ناز کرتے ہیں کیونکہ اس نے سرکاری کام کیا ہے اسنے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اسی سے محبوب کے کلام کو دیکھکر تلاوت کی توفیق ہوئی ہے اپنے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیتے ہیں مگر اسی سرکاری تعلق کی وجہ سے ان کا نازبڑھی خدا کے رستہ میں چلنا نصیب اور بہت سے کام رضائے محبوب کے واسطے ان سے لئے گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان اعضاء پر جان دیتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ میں مکہ معظمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا لوگ ان کے منہ پر ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف مزے لے رہے ہیں ان کو اس خطرہ کی اطلاع ہوگئی فوراً جواب دیا کہ یہ میری تعریف تھوڑی ہی ہے میرے محبوب کی تعریف ہے کیونکہ ہمارا کمال سب ادھر سے ہی ہے مصنوع کی تعریف حقیقت میں صانع کی تعریف ہے کہ اس نے کس خوبی سے اس چیز کو بنایا ہے اسلئے میں اپنے محبوب کی تعریف پر خوش ہو رہا ہوں وہ کہنے لگے کہ مجھے پھر خطرہ ہوا کہ جب یہی بات ہے تو میرا یہ خطرہ بھی محبوب ہی کی طرف سے تھا اس پر اتنی ناگواری کیوں ہوئی ان کو اس پر بھی اطلاع ہوگئی فرمایا محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے اب تو میں بہت گھبرایا کہ یہاں تو دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہئے یہ تو ہر خطرے پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ واقعی اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر برے خیالات سے دل کی حفاظت کرنا چاہیئے کیونکہ ان کو گاہے خطرات پر بھی اطلاع ہو جاتی ہے جس سے ان کو ایذا ہوتی ہے ؎

پیش اہل دل نگہدارید دل　　　تا نباشید از گمانِ بد خجل

(اہل دل کے روبرو دل کی نگہداشت کرو تاکہ بدگمانی سے شرمندہ نہ ہو)

اس پر یہ شبہ ہوگا کہ بعضے خطرات تو بے اختیار آتے ہیں ان سے کیونکر حفاظت کی جائے بس اس کا تو یہ

مطلب ہوا کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھنا ہی نہ چاہیئے تو سمجھ لیجئے کہ جن کو خطرات کی اطلاع ہوتی ہے ان کو اللہ تعالیٰ یہ بھی معلوم کرادیتا ہے کہ یہ اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے اور وہ ایسے نہیں ہوتے کہ غیر اختیاری امور پر مواخذہ کریں اور نہ غیر اختیاری خطرات سے اُن کو ایذا ہوتی ہے پس نگہداشت دل کے معنی ہیں کہ اختیاری خطرات سے ان کے پاس بیٹھ کر دل کی حفاظت کرو۔ غرض واقع میں ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں تو جو خدا کو یاد کریگا وہ اپنے کو اس طرح یاد کریگا کہ اس کی نظر اول خدا پر پڑے گی پھر اپنے پر (اور یہ التفات الی الغیر نہیں ہے) اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین شخص کے گھر میں آئینہ رکھا ہو جس میں اس کی صورت نظر آرہی ہو اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہے جو محبوب کی طرف رعبِ جمال کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اس لئے وہ آئینے میں اس کی صورت دیکھ رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اس آئینہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے کہ دیکھوں یہ آئینہ حلبی ہے یا چینی ہے تو یہ دونوں شخص آئینے کے دیکھنے سے شریک ہیں مگر دونوں کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　　　درمیان شان برزخ لایبغیان

(بحر تلخ اور بحر شیریں برابر دونوں جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

ظاہر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں الگ الگ ہیں عاشق کی نظر اول محبوب کی تصویر پر پڑے گی۔ گو تبعاً آئینہ پر بھی نظر ہے اور غیر عاشق کی نظر اول آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی تصویر بھی نظر پڑ جائے مگر اس کا مقصود حسین کی تصویر دیکھنا نہیں ہے بلکہ صرف آئینہ کی خوبی دیکھنا مد نظر ہے اسی طرح عارف بھی مخلوقات کو دیکھتا ہے اور ہم بھی دیکھتے ہیں مگر بڑا فرق ہے۔ اسکی نظر اول خدا تعالیٰ پر پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اس کے سامنے ہے اور ہماری نظر اول مخلوق پر پڑتی ہے۔ گو تبعاً حق تعالیٰ کی قدرت وصنعت کا بھی خیال آجائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان کو پوچھا گیا ھَلْ عَرَفْتَ رَبَّكَ بِمُحَمَّدٍ اَمْ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا بِرَبِّكَ کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا عَرَفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّیْ کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا اگر آج کوئی شخص یہ بات کہدے تو بس کفر ہو گیا بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے

نستو رہے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناش دنیا سے اٹھ گئے چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا توبہ توبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے تھوڑا ہی رُکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو۔ غور کرکے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کیلئے ثابت کر نہیں سکتے لا محالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا اور ہم آپ کے لئے صفات الٰہی کو ثابت نہیں کرتے بلکہ ان کی نفی کرکے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کامل و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کامل کہتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے۔ اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کو نہیں پہچانا۔ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑ سکتی ۱۲) تو لازم آگیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا اسی کا بیان ہے فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ (پس وہ اپنے نفسوں کو بھول گیا) آگے فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ یہ ہے جزو مقصود جس سے مجھ کو بدحالی مذکور سابقًا کا علاج مستنبط کرنا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولٰئک اسم اشارہ ہے جس کے لئے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشارالیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بنا ان ہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھیں (اُولٰٓئِكَ عَلٰى ھُدًى مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت و فلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب و اقامۃ الصلوٰۃ و تصدیق کتب منزلہ و انفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے۔ اور ان صفات کو

حکم فلاح میں داخل ہے ۱۲) اس قاعدے کی بنا پر یہاں بھی اُولٰئِکَ میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا جو پہلے اَلَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ (جو لوگ اللہ کو بھول گئے ہیں) میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بنا اسی صفت پر ہوگی خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہوا فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے کا اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمدللہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بدحالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں اور طبی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہوتا ہے) (جو کہ عقل و شرع سے بھی مؤید ہے) چنانچہ سب جانتے ہیں کہ مرض حرارت سے ہو تو علاج برودت سے کیا جاتا ہے۔ برودت سے ہو تو حرارت سے علاج کیا جاتا ہے تو اسی طرح یہاں بھی علاج بالضد ہونا چاہئے اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہوا یا یوں کہئے کہ ہر مرض کا علاج رفع سبب ہوتا ہے (خواہ ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ سے مگر ازالہ مرض کے لئے رفع سبب سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیان کا سبب نسیان ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے ۱۲) تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔ اب میں بیان کو مختصر کرتا ہوں اور ایک بہت بڑے مضمون کو تھوڑے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ گو جی نہ بھرے مگر ان شاء اللہ تعالٰی بقدر کفایت تسلی ہو جائے گی۔ ایک دوست کا خط آیا تھا کہ تمہارے جوابات سے جی نہیں بھرتا کیونکہ میں لمبے لمبے مضامین کا جواب دو چار سطروں میں دیدیتا ہوں تو میں نے لکھا کہ گو جی نہیں بھرتا مگر تسلی تو ہو جاتی ہے اور چند جملوں میں آپ کی سب باتوں کا کافی جواب تو ہو جاتا ہے۔ اس کا انھوں نے اقرار کیا میں نے کہا بس یہی کافی ہے جی بھرنے کی ضرورت نہیں (جس کو جی بھرنا ہو وہ پاس آکر رہے اگر مرخطوط میں مخاطب کے جی بھرنے کی کوشش کروں تو بس دن بھر میں دو چار خطوں کا جواب ہوا کرے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جائے آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی لیکن الحمدللہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں کسی جزو سوال کا جواب رہ نہیں جاتا ۱۲) اسی طرح اس وقت گو مضمون بڑا ہے اور مختصر بیان سے شاید جی نہ بھرے لیکن ان شاء اللہ تعالٰی تسلی ہو جائے گی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ

گناہ سے بچنے کا طریقہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اب یہ بات رہی کہ یاد کیسے کرے تو سنئے یاد کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک یاد ہوتی ہے محبت سے اور ایک ہوتی ہے خوف سے اور ایک ہوتی ہے حیا سے اور ان میں بھی پھر چند قسمیں ہیں کہ محبت ذات سے ہے یا ثواب سے اور خوف ذات کا ہے یا عقاب کا (اور حیا ذات سے ہے یا محسن کے احسان سے ۱۲) اس میں لوگوں کے طبائع اور مذاق مختلف ہیں بعضے تو وہ ہیں جن پر محبت ذات غالب ہے اور صرف ذاتِ حق کا عشق ان کے لئے ذکر پر باعث ہے وہ نہ جنت کے لئے ذکر کرتے ہیں نہ دوزخ سے بچنے کے لئے بلکہ محض رضائے محبوب کے لئے ذکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی مثل فقیروں کے مزدوری کی شرط سے مت کرو آقا خود بندہ پروری کی روش سے واقف ہے)

یہ تو خواص عارفین کی حالت ہے اور بعضے وہ ہیں جن کو ذکر کا ولولہ اسی سے اٹھتا ہے کہ ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی ان کے ذکر کا منشا محبت ثواب ہے سو اس کا بھی کچھ مضائقہ نہیں گو بعض عارفین نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ خواہش پرست ہیں مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں کہ عمل سے پہلے اجرت ٹھہرا لیتے ہیں گویا خدا سے کہتے ہیں کہ ہم اس شرط پر ذکر کرتے ہیں کہ اس صلے میں ہم کو جنت دی جائے مگر یہ معترض محقق نہیں ہے میاں مقصود تو ذکر ہے وہ ہونا چاہیئے کسی طرح ہو اگر اس شخص کو طلب ثواب کی نیت سے روکا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذکر ہی سے رہ جائے گا اور اگر یہ اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اس کو ذاتِ حق سے عشق ہو جائے گا۔ پھر اس کو بھی رضائے محبوب کے سوا کچھ مطلوب نہ رہے گا۔ پس یہ حالت بھی اچھی ہے بری نہیں دیکھو گلستاں کے پڑھنے والے دو طرح کے لڑکے ہیں ایک تو وہ ہے جس کو خود گلستان میں لطف آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محض باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ گلستاں پڑھتے رہو گے تو ہم تم کو روزانہ ایک آنہ دیا کریں گے ہر چند کہ اس کی حالت پہلے سے کم درجہ کی ہے مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میاں اگر گلستاں پڑھو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنہ کے لالچ سے پڑھنا فضول ہے اس میں کیا فائدہ۔ ہرگز نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے کچھ نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہیگا کہ جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک دن تم کو خود مزا آنے لگے گا پھر اس وقت یہ حالت ہو جاوے گی کہ اگر باپ کچھ بھی نہ دے بلکہ یہ کہے کہ گلستاں پڑھنا چھوڑ دے تو تم ہرگز اس کی بات نہ مانو گے پھر یہ قاعدہ ذکر میں کیوں نہیں جاری کیا جاتا

اور جو لوگ ثواب کیلئے عمل کرتے ہیں ان پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جب خدا تعالیٰ نے خود جنت کی رغبت دلائی ہے (اور اس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اس میں چاہیئے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں) تو اس کی رغبت سے ذکر کرنے میں کیا حرج ہے اور جو معترض گھٹیا حالت بتلاتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے کہ انھوں نے گھٹیا حالت کی رغبت دلائی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے جتنے طریقے بتلائے ہیں سب بڑھیا ہیں ان میں گھٹیا کوئی نہیں (یہ اور بات ہے کہ ایک رفیع ہو دوسرا ارفع پس ہر چند کہ محض رضائے محبوب کے لئے ذکر کرنا مقام ارفع ہے مگر طلب جنت کے لئے ذکر کرنا بھی رفیع حالت ہے گھٹیا اور ادنیٰ حالت نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ (ترجمہ) اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہو جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو قول ہو یا عمل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کیلئے عمل کیا جائے رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملیگا، حوریں ملیں گی خوب مزے اڑیں گے غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اسکے مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود یہ چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے اس وقت استغنار مناسب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر سلطان دیں مجھ سے طمع کی فرمائش کرے تو اس کے بعد قناعت کے سر پہ خاک ڈال دوں گا)

اس لئے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغنا نہیں برتا عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کر سکتا چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اجل النعم ہے ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنار ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبۂ حال سے معذور ہوں گے ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اسے پسند ہو وہ بھی مانگے

اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے کسی دوسری چیز کی طلب نہیں دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا اسی کو کہتے ہیں ؎

"عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست (عاشقین جنت کو محبوب کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں)

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبہ خضراء ہی ہمیں نظر آجائے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

(اگر محبوب ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اور اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا اس لیے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں کاش اس کے شہر ہی میں جا رہوں اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لیے جنت کی تمنا کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہونگا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ غَیْرَ مُوَدَّعٍ وَّلَا مَکْفُوْرٍ وَّلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا اس لئے کھانے کو ہٹا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغناء ہے۔ حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کے حسن سے ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے)

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو اس میں غضب کی دلربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف بلکہ ایک بے ساختہ حال ہے ؎

دلفریبان بناتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(بناتی دلفریب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے)

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا غرض ایک معنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپ کے سوال جنت کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہئے بلکہ اس کا جو منشار آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق کر دیا گیا ۱۲) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راستے پر نہیں خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہئے خواہ بلاواسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے سے ہو سب ٹھیک ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب

(نصیبہ اگر مدد کرے تو محبوب کا دامن پکڑ لوں اگر وہ کھینچے بہت شرف ہے اور اگر میں کھینچوں بڑی خوشی)

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیے خواہ میں انھیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جائے اب وہ براہ راست خدا کی محبت سے ہوا تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیا ہیں گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع ۱۲) یہ تو محبت کی قسمیں تھیں عظمت و جلالت شان کے اور کسی کو عذاب کا خوف ہے یہ دونوں راستے بھی ٹھیک ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے عذاب و عقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے اور اس کی تشدد جابجا اسی لئے بیان فرمائی ہے کہ بعض طبائع پر جلالت و عظمت حق کا انکشاف نہیں ہوتا ان کیلئے خوف عذاب ہی گناہوں سے زاجر ہوتا ہے پس جو لوگ خوف عذاب سے عمل کرتے ہیں ان پر بھی اعتراض نہ چاہیے ان کی حالت بھی گھٹیا نہیں (بلکہ رفیع حالت ہے گو اس سے ارفع یہ حالت ہے کہ عظمت و جلالت شان خالق منکشف ہو کر گناہوں سے زاجر ہو ۱۲) یاد کی دو قسمیں تو یہ ہوئیں ایک یاد محبت۔ ایک یاد خوف۔ ایک تیسری قسم اور ہے یاد حیا بعض وہ طبائع ہیں جو ذکر اللہ اور اعمال صالحہ

محض حیا کی وجہ سے کرتے ہیں ان کو اپنے خالق محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم و حیا آتی ہے خوف یا محبت ان کے لئے ذکر و طاعت کا قوی باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ محض حیا کی وجہ سے سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات خوف و محبت سے خالی ہوتے ہیں یہ نہیں بلکہ ان کا غلبہ نہیں ہوتا غلبہ حیا کو ہوتا ہے باقی خوف و محبت و حیا کسی سے بھی کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہر مسلمان میں ان کا موجود ہے ہاں غلبہ کسی پر خوف کا ہے کسی پر محبت کا کسی پر حیا کا اور جس صفت کا جس میں غلبہ ہے وہی اس کے لئے اعمال کی طرف داعی ہوتی ہے کسی میں حیا غالب ہے تو یہی حیا اس کے لئے ذکر اللہ کا باعث ہوتی ہے یہ راستہ بھی ٹھیک ہے (خدا تعالیٰ نے جس کے لئے جو راستہ مناسب سمجھا مقرر کر دیا بندگی کے معنے یہ ہیں کہ اسی پر راضی رہے اور اس کے خلاف کی تمنا نہ کرے امور غیر اختیاریہ موہوبہ غیر مکتسبہ میں خلاف کی تمنا مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) پس اے سالکین جب تم کو معلوم ہو گیا کہ ذکر کی اتنی صورتیں ہیں اور یہ سب وصول الی المقصود کے لئے کافی ہیں تو ذکر و شغل کر کے اس کے متمنی نہ ہوا کرو کہ کاش ہم کو خوف حاصل ہو جاتا اور جب عرصہ تک ذکر کے وہ حاصل نہ ہوا تو افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہم پر خوف غالب کیوں نہیں ہوتا۔ صاحب تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبت و حیا کا۔ یہ تو سرکاری تقسیم ہے جس کے مناسب جو راستہ معلوم ہوا اسی کے اسباب اس میں پیدا کر دیئے وہ کسی کو ہنسا کر پہونچاتے ہیں کسی کو رلا کر۔ اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں نہ رلاتے ہیں اس کو حیرت و پریشانی میں رکھ کر پہنچاتے ہیں خوب کہا ہے

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں است ۔۔۔ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان وئیم ۔۔۔ ور به بیداری بدستان وئیم

(یعنی اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ بھی ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے بیہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو ہیں)

اور حیرت کا بیان فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است | حق بگوش او معما گفتہ است

(یعنی جو شخص تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

کہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں | جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

غرض کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ دیا جس کو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اسی کو سب سے اچھا سمجھنا چاہیئے۔

اور اس پر راضی رہ کر یہ شان ہونی چاہیئے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین | نیستم در صفت طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صفت طاعت میں بین بین نہیں ہوں)

یعنی جس طرح قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہی لکھا جاتا ہے اگر عربی لکھنا چاہے تو قلم سے عربی ہی لکھی جاتی ہے اگر اردو لکھنی چاہے تو اردو ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا تعالیٰ کے تقسیم کے سامنے مطیع و منقاد ہو جاؤ۔ چنانچہ جنھوں نے اس کو سمجھ لیا ہے وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ اگر ان پر محبت کا غلبہ ہے تو غلبۂ خوف کے طالب نہیں ہوتے۔ اگر خوف کا غلبہ ہے تو غلبہ محبت کے طالب نہیں ہوتے وہ تو ہر حال میں یہ کہتے ہیں ؎

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش | کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

(تجھ کو صاف اور گدلے مطلب نہیں خاموش رہ کیونکہ جو کچھ ہمارے ساقی نے پیالہ میں ڈالدیا ہے عین اس کی مہربانی ہے)

یہ بات ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ ان کو بڑی حرصیں ہوتی ہیں ان میں حالات و کیفیات و مقامات کی تمنا کا مرض بہت ہے یاد رکھو یہ خلاف عبدیت ہے بعض ذاکرین ذکر کرکے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مزا نہیں آتا ہائے یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے محبوب کی طرف کب متوجہ ہوں گے حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا کہ آجکل کس کام میں ہو انہوں نے کہا کہ مقام توکل طے کر رہا ہوں منصور نے کہا افسوس تم ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہے گے محبوب کے ساتھ کب مشغول ہو گے کیونکہ وہی توکل تو اکثر کھانے پینے اور پہننے ہی کے فکر سے چھوٹ جانے کیلئے کیا جاتا ہے تو یہ بھی پیٹ ہی کا دھندا ہوا (۱۲) یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیئے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت | ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند | در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت — ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الہ الا اللہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الہ الا اللہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا یعنی الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئے اے عشق شرکت سوز تجھ پہ آفریں کہ سوائے محبوب حقیقی کے تو نے سب کو فنا کر دیا)

جب لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب منفی ہو گئے پس اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو نہ کسی خاص مقام کے بلکہ خدا کے طالب بنو اور اگر کچھ بھی نہ ملے تب بھی راضی رہو ؎

گر مرادت را مذاق شکر است
بے مرادی نے مراد دلبر است

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے مگر یہ تو سوچو کہ اگر دلبر کی مراد یہ ہے کہ تم نامراد رہو تو کیا اس کی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی۔ یقیناً ہوگی اس جگہ نامرادی کا مطلب اور کچھ نہ ملنے کے معنے یہ ہیں کہ تمہاری مخترعات اور متخیلات نہ ملیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہ ملے کچھ تو ضرور ملتا ہے اگر تمہارے مخترعات نہ ملیں گی تو وہ خود تم کو ملیں گے۔ اور جب وہ مل گئے پھر تو سب کچھ مل گیا ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہو گئی اس کو جان فرزند و اسباب کی پرواہ نہیں)

پس بندے کا کام یہ ہے کہ خدا کی یاد میں لگے اور ذکر و فکر ہی کو مقصود سمجھے اور کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے کیونکہ میں نے بتلا دیا ہے کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں اور ذکر ان سب کو عام ہے۔ اب میں گناہوں سے بچنے کی ایک بہت آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس پر ہر شخص کو عمل کرنا آسان ہو وہ یہ کہ گناہ تو خیر ہم سے بہت ہوتے ہی ہیں اور سب کا

دفعۃً چھوٹ جانا ہر شخص سے آسان بھی نہیں مگر تم یہ کیا کرو کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کر لو اور اس میں خدا کی یاد کیا کرو مگر یاد ایسی ہو کہ زبان و دل دونوں اس میں شریک ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی ؎

سبحہ بر کف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا ہمارے استغفار پر گناہ کو ہنسی آتی ہے)

اور ایسی زبانی یاد جلدی موثر نہیں ہوتی یادِ خدا وہی جلدی رنگ لاتی ہے جو دل و زبان دونوں سے ہو تو صاحب میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ دن بھر کوئی گناہ نہ کرو میں کہتا ہوں کہ اگر تم سے گناہ چھوٹ ہی نہیں سکتے تو خدا کے لئے اتنا تو کرو کہ ایک وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یادِ خدا کے واسطے مقرر کر لو لیکن جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو قصداً دل میں کچھ نہ لاؤ اور جو خود آجاوے اُسے آنے دو وہ تم کو کچھ مضر نہیں دیکھو اگر ایک سرکاری آدمی پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی باغی کو نہ آنے دے تو اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر لیلے تو مجرم ہوگا۔ لیکن اگر وہ خود اندر نہ لے بلکہ باغی اس کو مجبور کر کے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اندر چلا آوے تو سنتری مجرم نہ ہوگا۔ اسی طرح نماز یا ذکر میں خود وساوس کا لانا یا ادھر مشغول ہوجانا بُرا ہے۔ اور اگر خود نہ لاؤ اور نہ اُدھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں پس تم اپنے مایہ و متاع کو خود ذہن میں نہ لاؤ بلکہ اپنی طرف سے تو اس کی کوشش کرو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ۔ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے و ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے)

صاحبو ایک گھنٹہ تو ایسا نکال لو جس میں اس طرح خدا کی یاد کیا کرو۔ آگے ایک تجربے کی بات ہے کہ اس وقت جتنا مفرد اور بسیط ذکر ہوگا اتنا ہی یکسوئی زیادہ ہوگی اور وہی زیادہ مفید ہوگا۔ پس اس ایک گھنٹہ میں دل لگا کر لاالٰہ الا اللہ کا ذکر کرو یا اللہ اللہ کا اور اسی وقت اپنی طرف سے خدا کی طرف متوجہ رہنے کی پوری کوشش کرو پس تم اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کر دیا کرو اس کے بعد جیسا ہے جس طرح حال میں بھی تمہاری گرہ سے میں دکھلا دونگا

کہ چند روز کے بعد عین گناہ کے وقت شرم آوے گی اور گناہ کرتے ہوتے اندیسے کوئی چیز تم کو روکے گی اگر اس وقت تم نے اس شرم و حیا سے کام لیا اور فائدہ اٹھایا تو مدعا حاصل ہوا اور اگر نفس و شیطان سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیا تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہوگی جس سے گھبرا کر معاً توبہ کی طرف جھکو گے اور اگلے دن اس حرکت کے بعد خدا کا نام لیتے ہوئے بہت شرم آوے گی اور سخت صدمہ ہوگا اور کیا کہوں کہ کیا پیش آئے گا آپ ورد کو پورا کرنا چاہیں گے اور گناہ کا خیال آپ کی زبان پکڑے گا۔ پس وہ حال ہوگا ؎

أُحِبُّ مُنَاجَاةَ الْحَبِيْبِ بِأَوْجُهٍ وَلٰكِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِيْنَ كَلِيْلٌ

(محبوب کی پسندیدہ تر مناجات کے بہت سے طریقے ہیں لیکن گناہ گاروں کی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے)

حضرات میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بخدا ذکر کی پابندی کے ساتھ اول تو آپ سے گناہ ہی نہیں صادر ہو سکتے اور اگر ہوئے بھی تو اس حالت سے ہوں گے کہ بعد میں دلیر آپ نہ چلیں گے جس کا ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اثر ہوگا کہ ایک ایک کر کے سب گناہ چھوٹ جائیں گے اور جس وقت کوئی لغزش ہوگی فوراً دل پر نشتر سا لگے گا اور توبہ کی توفیق ہوگی بدون توبہ کے چین ہی نہ آئے گا۔ جائیے میں نے اتنا سہل نسخہ بتلایا جس سے زیادہ آسان کوئی نسخہ ہو ہی نہیں سکتا اگر کسی سے یہ تدبیر نہ ہو سکے تو انا للہ وانا الیہ راجعون" پس اس کے لئے یہ کہا جاوے گا ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ کا یہ ہوا کہ اس آیت میں أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ نَسُوا اللّٰهَ پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا سبب سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج ازالہ نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا جس کی سہل تدبیریں میں نے بتلا دی الحمد للہ اس آیت سے یہ عجیب مسئلہ نہایت آسانی سے مستنبط ہو گیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں خدا تعالیٰ اس کو مقبول فرما دیں اور آپ کو اس کا نفع عنایت فرمائیں آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ فقط

تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

اَلسُّرُوْر

بظہور النور و ملقب بہ

اِرْشَادُ الْعِبَادِ فِیْ عِیْدِ الْمِیْلَاد

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

السرور

بظهور النور

ملقب بہ

ارشاد العباد فی عید المیلاد

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا سر کھڑے ہو کر	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کس نے لکھا	سامعین کی تخمیناً تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ	۳ گھنٹے بعد نماز جمعہ سے قریب مغرب تک اور درمیان میں نماز عصر بھی ہو گئی	بیٹھ کر		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ پر فرح کا مامور ہونا اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مفصل کلام۔	عموماً خصوصاً عاملین اہل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو	مولوی محمد عبد اللہ گنگوہی	۱۵۰	اہل علم کا مجمع کم اور متوسلین و عوام کا زیادہ تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ صرف اللہ کے فضل و رحمت ہی کے ساتھ چاہیئے کہ خوش ہوں اس لئے وہ بہتر ہے اس شئے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں) قبل اس کے کہ اس آیت کے متعلق میں کچھ بیان کروں اول بطور تمہید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ چند سال سے میرا معمول ہے کہ ماہ ربیع الاول کے شروع میں ایک وعظ

اس ماہ میں افراط و تفریط کرنے والوں کی اصلاح کے متعلق کہا کرتا ہوں اور اس میں تبعاً و استطراداً اور فوائد علمیہ و برکات و حقائق کا بیان بھی آجاتا ہے امسال بھی ایسا ہی خیال تھا کہ ابتداء ربیع الاول میں ایسا وعظ ہو جائے لیکن وجہ التواء یہ ہوئی کہ ہمارے مدرسے کے متعلق ایک مکان طلبہ کے لئے بنا ہے خیال یہ ہوا کہ اس مکان میں اس کے افتتاح کے ساتھ وعظ ہوتا کہ اس مکان میں برکت ہو لیکن اس کے افتتاح میں بعض امور کا انتظار تھا اتفاق سے وہ جملہ امور دوشنبہ کے روز ختم ہوئے چنانچہ اس روز ارادہ بیان کا ہوا لیکن بعض احباب کی رائے ہوئی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں یہ بیان ہو تاکہ اور لوگ بھی منتفع ہوں اس وجہ سے اس بیان میں دیر ہوئی اور عجیب اتفاق ہے کہ آج ۱۲ ربیع الاول ہی ہے اسی تاریخ میں لوگ افراط تفریط کرتے ہیں۔ اس تاریخ کا بالتخصیص ارادہ نہیں کیا گیا اور نہ نعوذ باللہ اس تاریخ سے ضد ہے بلکہ الحمد للہ ہم اس میں برکت کے قائل ہیں مگر یہ اتفاقی بات ہے کہ اس بیان کا اس تاریخ سے اقتران ہو گیا اور یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ متبع سنت کو اللہ تعالیٰ بلا قصد وہ برکات عنایت فرما دیتے ہیں کہ جن کا متبع رسوم و بدعات ارتکاب بدعات کے ساتھ قصد کرتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو شئے دائر بین السنت والبدعۃ (سنت اور بدعت کے درمیان) ہو تو اس سنت کو ترک کر دینا چاہیے پس یہ تاریخ اگرچہ بابرکت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اس میں باعث مزید برکت کا ہے لیکن چونکہ تخصیص اس کی اور اس میں ذکر کا التزام کرنا چونکہ بدعت ہے اس لئے اس تاریخ کی تخصیص کو ترک کر دیا گیا ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس تخصیص کے مفسدہ سے بھی محفوظ رکھا اور اس تاریخ کی برکات سے بھی محروم نہیں رکھا اور عجیب بات ہے کہ اگر دوشنبہ کے روز بیان ہوتا تو ہم کو اس دن بھی یہی برکت حاصل ہوتی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اس یوم میں ہوئی ہے اور نیز بعض محققین اس طرف گئے ہیں کہ ولادت شریفہ ۸ ربیع الاول کو ہوئی ہے اور دوشنبہ کو آٹھویں ہی تاریخ تھی پس اس قول کے موافق ہم کو یوم البرکت اور تاریخ البرکت دونوں سے حصہ مل جاتا اور جمہور کے قول کے موافق ۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت شریفہ ہے اس لئے اب بھی اس تاریخ کی برکت سے محروم نہ رہے بلکہ اب دو برکتیں حاصل ہو گئیں یوم کی بھی اور تاریخ کی بھی اس لئے کہ دوشنبہ کے روز نیت بیان کی تھی اور مومن کی نیت پر بھی ثواب کا وعدہ ہے یوم کی برکت یوں حاصل ہو گئی اور آج کہ ۱۲ تاریخ ہے اس کا وقوع ہو گیا تاریخ کی برکت اس طرح حاصل ہو گئی یہ برکت ہے اتباع سنت کی اور ہر چند کہ اس یوم میں افراط تفریط کے متعلق بیان کرنا زائد معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جو افراط تفریط کرتا تھا آج ان لوگوں نے کر لیا ہو گا۔

پس اب اس بیان سے کیا فائدہ مگر یہ ایام چونکہ پھر بھی ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والے ہیں اور نیز علاوہ ربیع الاول کے اور دنوں میں بھی لوگ ایسی مجالس منعقد کرتے ہیں اور اس میں حدود شرعیہ سے تجاوز ہوتے ہیں اس لئے اس کے متعلق بیان کر دینا خالی از نفع نہیں یہ مضمون تو بطور تمہید کے تھا۔ اب آیت شریفہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ جاننا چاہیے کہ اس میں کسی مسلمان کو شک و شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر نعمت قابل شکر ہے خاص کر جو بڑی نعمت ہو پھر خصوص دینی نعمت اور دینی نعمتوں میں سے بھی خاص کر جو بڑی نعمت ہو پھر ان میں بھی خصوص وہ نعمت جو اصل ہے تمام دینی و دنیوی نعمتوں کی اور وہ نعمت کیا ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی نعمتوں کے تو فیوض دنیا میں فائض ہوتے ہی ہیں دنیوی نعمتوں کے سرچشمہ بھی آپ ہی ہیں اور صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر جہانوں کی رحمت کیواسطے دیکھئے عالمین میں کوئی تخصیص انسان یا غیر انسان یا مسلمان و غیر مسلمان کی نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہر شے کیلئے باعث رحمت ہے خواہ وہ جنس بشر سے ہو یا غیر جنس بشر سے اور خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زماناً متاخر ہو یا متقدم متاخرین کے لئے رحمت ہونا تو بعید نہیں لیکن پہلوں پر رحمت ہونے کیلئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا اور وہ وجود نوری کا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل و تربیت ہوتی رہی آخر زمانہ میں اس اُمت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گر و تاباں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولاً و آخراً تمام عالم کے لئے باعث رحمت ہیں۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام نعمتوں کی اصل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہوا تو ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود با وجود پر خوش نہ ہو یا شکر نہ کرے پس ہم پر یہ خالص تہمت اور محض افترا اور نرا بہتان ہے کہ توبہ توبہ نعوذ باللہ کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف یا اس پر خوش ہونے سے روکتے ہیں حاشا و کلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تو ہمارا جزو ایمان ہے۔ ہاں جو شئے خلاف اُن قوانین کے ہوگی جن کی پابندی کا ہم کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اس سے البتہ ہم روکیں گے اگرچہ فی نفسہ وہ شئے مستحسن ہو اور شریعت میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں دیکھو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ قبلہ سے منہ پھیر کر نماز پڑھنا ممنوع ہے اور یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یوم النحر اور یوم الفطر میں روزہ رکھنا حرام ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں

کہ ایام تشریق میں افطار ضروری ہے اور یہ بھی تمام امت کا مسئلہ مسلمہ ہے کہ ماہ محرم میں حج نہیں ہو سکتا اور نیز محل حج مکہ کرمہ ہی ہے بمبئی میں حج ممکن نہیں دیکھئے نماز روزہ حج فرض ہیں لیکن خلاف قاعدہ وقانون شریعت چونکہ کئے گئے اس لئے وہ بھی منہی عنہا ہو گئے اور ان کے ممنوع ہونے کو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں پس اگر کوئی ایسے نماز روزہ حج کو منع کرے تو اس کو کوئی عاقل یوں نہ کہے گا اور یہ تہمت اس پر نہ لگائیگا کہ یہ شخص نماز روزہ حج سے روکتا ہے اگر نماز روزہ سے روکتا تو خود ہی ان پر کیوں عامل ہوتا اسی طرح مسئلہ متنازعہ فیہا کے اندر سمجھو کہ ہمارے حضرات کی نسبت یہ کہنا کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کے ذکر یا اس پر خوش ہونے کو منع کرتے ہیں یہ نری تہمت اور افترا ہے سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (پاک ہے تو یہ بہتان عظیم ہے) حاشا اللہ ہم ہرگز منع نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہر شے کا ایک طریق ہوتا ہے جب وہ شے اس طریق سے کیجاوے تو وہ پسندیدہ ہے ورنہ ناپسند اور قابل منع کرنے کے ہے دیکھئے تجارت ہے اس کے لئے گورنمنٹ نے خاص خاص قوانین مقرر کر دیئے ہیں اگر کوئی شخص ان قوانین کے خلاف تجارت کرے گا تو وہ ضرور قوانین کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہوگا۔ چھرہ بارود کی تجارت وہی کر سکتا ہے جس نے لیسنس حاصل کر لیا ہو اسی طرح شریعت میں بھی ہر شے کا قاعدہ اور قانون ہے جب اس کے خلاف کیا جاوے گا تو وہ ناپسند اور منہی عنہ ہو جائیگی پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر مبارک عبادت ہے لیکن دیکھنا چاہئے کہ قانون داں حضرات یعنی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے اقتدا کا ہم کو حکم ہے انھوں نے اس عبادت کو کس طرز اور کس طریق سے کیا ہے اگر آپ لوگ اسی طریق سے کریں تو سبحان اللہ کون اس سے آپ کو روکتا ہے اور اگر اس طریق سے نہ کیا جائے تو بیشک وشبہ وہ قابل روکنے کے ہے۔ اب فرمائیے کہ کیا ہم لوگ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روکنے والے ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی چھرہ بارود کی تجارت کو لیسنس نہ ہونے کی وجہ سے منع کرے اور اس کو یہ کہا جائے کہ یہ تو تجارت کو منع کرتے ہیں پس نفس فرح وسرور علی ذکر رسول (ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خوشی) کو کوئی منع نہیں کرتا کہ وہ تو عبادت ہے، ہاں جب اس کے ساتھ اقتران منہی عنہ کا ہوگا تو وہ بیشک قابل ممانعت ہے۔ فرح اور سرور ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس کی نسبت قرآن مجید میں ایک مقام پر تو ہے لا تفرح (خوش مت ہو) اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے فلیفرحوا (پس چاہئے کہ خوش ہوں) جیسا اس آیت میں ہے معلوم ہوا کہ بعض فرح کے افراد ماذون فیہ (کم درجہ کے ہیں) ہیں اور بعض منہی عنہا اور ظاہر ہے کہ اعمال اخرویہ میں ہمارے لئے معیار شریعت ہے پس شریعت کے قواعد سے جو فرحت جائز ہے اس کی تو اجازت ہے اور جو ناجائز ہے وہ ممنوع ہے چنانچہ جس جگہ لَا تَفْرَحْ (مت خوش ہو) ہے

وہاں دنیوی فرحت مراد ہے مگر وہی فرحت جو حدود سے تجاوز ہو ورنہ نفس فرح نعمت دنیویہ پر بھی لوازم شکر سے ہے اور جہاں امر کا صیغہ ہے وہاں نعمت دینی پر فرحت مقصود ہے لیکن وہی فرح جس میں قواعد شریعت سے تجاوز نہ ہو مثلاً اگر کوئی نماز پر کہ وہ نعمت دینی ہے خوش ہو اور خوشی میں آکر یہ کرے کہ بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھنے لگے تو بجائے اس کے کہ ثواب ہو الٹا گناہ ہوگا اس لئے کہ اس نے شریعت کے قواعد سے تجاوز کیا خود ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس میں اختلاف ہے اسی کو لے لیجئے کہ مسئلہ متفق علیہا ہے کہ جو شخص چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ پڑھ دے تو نماز ناقص ہو گی حتیٰ کہ سجدہ سہو سے وہ نقصان منجبر ہوگا اگر سہواً ایسا کیا دیکھئے درود شریف کہ جس کی نسبت ارشاد ہے مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مَرَّۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا اَوْ کَمَا قَالَ یعنی جو شخص درود بھیجے مجھ پر ایک مرتبہ اس پر اللہ تعالےٰ دس مرتبہ رحمت فرماویں گے اور پھر موقع کونسا نماز لیکن حکم شرعی یہ کہ نماز میں نقصان آجائیگا تو اس کی آخر کیا وجہ ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید ؛؛ میندار سعدی کہ راہ صفا ؛؛ تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (زہد و ورع اور صدق و صفا میں سعی کرو لیکن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جس نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہرگز منزل مقصود کو نہ پہنچے گا سعدی یہ گمان نہ کرو کہ سیدھا راستہ بے بجز پیروی مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے نہیں چل سکتا) پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو موقع درود شریف کا نماز میں مقرر فرما دیا ہے چونکہ اس سے تجاوز ہوا ہے اس لئے نماز میں نقصان آیا اگرچہ درود شریف فی نفسہ عبادت ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر اہل بدعات کا بھی اتفاق ہے اس لئے کہ وہ بھی حنفی ہیں پس ان کو چاہیئے کہ امام حنیفہؒ پر اعتراض کریں اور ان پر بھی یہ تہمت لگائیں کہ وہ تو یہ تو بہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں اور وہ بھی وہابی تھے۔ پس اے حضرات خدا سے ڈریئے اور اس مادہ فاسدہ کو اپنے دماغ سے نکالئے ورنہ اس کا اثر دور دور تک سرایت کریگا اور احکام میں نظر انصاف اور حق طلبی سے غور فرمایئے پھر اگر شبہات رہیں تو شائستگی اور تہذیب سے ان کو رفع فرمایئے اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قرآن مجید میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کی نسبت کَمَا سَیَجِیْئُ فِیْ تَفْسِیْرِ الْاٰیَۃِ مُفَصَّلًا (جیسا کہ آیت کی تفسیر میں عنقریب مفصل آئیگا) صیغہ امر فَلْیَفْرَحُوْا (پس خوش ہونا چاہیئے) موجود ہے تو اس فرحت کو کون منع کر سکتا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ پر فرحت اور سرور کو

کوئی منع نہیں کر سکتا اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ لیکن میں نے اس میں اس لئے تطویل کی کہ ہم پر یہ افترا ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو منع کرتے ہیں معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک تو وہ شے ہے کہ اگر اس پر اجر کا بھی وعدہ نہ ہوتا تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بمقتضائے مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَه (جو شخص کسی چیز سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا ذکر اکثر کرتا ہے) اس کو مقتضی ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر کیا کرے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر عین عبادت ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے خود اس قدر مواقع آپ کے ذکر کے مقرر فرمائے ہیں کہ مسلمان سے لامحالہ ذکر ہو ہی جاوے دیکھئے نماز کے اندر ہر قعدہ میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم پر سلام ہو) موجود ہے اور قعدہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا میں دو دو ہیں اور فجر میں ایک تو کل نو قعدے ہوئے اور سنن موکدہ اور وتر میں لیجئے ظہر میں تین مغرب میں ایک عشا میں تین اور صبح میں ایک تو کل سترہ قعدے ہوئے پس یہ سترہ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوا پھر پانچوں وقت فرائض اور سنن اور وتر کے قعدے اخیرہ میں کل گیارہ مرتبہ درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے پس سترہ اور گیارہ کل اٹھائیس بار تو لامحالہ ہر مسلمان کو آپ کا ذکر مبارک کرنا روزانہ ایسا ضروری ہے کہ اس سے کسی طرح مفر ہی نہیں پھر پانچوں وقت اذان اور تکبیر ہوتی ہے اس میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) موجود ہے جس کو مؤذن اور سننے والا دونوں کہتے ہیں پھر ہر نماز کے بعد دعا بھی سب ہی مانگتے ہیں اور دعا کے آداب میں سے کر دیا گیا ہے کہ اس کے اول و آخر درود شریف ہو غرض اس حساب سے اٹھائیس سے بھی زیادہ تعداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کی ہوگی اور یہ تو وہ مواقع ہیں کہ ان میں پڑھے بے پڑھے سب شامل ہیں اور جو طالب علم حدیث شریف پڑھتے ہیں وہ تو ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذکر میں رہتے ہیں اس لئے کہ ہر حدیث کے شروع میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ درود شریف موجود ہے چنانچہ احادیث کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے اور ان میں جا بجا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان پر درود و سلام بھیجے) اور قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ان پر درود و سلام بھیجے) اور عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے اللہ تعالیٰ ان پر درود و سلام بھیجے) واقع ہے اور درمیان میں بھی جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک آیا ہے وہاں بھی درود شریف موجود ہے گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو ایسا گوندہ دیا ہے کہ بغیر ذکر کے مسلمان کو چارہ نہیں۔ مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

سے کسی نے پوچھا تھا کہ ذکر ولادت آپ کے نزدیک جائز ہے یا ناجائز انھوں نے فرمایا کہ ہم تو ہر وقت ذکر ولادت کرتے ہیں اس لئے کہ ہر وقت کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کلمہ کہاں پڑھتے۔ پس محبت کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر ہو اور اس کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے لئے مجالس منعقد کی جاویں اور مٹھائی منگائی جاوے تب ذکر ہو عاشق اور محب کو اتنی دیر کیسے صبر آسکتا ہے۔ دیکھو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو محب کی کیا حالت ہوتی ہے کہ ہر وقت اس کی یاد میں بے قرار رہتا ہے اگر اس سے کوئی کہے کہ میاں ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس آرائی کرلیں اور مٹھائی منگالیں اس وقت ذکر کیجیو وہ کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری محبت کاذبہ ہے کہ جو اتنی دیر تم ذکر محبوب سے صبر کرتے ہو محبت تو وہ شئے ہے جیسے مجنوں کی حالت تھی ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتان قلم — می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست این — می نویسی نامہ بہر کیست این
گفت مشق نام لیلےٰ میکنم — خاطر خود را تسلی میکنم

(کسی نے مجنون کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا پوچھا اس نے اے مجنون کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا لیلی کے نام کی مشق کر رہا ہوں اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں) بتلائیے اگر مجنون کو اس حالت میں کوئی یہ کہتا کہ ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس بنالیں اور مٹھائی منگالیں اس وقت لیلی کا ذکر کرنا تو وہ یہ جواب دیگا کہ سلام ہے ایسی مجلس کو اور ایسی مٹھائی کو جو میرے اور میرے محبوب کے درمیان میں حجاب ہو اور ہم نے تو اکثر مجالس میلاد والوں کو یہی دیکھا ہے کہ یہ محبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں اس لئے کہ بڑا معیار محبت کا محبوب کی اطاعت ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْھِرُ حُبَّہٗ — ھٰذَا لَعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ
لَوْکَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ — اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

یعنی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور ان کی محبت کو ظاہر کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ امر افعال عجیبہ میں سے ہے اگر تیری محبت صادق ہوتی تو ضرور تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا

اس لئے کہ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے اور ان مولد پرستوں کو دیکھا ہے کہ مجلس میلاد کا اہتمام کرتے ہیں لنس کھڑے کر رہے ہیں ان پر کپڑے مڈھ رہے ہیں اور سامان روشنی کا فراہم کر رہے ہیں اور اس درمیان میں جو نمازوں کے وقت آتے ہیں تو نماز نہیں پڑھتے اور ڈاڑھی کا صفایا کرتے ہیں کیوں صاحب کیا محبین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہی صورتیں اور یہی ان کی حالت ہوتی ہے کیا بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا ہی حق ہے کہ پانچ روپیہ کی مٹھائی منگائی تقسیم کر دی اور سمجھ لیا کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کر دیا کیا آپ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ کوئی پیشہ ور پیرزادہ سمجھا ہے کہ تھوڑی سی مٹھائی پر خوش ہو جاویں تھوڑے سے نذرانہ پر راضی ہو جاویں توبہ توبہ نعوذ باللہ یاد رکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے محبین سے خوش نہیں ہیں سچے محب وہ ہیں جو اقوال و افعال وضع انداز ہر شئے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور اطاعت کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست حافظ اشفاق رسول نامی ہیں وہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فریفتہ ہیں وہ کبھی کبھی محبت کی وجہ سے ذکر ولادت مروج طریق سے کیا کرتے تھے انھوں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی شفاعت نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریف کرے ہم اس کی شفاعت کریں گے جو ہماری اطاعت کرے مطلب اس کا یہی ہے کہ جو شخص نرا دعوٰی کرتا ہو اور نعتیہ اشعار بہت پڑھتا ہو لیکن اطاعت کرتا نہ ہو تو اس کی شفاعت نہ کریں گے۔ میں نے جو اصلاح الرسوم کتاب لکھی ہے اس میں ایک فصل ذکر میلاد کے متعلق بھی ہے چنانچہ وہ فصل طریقہ مولد کے نام سے علیحدہ بھی طبع ہو گئی ہے تو جب یہ کتاب لکھی گئی تو مجلس میلاد کے متعلق کانپور میں لوگوں نے بہت شور کیا اسی اثنار میں ایک شخص صالح نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس اختلاف کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس میں صحیح کیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اشرف علی نے جو لکھا ہے وہ سب صحیح ہے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو کتاب نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے اس کے آخر میں ان دونوں خوابوں کو مفصلاً درج کر دیا ہے لیکن میری غرض ان خوابوں کے ذکر کرنے سے مدعا کا اثبات نہیں ہے اثبات مدعا کے لئے تو مستقل دلائل ہیں یہ تو محض تائید اور مزید اطمینان کے لئے لکھ دیا ہے۔ الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور اس پر شکر اور فرحت مامور بہ ہے چنانچہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں اسی نعمت کا ذکر اور اس پر فرح کا امر ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے پہلے قرآن مجید کی شان حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ

لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت اور دل کے امراض کے لئے شفا اور مومنین کے لئے ہدایت و رحمت آئی ہے اس میں حق تعالیٰ نے قرآن مجید کی چار صفتیں بیان فرمائی ہیں موعظۃ۔ شفا۔ ہدیٰ۔ رحمت۔ موعظۃ کہتے ہیں وہ کلام جو بری باتوں سے روکنے والا ہے اور شفا اسکی صفت بطور ثمرہ کے فرمائی ہے یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس موعظت پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ دلوں کے اندر جو روگ ہیں اُن سے شفا حاصل ہو گی۔ یہاں سے ایک تصوف کا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے یہ تو ظاہر ہے کہ ہم لوگ گناہ میں مبتلا ہیں اور شب و روز ہم سے لغزشیں ہوتی ہیں لیکن اس ابتلا کے ساتھ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کرتے ہیں اور ان کو اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا اور ایک وہ جن کو احساس ہوتا ہے سو الحمد للہ کہ ہم گو پھسلتے ہیں اور گناہ ہم سے صادر ہوتے ہیں لیکن اندھے نہیں ہیں کہ اس کی خبر ہی نہ ہو کہ راستہ کدھر ہے الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائی ہیں گو بعض وقت نفس کے غلبہ و شرارت سے ان سے کام نہ لیں پس اُن آنکھوں سے ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ جب کوئی کبھی گناہ ہوا ہے اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہو گیا اسی روگ کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یعنی بلکہ ان کے دلوں پر اُن کے اعمال کے زنگ کا غلبہ ہو گیا ہے اور اسی کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی کوئی گناہ کرتا ہے تو قلب پر ایک داغ لگ جاتا ہے اگر توبہ کر لے تو وہ مٹ جاتا ہے ورنہ بڑھتا ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ہر گناہ زنگے است بر مرآۃ دل	دل شود زین زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی	نفس دون را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے کہ دل ان زنگوں سے خوار و شرمندہ ہوتا ہے جب دل کی تاریکی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو نفس کمینہ کو اس سے خیرگی ہوتی ہے۔)

غرض گناہ کے اندر خاصہ ہے کہ قلب میں اس سے ایک روگ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ روگ اور بڑھ جاتا ہے یہاں پر بعض اہل سلوک کو ایک عجیب دھوکا ہوا ہے اور ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان ان کو گناہ کی رغبت دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے قوت نور ایمان گناہ سے روکتی ہے جس سے وہ رک جاتا ہے لیکن شیطان تو اس سے بہت زیادہ پڑھا ہوا ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ اس طور سے میرا قابو نہیں چلتا تو وہ گناہ کے اندر ایک دینی مصلحت بتاتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ گناہ نہ کیا تو ہمیشہ تمہارے دل میں یہ کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔

اور اگر ایک دفعہ دل بھر کر کر لو گے تو دل میں سے اس کا وسوسہ جاتا رہیگا بس اس سے فراغت ہو جائے گی اس میں بڑے بڑے سمجھدار لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن مومن کامل کو اللہ تعالیٰ نے ایک نور عطا فرمایا ہے کہ وہ اس کے لاکھوں تار و پود کو اُس نور کے ذریعہ سے توڑ پھوڑ دیتا ہے (چنانچہ عنقریب اس مغالطہ کا حل آتا ہے) اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے فَقِيهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ گراں ہے کسی نے اس مضمون کو نظم بھی کر دیا ہے ؎ فَاِنَّ فَقِيهًا وَّاحِدًا مُّتَوَرِّعًا ؛ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ یعنی

(بلاشبہ ایک پرہیزگار فقیہ شیطان ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے)

یہ غلطی ہے جو اہل سلوک کو ہوتی ہے اور اہل سلوک کو جو غلطی ہوتی ہے دراصل غلطی وہی ہے اور وہ بہت سخت ہوتی ہے اسی واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تم کو تو گناہ سے اندیشہ ہے اور ہم کو کفر سے اندیشہ ہے بڑا خطرناک راستہ ہے بس عافیت اس میں ہے کہ اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دے اور کَالْمَيِّتِ بَيْنَ يَدَيِ الْغَسَّالِ (مثل مردہ کے غسال کے ہاتھ میں) بدست محقق ہو کر رہے شیخ شیرازی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎ اگر مرد عشقی کم خویش گیر

وگرنہ رہ عافیت پیش گیر۔ یعنی اگر مرد عشق ہو تو اپنے کو گم کر دو یعنی اپنی رائے کو دخل نہ دو بلکہ یہ مشرب اختیار کر و ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفرست درین مذہب خود بینی و خود رائی

(عالم عاشقی میں اپنی فکر و رائے بالکل بیکار ہے اس مذہب میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

جیسے اس شخص نے خود رائی کی کہ شریعت تو حکم کر رہی ہے لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا (زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو) یہ اپنی رائے سے کہتا ہے کہ میں زنا سے جب بچ سکوں گا جب جی کھول کر پانچ چھ مرتبہ زنا کر لوں گا اور اس احمق کو اتنی خبر نہیں کہ مرض کو اس سے اور زیادہ قوت ہو گی جیسے کسی شاعر کا شعر ہے ؎ کنار و بوس سے دونا ہوا عشق ؛ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی ؛ یہ بیوقوف تو سمجھتا ہے کہ درخت میں پانی دینے سے اس کی جڑ نرم اور کمزور ہو جائے گی پھر اس کو سہولت سے باہر نکال لوں گا مگر وہ پانی دینے سے اور زیادہ نیچے کو دھستی اور زور پکڑتی جاتی ہے گناہ کرنے کے بعد اس کو قلب خالی معلوم ہوتا ہے اور خبر نہیں کہ وہ گناہ پہلے حوالی قلب میں تھا اس لئے اس کو محسوس ہوتا تھا اور اب عروق کے اندر پیوست ہو گیا اس وجہ سے اس کو محسوس نہیں ہوتا اور وقت پر بہ نسبت سابق کے بہت زور کے ساتھ برآمد ہو گا اور یہ نہیں سمجھتا کہ اب تو اس کا استیصال سہل ہے اور پھر مشکل ہو گا بقول شیخ شیرازی ؎

سر چشمہ شاید گرفتن بمیل   چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

درختے کہ اکنوں گرفتست پائے | بہ نیروئے شخصے برآید زجائے
وگر ہمچناں روزگارے ہلی | بگردونش از بیخ برنگلی

(چشمے کے سوراخ کو ایک کیل سے بند کر سکتے جب پُر ہو جائے تو ہاتھی بھی اس میں نہیں گذر سکتا جس درخت نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک آدمی کی طاقت سے اکھڑ سکتا ہے اگر کچھ زمانہ تک اس کو اسی طرح چھوڑ دو تو اس کو جڑ سے آلہ گردوں سے بھی نہیں اکھاڑ سکتے)

الحاصل گناہ ایسی شئے ہے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہو جاتا ہے پس ارشاد ہے کہ قرآن مجید ایسی موعظت ہے کہ اگر اس پر عمل کروگے تو وہ دلوں کے روگ کیلئے باعث شفا ہوگا۔ اور تیسری صفت قرآن مجید کی ھدیٰ ارشاد فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نیک راہ کو بتلانیوالا ہے اور جو بھی صفت رحمت بطور ثمرہ ہدیٰ کے فرمائی ہے یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی پس قرآن میں مذکورہ بالا صفات کو جمع کر دیا ہے اور لِلْمُؤْمِنِيْنَ (مومنین کیلئے) کی قید اس لئے لگائی کہ گو مخاطب تو اس کے سب ہیں لیکن منتفع اس سے مومنین ہی ہوتے ہیں۔ اب اس آیت کے بعد بطور تفریع ارشاد ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ پس صرف چاہیئے کہ خوش ہوں (اس لئے کہ) وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں یعنی متاع دنیا سے یہ بہتر ہے اور عجیب بلاغت ہے کہ پہلے مضمون کا تو حق تعالےٰ نے خود اپنی طرف سے خطاب فرمایا چنانچہ ارشاد ہے يٰاَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو!) اور اس دوسرے مضمون کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ کہئے اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ طبعی بات ہے کہ احکام یعنی امر و نہی انسان کو ناگوار اور گراں ہوتے ہیں اس لئے احکام تو خود ارشاد فرمائے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فرحت کے امر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور زیادہ محبت مخلوق کو بڑھے باقی اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بہت جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احکام پہونچانیکا حکم ہے اس لئے کہ یہ نکتہ اس مقام کے متعلق ہے اور دوسری جگہ دوسرا نکتہ اور حکمت ہو سکتی ہے بہرحال دو چیز پر خوش ہونے کا حکم ہے فضل اور رحمت اور یہ فضل بھی رحمت ہی کے افراد میں سے ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ فضل کے اندر معنی زیادتی کے ہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی مہربانی کے دو مرتبے ہیں ایک نفس مہربانی اور ایک زائد یا یوں کہو کہ ایک وہ مرتبہ جس کا بندہ بحیثیت جزا ر کے اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اور ایک زائد اگرچہ پہلے مرتبہ رحمۃ کا اپنے کو مستحق سمجھنا بندہ کی جہالت ہے اور وجہ اس زعم استحقاق کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر ہر شخص کو ایک ناز ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو ہم لوگوں میں ناز ہی کی شان رہ گئی ہے نیاز بالکل نہیں رہا اس لئے کہ اگر نیاز ہوتا تو ہم سے نافرمانی نہ ہوتی دیکھ لیجئے کہ حکام دنیا کے ساتھ نیاز ہے اس لئے ان کی نافرمانی نہیں کرتے نہ ان پر نخرے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ بالعکس ہے جس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ رحمت ہی بے انتہا ہے حتیٰ کہ فوری سزا انہیں دی جاتی سو جس قدر رحمت بڑھتی جاتی ہے اس رحمت و عنایت کو معلوم کرکے اسی قدر اعراض ان حضرت کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گدھا ہمیشہ کسی کے کھیت میں گھس جایا کرتا تھا ایک روز کھیت والے نے اس کے کان میں کہدیا کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے اس روز سے اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا پس اسی طرح حق تعالیٰ کی اس قدر عطایا اور بے انتہا رحمتیں ہیں کہ ہم لوگوں کو ناز ہو گیا اور اپنی جہالت سے یہ سمجھ گئے کہ ہم بھی محبوب ہیں بس لگے نخرے بگھارنے مگر چونکہ ناز کی لیاقت نہیں ایسے ناز کا انجام بجز ہلاکت کے کیا ہوگا۔ جیسے کسی بیوقوف نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا ہے اور وہ گھوڑا کبھی ادھر منہ کر لیتا ہے کبھی ادھر منہ پھیرتا ہے اور یہ شخص جس طرف وہ منہ کرتا ہے اسی طرف دانہ لیجاتا ہے اور کبھی اس کی پیٹھ سہلاتا ہے اور کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ بیٹا کھا اس بیوقوف نے جب یہ دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو یہ گھوڑا ہی بہتر ہے میری بیوی تو مجھ کو بڑی ذلت سے روٹی دیتی ہے آج سے گھوڑا بننا چاہیئے یہ سوچ کر گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ آج تو ہم گھوڑا بنیں گے وہ بھی بڑی شوخ تھی اس نے کہا کہ میری بلا سے آپ گھوڑا بنیں یا گدھا اس شخص نے کہا کہ میں گھوڑا بنتا ہوں تم میری پیٹھ سہلانا اور دانہ میرے سامنے لانا اور یہ کہنا کہ بیٹا کھاؤ میں ادھر ادھر منہ پھیروں گا۔ غرض یہ الو کی دم گھوڑے کی طرح کھڑا ہوا۔ بیوی صاحبہ بھی عقلمند تھیں ایک چادر جھول کی بجائے اس پر ڈالی اور اگاڑی پچھاڑی اس کی باندھ دی اور دم کی جگہ جھاڑو لگائی اور دانہ سامنے لائی اور کہا بیٹا کھاؤ۔ رات کا وقت تھا اور اتفاق سے چراغ پیچھے رکھا تھا جب اس نے ادھر ادھر منہ پھیرا اور دولتیاں چلائیں

چراغ کی لو جھاڑو میں لگ گئی اور آگ بھڑک اٹھی بدحواسی میں یہ تو خیال نہ رہا کہ رسیاں کھول دے شور مچا دیا کہ لوگو دوڑو میرا گھوڑا جل گیا محلہ والوں نے جانا کہ یہ پاگل یا مسخری ہے اس کے یہاں گھوڑا کہاں یہ یوں ہی بیہودہ بکتی ہے غرض وہ گھوڑے صاحب وہیں جل بھنکر خاک سیاہ ہو گئے یہ انجام ہوتا ہے ایسے نخرے اور ناز کا صاحبو! ناز کے لئے صورت بھی تو بمنوالوجیب ناز زیبا ہو گا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ۔۔۔ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز ۔۔۔ عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ بدصورتی پر ناز براہے آنکھ نابینا کا کھلا ہونا عیب ہے)

ہمارا کیا ناز ہم کو تو نیاز چاہیے لیکن حق تعالےٰ کے کرم اور رحمت بے انتہا سے ہم لوگوں کی عادتیں بگڑ گئی ہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ جس قدر رحمت ہوتی شرماتے اور تضرع و نیاز زیادہ ہوتی مگر یہاں بالعکس ہے۔ اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر مجکو یہ کہا جاوے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ یعنی کس شے نے دھوکہ میں ڈالا تجکو اپنے رب کریم کے ساتھ تو میں جواب دونگا قَدْ غَرَّنِیْ كَرَمُكَ یعنی آپ کے کرم نے مغرور کر دیا یعنی میں خلاف مقتضائے کرم اُس کرم پر مغرور ہو گیا مقصود تیہ ہے اور اس کو عذر گردانا مقصود نہیں پس یہ سارا ناز اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ کی عطایا زائد ہیں اور مواخذات کم ہیں اور اگر یہ ہوتا کہ جب گناہ کرتے تو غیب سے ایک چپت لگتا تو تمام ناز ایک طرف رکھا رہ جاتا اور کبھی گناہ نہ ہوتا چنانچہ بعض بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا بھی ہے۔ ایک بزرگ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور نہایت خوف زدہ تھے اور یہ کہتے جاتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْكَ (اے اللہ میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں) کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا حالت ہے انہوں نے فرمایا کہ طواف کرتے ہوئے میں نے ایک لڑکے کو نظر بد سے دیکھ لیا تھا غیب سے میری آنکھ پر ایک ایسا آزور دچپت لگا کہ میری آنکھ پھوٹ گئی اور یہ ارشاد ہوا اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا یعنی اگر تم پھر کرو گے تو ہم پھر بھی

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ سزا کا ہمکو صاف علم ہو تاکہ یہ گناہ کی سزا ہے اور اسباب ظاہرہ کے ساتھ اس کا تعلق نہ جانتے ورنہ گناہوں پر تو مصائب و حوادث آفاقی و انفسی سے نہایت لطیف انداز سے سزا ہوتی ہے اور رحمت سے معاف بھی ہو جاتے ہیں لیکن ہم کو اپنی جہالت اور اسباب پرستی کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہے اور اگر تھوڑے غور و فکر سے کام لیں تو اس کا ادراک کَالشَّمْسِ فِیْ نِصْفِ النَّهَارِ (مثل سورج کے دن میں) ہونے لگے اور یہ سزا ہونا بھی عین رحمت ہے ۱۲ (جامع عفی عنہ)

سزا دیں گے۔ غرض حق تعالیٰ پر ایسا ناز ہے کہ اس کی وجہ سے ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی رحمت کے حصہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ چنانچہ اتنا تو ضروری جانتا ہے کہ مجکو کھانے پہننے کو ملے اور اگر اس میں کچھ کمی ہوتی ہے تو شکایت کرتا ہے اگر یہ شخص اپنے کو مستحق نہ جانتا تو شکایت نہ کرتا اس لئے کہ شکایت اسی کی کیا کرتے ہیں جس پر حق سمجھتے ہیں۔ ایک گنوار کا بیٹا مر گیا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ میرے بیٹے کو تو مار دیا اور عیسیٰ (علیہ السلام) جو ذرا نام لگ گیا تھا اس کو گود میں اٹھا لیا۔ مگر اللہ اکبر کیا رحمت ہے سب کچھ سنتے ہیں اور کچھ سزا نہیں دیتے اور دوسری مثال لیجئے دیکھئے اگر کسی کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں تو ان پر تو شکر نہیں کرتا اور اگر کہیں سے زائد مل جائے تو اس کو رحمت حق تعالیٰ کی جانتا ہے اس پر شکر کرتا ہے یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ ان دس روپیہ کا اپنے کو مستحق جانتا ہے۔ ایک جاہل اکھڑ کے سامنے کسی نے دال روٹی کھائی اور کھا کر کہا کہ الحمد للہ اے اللہ تیرا شکر ہے تو بیوقوف کہتا ہے کہ تو یہ تو یہ ایسے ہی لوگوں نے اللہ میاں کی عادت بگاڑ دی کہ دال روٹی کھا کر شکر کرتے ہیں پس وہ ان کو دال روٹی ہی دیدیتے ہیں ہم تو بدون بکرے کے کبھی شکر نہیں کرتے پس ہم کو وہ بکرے دیتے ہیں نعوذ باللہ بہر حال ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی حصہ رحمت کا مستحق سمجھتا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے اگر کوئی شخص ایسا جانتا ہو جیسا کہ طرز معاملہ سے معلوم ہوتا ہے تو اس کو اس غلطی کی اصلاح کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ معتزلہ کو بھی اس مسئلہ میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہمارا حق ہے اور ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے قرآن شریف کی بعض آیتوں کے نہ سمجھنے سے چنانچہ ارشاد ہے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی مومنین کی نصرت ہم پر حق ہے اس آیت اور اس کے ہم معنی اور آیات سے معتزلہ نے یہ سمجھا کہ حق تعالیٰ کے ذمہ بندوں کا حق ہے لیکن اہل سنت سمجھ گئے کہ یہ دھوکہ ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ غنی بالذات اور لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا) اُن کی صفت ہے اُن پر کسی کا حق نہیں ہو سکتا جس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں کریں وہ سب مستحسن ہے اور معنی ان آیات کے یہ ہیں کہ اس صیغہ سے ہم کو نصرت وغیرہا کا یقین دلایا گیا ہے اسکو وعدہ تفضل کہتے ہیں جیسے کوئی حاکم کسی امیدوار سے کہے کہ اب تم یقین رکھو اب ہم نے تمہارا یہ کام ضروری سمجھ لیا ہے تو وہ امیدوار و سائل جانتا ہے کہ یہ حاکم کی مہربانی ہے ورنہ کرنا نہ کرنا دونوں قانوناً ان کے اختیار میں ہے ان کے ذمہ لازم نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے دو درجہ ہیں ایک کا تعلق تو اس کی ضروریات سے ہے جس کا اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اس درجہ کو تو رحمۃ فرمایا اور دوسرا زائد اس کو فضل سے تعبیر

فرمایا اور آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد رحمت وفضل سے قرآن مجید ہے اور اس میں بھی یہی دو درجہ ہیں ایک وہ درجہ جو مدار ہماری نجات کا ہے وہ تو ضرورت کا مرتبہ ہے اور ایک وہ جو اس سے زائد ہے۔ بہرحال دونوں سے مراد قرآن مجید ہے اور اس پر خوش ہونے کا امر ہے یہ تفسیر اور گفتگو تو الفاظ آیت کے خصوصیت میں نظر کرنے کے اعتبار سے تھی اب قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہیئے کہ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت آئے ہیں کہیں دونوں سے ایک ہی معنی مراد ہیں کہیں جدا جدا چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو البتہ تم ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے) یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک فضل اور رحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود مراد ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بجز تھوڑے لوگوں کے تم شیطان کی پیروی کرتے) یہاں بھی بقول اکثر مفسرین حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ (سو اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو البتہ ان میں سے ایک گروہ نے تجھ کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا) یہاں مراد فضل اور رحمت سے قرآن مجید ہے اور بعض آیات میں فضل سے مراد رحمت دنیوی اور رحمت سے رحمت دینی مراد ہے چنانچہ فضل بمعنی رزق نفع دنیوی قرآن مجید میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ یہاں فضل سے مراد تجارت ہے اس لئے کہ یہ آیت حج کے موقع کی ہے بعض لوگ مال تجارت حج کے سفر میں ساتھ لیجانے کو مکروہ جانتے تھے ان کو ارشاد ہے کہ اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل طلب کرو۔ حدیث شریف میں بھی رحمۃ سے رحمت دینی اور فضل سے رحمت دنیوی یعنی رزق یا اسباب رزق مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (اے اللہ ہمارے لئے رحمت کے دروازے کھول دے) یہاں رحمت سے رحمت دینی مراد ہے اس لئے کہ مسجد میں وہی مطلوب ہے، اور جب مسجد سے نکلو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ فَضْلِكَ (اے اللہ ہمارے لئے رزق کے دروازے کھول دے) اس لئے کہ مسجد سے باہر جا کر تحصیل معاش میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہاں اس کی طلب ہے اور دیکھئے سورہ جمعہ میں ارشاد ہے فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (پس جبکہ نماز ادا ہو جائے تو تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ سے روزی تلاش کرو) یہاں فضل سے مراد رزق ہے پس مجموعہ تمام تفاسیر کا دنیوی رحمتیں اور دینی رحمتیں ہوا اس مقام پر ہر چند کہ آیت کے سیاق پر نظر کرنے کے اعتبار سے قرآن مجید مراد ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لئے جاویں تو قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے وہ یہ ہے کہ فضل اور رحمت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدوم مبارک لیا جاوے اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی اور اس میں قرآن بھی ہے سب اس میں داخل ہو جائیں گی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا پس یہ تفسیر اجمع التفاسیر ہو جائے گی پس اس تفسیر کی بنا پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ ہم کو حق تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر خواہ وجود نوری ہو یا ولادت ظاہری اس پر خوش ہونا چاہئے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے تمام نعمتوں کے واسطہ ہیں حتیٰ کہ ہم کو جو روٹیاں دو وقتہ مل رہی ہیں اور عافیت و تندرستی اور ہمارے علوم یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہیں اور یہ نعمتیں تو وہ ہیں جو عام ہیں اور سب سے بڑی دولت ایمان ہے جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہونچنا بالکل ظاہر ہے غرض اصل الاصول تمام مواد فضل و رحمت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہوئی پس ایسی ذات بابرکات کے وجود پر جس قدر بھی خوشی اور فرح ہو کم ہے۔ بہرحال اس آیت سے عموماً یا خصوصاً یہ ثابت ہوا کہ اس نعمت عظمیٰ پر خوش ہونا چاہئے اور ثابت بھی ہوا نہایت ابلغ طرز سے اس لئے کہ اول تو جار مجرور بِفَضْلِ اللّٰہِ کو مقدم لائے کہ جو مفید حصر کو ہے اس کے بعد رحمت پر پھر جار کا اعادہ فرمایا کہ جس سے اس میں استقلال کا حکم پیدا ہو گیا پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کو مزید تاکید کے لئے فَبِذٰلِکَ مکرر ذکر فرمایا اور ذٰلِکَ پر جار اور فاء عاطفہ کو لائے تاکہ اس میں اور زیادہ اہتمام ہو جائے پھر نہایت اہتمام در اہتمام کی غرض سے فَلْیَفْرَحُوْا (پس چاہئے کہ خوش ہوں) پر فاء لائے کہ جو مشیر ہے ایک شرط مقدر کی طرف اور وہ اِنْ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ (اگر کسی چیز سے خوش ہوں) ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شئے کے ساتھ خوش ہوں تو اللہ ہی کے فضل و رحمت کے ساتھ پھر اسی کے ساتھ خوش ہوں یعنی اگر دنیا میں کوئی شئے خوشی کی ہے تو بھی نعمت ہے اور اس کے سوا کوئی شئے قابل خوشی کے نہیں ہے اور اس سے بدلالۃ النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بہتر ہے لیکن چونکہ ہم لوگوں کی نظروں میں

دنیا اور دنیا ہی کی نعمتیں ہیں اور اسی میں ہمکو انہاک ہے اس لئے اس پر بس نہیں فرمایا آگے اور نعمتوں پر اس کی تفصیل کے لئے صراحتاً ارشاد ہوا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُون یعنی یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کرتے ہیں یعنی دنیا بھر کی نعمتوں سے یہ نعمت افضل و بہتر ہے پس جس نعمت پر حق تعالیٰ اس شدومد کے ساتھ خوش ہونے کا حکم فرمادیں وہ کس طرح خوش ہونے کے قابل نہ ہوگی یہ حاصل ہوا اس آیت کا جو مبنی ہے اس پر کہ فضل اور رحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد لئے جادیں اور دوسرے مقام پر اس سے بھی صاف ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی خوشی کی شئے دنیا میں اگر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور اس میں مابہ الفرح یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر جو خوشی کو امر ہے وہ کس بنا پر ہے اور حیثیت و جہت فرح کی کیا ہے یہ بھی مذکور ہے وہ آیۃ یہ ہے ارشاد ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ یعنی حق تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے جنس سے بھیجا کہ وہ ان پر ان کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو (ظاہری و باطنی نجاستوں و گندگیوں سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت سکھلاتے ہیں اور بیشک وہ اس سے پہلے ایک کھلی گمراہی میں تھے اس آیت میں یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ الخ وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصلی شئے خوشی کی اور مابہ الفرح والمنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے سرمایۂ ہدایت ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خوش ہونے کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر تمام حالات مثلاً معراج وغیرہ یہ سب حالات واقعی خوش ہونے کے ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ ہمارے لئے یہ مقدمات ہیں ہدایت وسعادت ابدی کے چنانچہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے اس لئے کہ بعثت کے ساتھ یہ صفات بھی بڑھائی ہیں یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ الخ (وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں)

ف یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلی شئے خوشی کی اور قابل اعتداد اللہ تعالیٰ کا ایمان عطا فرمانا ہے کہ جو محض فضل ہے پس ذالک خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (اور تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کرتے ہیں) یہی فضل اور رحمت مراد ہے اور مایجمعون اپنے عموم سے تمام احوال باطنہ کو بھی شامل ہے کہ ان پر بھی سالک کو اگر خوشی ہو تو اسی حیثیت سے ہونا چاہئے کہ فضل ہے اپنے کسب کو مطلق دخل نہ سمجھے ۱۲ جامع عفی عنہ

پس بقاعدہ بلاغت ثابت ہوتا ہے کہ اصل ما بہ المنت یہ صفات ہیں باقی ولادت شریفہ فی نفسہا یا معراج وہ بھی باعث خوشی زیادہ اسی لئے ہیں کہ مقدمہ ہیں اس دولت عظمیٰ کے اس لئے کہ اگر ولادت شریفہ نہ ہوتی تو ہم کو یہ نعمت کیسے ملتی اور اسی فرق کی وجہ سے اس آیت میں تو اس مقصود کا ذکر تصریحاً اور قصداً فرمایا اور دوسری آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کا ذکر اشارۃً اور ضمناً فرمایا چنانچہ ارشاد ہے لعمرك اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش ہے) اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اور وجود کو مقسم بہ بنایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قسم میں جواب قسم مقصود ہوتا ہے اور مقسم بہ کو تبعاً ذکر کیا جاتا ہے اور ایک مقام پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا ہے. فرماتے ہیں لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے قسم ہے باپ کی اور دادا کی) چنانچہ ما ولد کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے مگر اس اہتمام سے نہیں جیسا آیۃ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ الخ (اللہ تعالیٰ نے احسان کیا) میں نبوت اور بعثت اور ہدایت اور تزکیہ کو بیان فرمایا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے فرحت میں بھی تفاوت ہوگا کہ جس قدر ولادت شریفہ پر فرحت ہونا چاہیئے اس سے زائد نبوت شریفہ پر ہونا چاہیئے اگر ذکر ولادت شریفہ کے لئے مجلس منعقد کی جاوے تو ذکر نبوۃ مبارکہ کیلئے بطریق اولیٰ کی جاوے اور اسی طرح ان اہل مجالس کو چاہیئے کہ معراج شریف اور فتح مکہ معظمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات مبارکہ اور ہجرۃ کی بھی مجالس منعقد کیا کریں اس لئے کہ جیسے ولادت شریفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حال ہے اسی طرح یہ بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حالات ہیں بلکہ بعض ان میں سے ولادت شریفہ سے بڑھ کر ہیں اگر کوئی کہے کہ آجکل مجلس ولادت شریفہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب حالات کا اور احکام کا بھی ذکر کیا جاتا ہے حضرت بس رہنے دیجئے اور حالات کا ذکر محض بطور خانہ پُری کے یا صرف بالا سا چھولنے کے طور پر ہوتا ہے بخلاف ذکر متعلق ولادت شریفہ کے کہ وہ ذکر نور سے لیکر وقت وضع و رضاع وغیرہ تک کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کوئی نماز روزہ کے احکام مجلس مولود میں بیان کر دیتا ہے تو میں نے اہل مولد میں سے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ یہ کہتے تھے کہ لوگوں نے آجکل یہ نئی رسم نکالی ہے کہ وعظ کہتے ہیں نماز روزہ کا اور نام کہتے ہیں ذکر ولادت کا یہ خیالات ہیں اہل مولد کے حالانکہ حق تعالیٰ کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ فرحت کے قابل یہی شے ہے جیسا میں نے پہلی آیۃ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ الخ (اللہ تعالیٰ نے احسان کیا) کے ذیل میں بیان کیا ہے اب بتلایئے

اس پر فرحت کون کرتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر ولادت میں بوجہ اس کے کہ لڑکے خوش الحان گاتے ہیں اور مضامین و روایات بھی اکثر موضوع اور عجیب ہوتی ہیں اور اگر روایات صحیحہ بھی ہوں تو وہ ایک واقعہ اور قصہ ہے جو طبعاً دلکش ہے اس لئے اس کے سننے میں نفس کو حظ ہوتا ہے اور احکام میں کوئی خاص مزہ نہیں اس لئے کہ اس میں تو یہی ہوگا یہ کرو وہ نہ کرو تو اس میں کیا مزہ آیا حالانکہ اصل سب مزوں کی احکام ہی ہیں ایک مدت تک ان پر التزام کیجئے اور نفس کو خوگر بنایئے پھر اس میں روحانی لطف دیکھئے لیکن اس میں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں اور زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں اس لئے اس سے نفس بھاگتا ہے اور واقعات مولد شریف کے ذکر میں صرف سنالینا ہوتا ہے اس لئے اس میں نفس کو مزا آتا ہے اسی لئے اس کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح تصوف کے رنگین مضامین اور عاشقانہ اشعار کی کیفیت ہے چونکہ اس میں افعل لاتفعل نہیں ہے اس لئے خوب مزا آتا ہے سر ہلتے ہیں بلکہ یہاں تک دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ ان اشعار و مضامین کو سمجھتے بھی نہیں ان کو بھی وجد آتا ہے۔ ایک قوال یہ شعر گا رہا تھا ؎ بگزید مار عشقت جگر کباب کردمارا۔ (تیرے مار عشق نے ہمارے جگر کو کاٹ کر کباب کردیا) ایک گنوار کو وجد آگیا اس سے پوچھا کہ تونے کیا سمجھا جو تجھ کو وجد آیا اس نے کہا کہ یہ یوں کہتا ہے ڈگرے کا باپ مارا ڈگرا کہتے ہیں ہندی میں نفس کو ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اور رنڈیوں کے یہاں مروج مولد شریف ہوتا ہے کہ اس میں حظ نفس ہے ورنہ ہندوؤں کو اس سے کیا تعلق غرض قرآن مجید سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ اہتمام کے قابل نبوت اور بعثت کا ذکر ہے اور ذکر ولادت اگر کہیں آیا ہے تو اشارۃً یا اجمالاً آیا ہے اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ نے سورۂ مریم میں یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ مفصلاً بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ مولد عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کی تفصیل بیان کرنا بھی قابل خاص اہتمام کے ہے پس اس پر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر ولادت کو بھی قیاس کرتے ہیں بات یہ ہے کہ ؎

حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ (ایک چیز تونے یاد کرلی بہت چیزیں غائب ہوگئیں) آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ ان حضرات کی ولادت کا قصہ اہتمام سے بیان فرمایا ہے مگر یہ نہیں دیکھا کہ کیوں اور کس حیثیت سے ذکر فرمایا ان کے قصہ ولادت کے اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی ولادت ایک عجیب طریقہ سے خرق عادت کے طور پر ہوئی ہے یحییٰ علیہ السلام کے ماں باپ تو بوڑھے بہت تھے کہ اسباب ظاہرہ کے اعتبار سے ان میں صلاحیت ہی توالد و تناسل کی نہ تھی چنانچہ ارشاد ہے

وَاَصْلَحْنَالَہٗ زَوْجَہٗ اس لئے ان کی ولادت عجیب تھی اور عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے ہوئے اس لئے انکی ولادت اس سے بھی زیادہ عجیب تھی پس حق تعالیٰ نے ان دونوں قصوں سے قدرت اور توحید پر استدلال فرمایا ہے یہ وجہ ہے ان قصوں کے بالاہتمام ذکر کرنے کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ عادت کے موافق ہوئی ہے پس اس سے مطلقاً ذکر مولد شریف کی تفصیل کا ذکر نبوت و ہجرت کی برابر محل اہتمام ہونا ثابت نہیں ہوتا مگر آجکل بعض لوگوں نے خود اس مقدمہ میں بھی کلام شروع کیا ہے کہ آپ کی ولادت شریفہ بطریق متعارف ہوئی ہے چنانچہ ایک شخص کا میرے پاس خط آیا تھا اس میں پوچھا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی والدہ شریفہ کے بطن سے اسی طرح پیدا ہوتے جیسے اور آدمی ہوتے ہیں اور کسی کا قول نقل کیا تھا کہ ران سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے ارفع ہے کہ محل غیر ظاہر سے پیدا ہوں اور پوچھا تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ طریق معہود سے پیدا ہوئے ہیں میں کہتا ہوں کہ ان سائلوں کو ایسے امور کے پوچھنے سے شرم نہیں آتی بہت بے حیائی اور بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے میرا جی تو چاہتا نہ تھا کہ اس خط کا جواب لکھوں لیکن طوعاً وکرہاً لکھا تاکہ ان مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ اہل حق کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ میں نے جواب میں یہ لکھا کہ روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں وُلِدَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ جب تک مجاز کے قرائن نہ ہوں تو الفاظ اپنے حقائق پر محمول ہوتے ہیں یعنی جب تک معنی حقیقی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا اور یہ بھی مسلم ہے کہ علامت حقیقت کی تَبَادُرُ اِلَی الْفَھْمِ عِنْدَ الْخُلُوْعَنِ الْقَرَائِنِ (قرائن سے خالی ہونے پر فہم طرف سبقت کرتی ہے) ہے پس ان سب مقدمات سے وُلِدَ میں ولادت سے طریق معہود ہی سے پیدا ہونا مراد لیا جاوے گا یہ دلیل ہے اس کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طریق سے دنیا میں تشریف لائے ہیں اب لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کو عجیب طریق سے ثابت کریں اور عادت معروفہ کے موافق پیدا ہونے کو قدح جانتے ہیں حالانکہ اَقْرَبُ اِلَی الْحِکْمَۃِ (حکمت کی طرف نزدیک تر) آپ کی شان کے اعتبار سے یہی ہے کہ جس طرح عادۃ اللہ جاری ہے آپ اسی طرح پیدا ہوں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ امر مسلم ہے کہ آدمی کو زیادہ اُنس اس شئے سے ہوتا ہے جس سے کچھ مناسبت ہو اور جس قدر مناسبت زیادہ ہوگی اُنس زیادہ ہوگا اور جس قدر مناسبت کم ہوگی اسی قدر اس سے توحش بڑھے گا اسی واسطے آدمی کو اپنے ہم جنس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے اور جانوروں کی

طرف کم ہے اور جنوں سے اور بھی کم بلکہ توحش ہے اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام سب آدمی ہوئے ہیں فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے اس لئے کہ اُن سے آدمیوں کو توحش ہوتا اور جب توحش ہوتا تو افادہ اور استفادہ ممکن نہیں اس لئے سب رسول آدمی ہوئے ہیں جب یہ امر سمجھ میں آ گیا تو اس کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوبیت کاملہ عطا فرمادیں اور کسی کو ذرہ برابر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے توحش نہ ہو پس اس لئے بجز معجزات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور کوئی حالت ولادۃ وغیرہ بھی معمول کے خلاف نہیں بنائی اس لئے کہ اگر عادۃ جاریہ کے ذرا خلاف بھی کوئی بات ہوتی تو مناسبت میں اور پھر اس کے سبب اُنس میں کمی ضرور ہو جاتی پس ولادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نئے طرز سے نہیں ہوئی اور یہی آپکی شان محبوبیت و افادہ کے لئے مناسب ہے، اور اس کے خلاف کو ثابت کرنا اس حکمت کو نظر انداز کرنا ہے۔

بلکہ یہ حکمت یہاں تک مرعی رکھی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر کمالات بھی کہ ان میں معجزات بھی داخل ہیں نہایت لطیف ہیں جن کا عجیب ہونا امعان نظر کو مقتضی ہے حتیٰ کہ قرآن مجید جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا معجزہ ہے وہ بھی سرسری نظر میں عجیب اور اعجاز کی شان اس میں معلوم نہیں ہوتی اسی واسطے کفار نے کہا تھا لو نشاء لقلنا مثل ھذا یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ دیں لیکن ان لوگوں نے جب غور کیا اور اپنی انتہائی قوت اس کے مقابلہ میں صرف کر دی تو دانت کھٹے ہو گئے حالانکہ بڑے فصیح اور بلیغ تھے لیکن ایک سورت بھی ایسی نہ لا سکے باوجود اس کے کہ حق تعالیٰ نے ان کو جوش دلانے کے لئے علی الاعلان فرمایا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی لے آؤ کوئی سورت اس جیسی اس کے بعد اُن کے عجز کو بھی خود فرمایا وَلَنْ تَفْعَلُوْا یعنی تم ہرگز ایسی سورۃ نہ لا سکو گے اس کو سن کر اہل عرب کو کیسا کچھ جوش آیا ہو گا اور کس قدر بل کھائے ہوں گے لیکن مقابلہ نہیں کر سکے اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ آگے ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ یعنی اگر تم اس کا مثل نہ لا سکو تو اُس آگ سے بچتے رہو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے غرض یہ معجزہ بھی نہایت غامض اور لطیف ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر شان اور کمال ایسا ہی لطیف ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎ يَزِيْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا ؛ اِذَا مَا زِدْتَهٗ نَظَرًا۔ یعنی محبوب کا چہرہ تیرے لئے حسن کو بڑھا دیا۔ جب تو اس پر نظر زیادہ کرتا ہے چنانچہ بعضوں کا حسن تو ایسا ہوتا ہے کہ دور سے وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن پاس سے دیکھو تو کچھ بھی نہیں جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں

؎ بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد ؛ چوں باز کنی مادر مادر باشد

(بہت خوش قامت چادر کے اندر ہوتی ہیں۔ جب تم چادر ہٹاؤ تو نانی معلوم ہوتی ہیں)
اور بعضے دور سے اور سرسری نظر میں معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن جس قدر غور کرو خوبیاں معلوم ہوتی جاتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بھی ایسے ہی ہیں کہ ان میں سادگی تو اس درجہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎ دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند ؛ دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد
(تمام دلفریبان بناتی زیور سے آراستہ و پیراستہ ہیں ہمارے محبوب کا حسن خداداد ہے)
اور نظر تامل کے بعد دلربائی کی یہ حالت ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اسکا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے) پس ولادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی عجیب طریقہ سے نہیں ہوئی اور ولادت عیسویہ نہایت عجیب طریقہ سے ہوئی اور چونکہ اس سے توحید پر استدلال مقصود ہے اس لئے اس کو اہتمام سے بیان بھی فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدارمت وفرحت کا شان یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ (وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں) کی ہے اور ولادت شریفہ اور نشو ونما کے واقعات کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ واسطہ ہے اس دولت کی تحصیل کا خوب کہا ہے ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

(وہ دن کہ تو چاند ہوا نہیں جانتا تھا کہ ایک عالم کا انگشت نما ہوگا)
پس اصل میں تو جو مقصود حالت بدریت کی ہے لیکن ہلالیت کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ ذریعہ بدریت کا ہے پس اصل سرور تو اس کا ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی نعمت عطا فرمائی باقی اس کے جس قدر اسباب ہیں وہ چونکہ اس کے وسائط ہیں اس لئے ان سے بھی خوشی ہے اسی طرح کو مولانا رومی اپنی مثنوی شریف میں چند ابیات کے اندر بیان فرماتے ہیں جو گویا حاصل ہے ان آیات کے مفہوم کا ان ابیات کو مع مختصر شرح کے یہاں بیان کیا جاتا ہے پس فرماتے ہیں ؎

اَیُّهَا الْعُشَّاقُ اِقْبَالٌ جَدِیْدٌ از جہان کہنہ نو در رسید

یعنی اے عشاق مژدہ ہو کہ نیا اقبال چمکا ہے جو ایک پرانے اور نئے جہان سے پہونچا ہے اقبال جدید سے مراد قرآن مجید ہے اور جدید اس کو کلام لفظی کے اعتبار سے کہا ہے ورنہ کلام نفسی اور صفت الٰہیہ کے مرتبہ میں تو وہ قدیم ہے باقی رہی یہ بات کہ کلام لفظی کے اعتبار سے تو اس کی ایک صفت کو ذکر فرمایا اور کلام

نفسی کے اعتبار سے کوئی صفت ذکر نہیں کی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو جو خطاب ہوا ہے اور ہم کو جو یہ دولت ملی ہے تو اسی لباس یعنی کلام لفظی کے ساتھ ملی ہے پس ہمارے نفع میں یہ شان جدید ہی زیادہ دخیل اور سبب قریب ہوئی گو فی نفسہ قدیم ہے اور اسی صفت کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے مایاتیھم من ذکر من ربھم محدث الا استمعوہ وھم یلعبون اور فرمایا و مایاتیھم من ذکر من الرحمن محدث الا کانوا عنہ معرضین اور جہان سے مراد عالم غیب ہے، اور کہنہ اس کو اس لئے کہا کہ بہت پرانا ہے اور نو اس لئے کہ اس میں تغیر نہیں ہوا الآن کما کان (جیسا کہ پہلے تھا اب بھی ایسا ہی ہے) اس کی شان ہے اور عالم غیب کی تو یہ شان ہے ہی آسمان جو عالم شہادت سے ہے مگر بوجہ منتہائے عالم شہادت ہونے کے اس کو عالم غیب سے کچھ قرب ہے خود اس کی بھی حالت ہے کہ باوجود اس کے کہ کس قدر پرانا ہے لیکن اس میں کچھ تغیر نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں مَا تَرٰی فِی خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِن فُطُوْرٍ یعنی اے مخاطب تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی شے میں (آسمان مراد ہے) کوئی تفاوت نہ دیکھے گا (اگر کچھ شک ہے) پس نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا کہیں کوئی رخنہ دیکھتے ہو آگے مکرر تاکید کے لئے اور نیز اس لئے کہ شاید تمہاری خاطر سے کہہ دو کہ نہیں کہیں کوئی فرق نہیں اس لئے ارشاد ہے ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی پھر بار بار نظر دوڑاؤ آگے اس کا نتیجہ ارشاد ہے کہ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ یعنی ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تمہاری نگاہ پھر پھرا کر تمہارے پاس تھکی تھکائی واپس آجائے گی اور کہیں کوئی عیب نہ پائیگی خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ اے حق تعالیٰ کے طالبو اے حق کے شیدائیو اے مدتوں سے وادی ضلال میں بھٹکنے والو خوش ہو جاؤ تمہارے اقبال کا ستارہ چمکا ہے یعنی عالم غیب سے قرآن مجید نازل ہوا ہے کہ راہ حق کی طرف ہادی ہے آگے فرماتے ہیں ؎

زاں جہان کو چارہ بیچارہ جوست   صد ہزاران نادرہ عالم دروست

زاں جہان بدل ہے جہان کہنہ سے جو شعر بالا میں ہے یعنی وہ اقبال جدید اس جہان سے آیا ہے کہ وہ لاعلاج کا چارہ جو ہے اور لاکھوں عجائبات عالم کے اس میں ہیں یعنی جو شخص امراض کفر و شرک و گناہ میں مبتلا ہو کر لاعلاج ہو گیا ہو اور اس جہان کے اطباء نے اس کو جواب دیدیا ہو تو اس کا علاج اس جہان سے ہوتا ہے چنانچہ قبل از بعثت مشرکین اور کفار ایسے امراض میں مبتلا تھے کہ وہ لاعلاج ہو چکے تھے قلوب مسخ ہو گئے تھے شر کو خیر اور خیر کو شر جانتے تھے ہزاروں رسوم جہالت کی ان میں دباء عام کی طرح

پھیلی ہوئی تھیں کہ دفعۃً اقبال جدید کا ستارہ چمکا اور اس نے ایسا نور ڈالا کہ سب کا علاج ہوگیا۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ (مگر جس کو چاہے اللہ) اور اگر ایسی زبردست روشنی ان پر نور افشاں نہ ہوتی تو ان کی درستی کی بالکل امید نہ تھی چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ یعنی کفار اہل کتاب و مشرکین اپنی گمراہی سے جدا ہونے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس ایک روشن دلیل نہ آجاوے وہ دلیل ایک ایسا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو اللہ کی جانب سے ہے جو پاکیزہ صحیفے پڑھے جس میں راست راست مضامین لکھے ہوئے ہوں دوسرے مصرعہ کا حاصل یہ ہے کہ اس جہان میں عالم کے بے شمار عجائب ہیں چنانچہ دوزخ وہاں موجود ہے جس کے ہولناک اور عجائبات اور واقعات کی کسی قدر حکایت احادیث میں آئی ہے اور جنت وہاں موجود ہے جس کے بیشمار اور بیرون از عقل و قیاس نعمتوں کی خبر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اسی طرح عالم ارواح اور صراط اور میزان وہاں موجود ہیں اور ان چیزوں کے عجیب ہونے میں کوئی شک نہیں چنانچہ اسی وجہ سے ملاحدہ اور فلاسفہ نے ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے آگے ارشاد ہے ؎ اِبْشِرُوْا یَا قَوْمُ اِذْ جَآءَ الْفَرَجُ اِضْحَکُوْا یَا قَوْمُ اِذْ زَالَ الْحَرَجُ۔ یعنی اے میری قوم خوش ہو جاؤ اس لئے کہ کشادگی آگئی اور اے قوم خوش ہو جاؤ اس لئے کہ تنگی جاتی رہی مطلب ظاہر ہے قال ؎ آفتاب رفت در کازہ ہلال ؛ در تقاضا کہ اَرِحْنَا یا بلال ۔۔ ہلال صحابی ہیں مولانا نے ان کی حکایت بیان کی ہے کہ وہ ایک اصطبل میں سائیس تھے وہ بیمار ہوگئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو وہاں ہی تشریف لے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض رسانی کو مولانا بیان فرماتے ہیں کہ اور فیض رساں تو ایسے ہوتے ہیں کہ طالبین ان کے دروازہ پر آتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ایسے تھے کہ ظاہر حال کے اعتبار سے ایک شکستہ حال کے یہاں آپ خود تشریف لے گئے حافظ شیرازیؒ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم ؛ شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند (مگر وہاں عشق کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے یہ بے پٹکے اور تاج کے بادشاہ ہیں) ایسے ہی حضرات کے بارہ میں حدیث شریف میں وارد ہوا ہے رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ یعنی بہت سے پراگندہ بال غبار آلودہ دروازوں سے دھکے دئے ہوئے اور حالت ان کی یہ ہے کہ اگر اللہ پر کسی بات کے متعلق قسم

کھا بیٹھیں یعنی قسم کھا کر یہ کہدیں کہ اللہ ایسا ہی کریں گے تو اللہ تعالےٰ ان کو قسم میں سچا کر دیں
اسی شان کو فرمایا ہے حافظ شیرازیؒ نے ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بین　　　　که ناز بر فلک و حکم بر ستاره کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں) اور فلک اور ستارہ
پر ناز کرنا کیا تعجب ہے جب وہ حضرات خالق فلک و ستارہ پر ناز کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی
سطوت و شوکت جو قلوب پر تھی اس کو تو سب جانتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی عناصر پر بھی آپ کی
حکومت تھی بطور کرامت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ زمین کو زلزلہ آیا تو آپنے فرمایا اُسْكُنِيْ يَا
اَرْضُ یعنی اے زمین ساکن ہو جا زمین فوراً ٹھہر گئی اور سُنئے دریائے نیل کی کبھی یہ حالت ہوتی کہ
اس کا پانی دفعۃً ٹھہر جاتا تھا اور اس قدر نہ بڑھتا تھا جس سے زراعت کی آب پاشی ہو سکے۔
وہاں کے لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک کنواری حسین لڑکی کو اس میں چھوڑ دیتے تھے اس وقت اس کا
پانی چڑھ آتا تھا جب مصر فتح ہوا تو لوگوں نے یہ قصہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے
جو امیر لشکر تھے بیان کیا انھوں نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا میں اس کی اطلاع امیر المؤمنین کو کرتا
ہوں وہ ضرور اس کا انتظام فرما دیں گے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ سب قصہ لکھا
آپنے اسی وقت ایک فرمان دریائے نیل کے نام صادر فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ اے نیل تو اگر خدا کے
حکم سے چلتا ہے تو کسی شیطان کے اثر سے مت رک اور حضرت عبد اللہ کو لکھا کہ یہ پرچہ دریا میں
ڈال دینا۔ چنانچہ حسب الارشاد وہ رقعہ دریا میں ڈالدیا دریا اس زور شور سے چڑھا کہ کبھی اس
زور سے نہ بہا تھا۔ الغرض حاصل مصرعہ اولیٰ کا یہ ہوا کہ آفتاب فیض یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت
بلال رضی اللہ عنہ کی عیادت کے واسطے ان کے مکان پر یعنی اصطبل میں تشریف لے گئے یہ تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا فیض باعتبار تربیت جسم کے ہوا آگے فیض روحانی و فیض باطنی کا بیان ہے کہ بلال جو کہ
ایک عبد حبشی تھے اُن سے آپ نہایت لطف و شفقت سے باتیں کرتے تھے چنانچہ ان سے بتقاضا
ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اے بلال ہم کو راحت دو یعنی اذان کہدو تاکہ نماز سے راحت ہو اور نماز و
اذان کی تعلیم فرمانا ظاہر ہے کہ روحانی فیض رسانی ہے قالؒ ؎

زیر لب میگفتی از بیم عدو　　　　بر مناره رو بگو کوری او

اے بلال تم مکہ مکرمہ میں زیر لب آہستہ سے دشمن کے خوف سے اللہ کا نام لیتے تھے یعنی کلمہ توحید کبھی کبھی خفیہ کہتے تھے اب مدینہ منورہ میں منارہ پر جاکر پکار کر اللہ کا نام لو یعنی اذان کہو اور دشمن کو نامراد بناؤ اور خفیہ کہنے میں کبھی کبھی کی قید اس لئے لگائی کہ ان کی تو یہ حالت منقول ہے کہ یہ ایک یہودی کافر کے غلام تھے اور وہ ان کو تمام دن دھوپ میں گرم پتھر پر لٹایا کرتا تھا اس حالت میں بھی ان کی زبان سے توحید کے کلمات جاری رہتے تھے اتفاقاً ایک روز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اس طرف گذر ہوا جہاں یہ حضرت بلال مبتلائے تکلیف تھے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ان کے مولیٰ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے پاس ایک غلام نصرانی عداس نامی تھا جو بہت روپیہ کماتا تھا اس کو دیکر حضرت بلال کو چھڑا لیا۔ اس کافر نے کہا کہ ابو بکر بہت خسارہ میں رہے کہ ایسا اچھا غلام دیکر ان کو لیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک غلام کیا اگر تو ان کے عوض میں میرا سارا گھر بھی مانگتا تو میں وہ بھی دیدیتا تو کیا جانتا ہے یہ کیا چیز ہیں اور حق تعالیٰ نے اس کافر کے کہنے کا یہ جواب دیا وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ یعنی قسم ہے زمانہ کی بیشک انسان (کافر) خسارہ میں ہے مگر وہ مومن جو اعمال صالح کرتے ہیں وہ خسارہ میں نہیں ہیں اسی قصہ کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نظم میں اشارہ کیا ہے ؎

لَقَدْ وَاسَی النَّبِیَّ بِکُلِّ فَضْلٍ ٭ وَاَسْرَعَ فِیْ اِجَابَتِہٖ بِلَا لَا ٭٭ ابو بکر حَبَا فِی اللّٰہِ مَالًا ٭ وَاَعْتَقَ مِنْ ذَخَائِرِہٖ بِلَالًا

پہلے بلالا سے جو ایک کلمہ ہے مراد حضرت بلال ہیں اور دوسرے بلالا سے جو کہ دو کلمے ہیں مراد بدون لا کے ہے معنی اشعار کے یہ ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی راہ میں مال دیا۔ اور اپنے ذخائر سے حضرت بلال کو آزاد کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حال کے ساتھ غمخواری اور ہمدردی کی اور بدون انکار کے ان کی اجابت میں جلدی کی ان ہی حضرت بلال کی شان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں اَبُوْبَکْرٍ سَیِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَیِّدَنَا یعنی ابو بکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار یعنی بلال کو آزاد کیا ہے اللہ اکبر کہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور کہاں حضرت بلال۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تو وہ شان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ یعنی اگر کوئی میرے بعد نبی ہوتا تو عمر ہوتے باوجود اس مرتبہ کے بلال رضی اللہ عنہ کو سیدنا فرماتے ہیں لیکن کسی کو کیا خبر ہے کہ بلال کی کس شئے کو انہوں نے سید فرمایا ہے اگرچہ اس شئے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی بڑھے ہوئے تھے لیکن ان حضرات نے اپنے کو ایسا مٹایا تھا کہ ہر ایک کو اپنے سے افضل جانتے تھے آجکل دیکھا جاتا ہے کہ تھوڑا سا پڑھ لکھ کر یا کسی ادنیٰ بات سے

ایسا ناز ہو جاتا ہے کہ دماغ صحیح نہیں رہتا اور جو نسب میں گھٹا ہوا ہو اگرچہ زہد و تقویٰ میں بڑھ کر ہو اس میں عیب نکال لیتے ہیں یاد رکھو حق تعالیٰ کے یہاں نسب حسب کوئی شئے نہیں جس پر چاہتے ہیں فضل فرما دیتے ہیں دیکھو ابوجہل شریف ہو کر مطرود ہوا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ باوجود عبد حبشی ہونے کے مقبول ہو گئے۔ عجیب شان ہے ۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم　　　　ز خاک مکہ بوجہل این چہ بوالعجبی ست

(حسن بصری بصرہ کی خاک سے اور حضرت بلالؓ حبش سے اور صہیبؓ خاک روم سے ہوں اور ابوجہل مکہ کی خاک سے ہو کیا بوالعجبی ہے)

غرض حضرت بلالؓ تو بڑے علی الاعلان توحید کو ظاہر کرنے والے ہیں شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس مصلحت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہونچائے کسی خاص موقع پر اس توحید کا اخفا فرمایا ہو اس لئے ارشاد ہے کہ اب کوئی احتمال نہیں رہا پکار کر منارہ پر جا کر اذان کہو اور دشمن کا دل جلاؤ۔ قال مولانا رومیؒ

ے　می دمد در گوش ہر غمگین بشیر　　　　خیز اے مدبر رہ اقبال گیر

یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہر طالب دردناک اور غمگین جو درد طلب سے بیقرار ہے اُس کے کان میں بشیر یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھونک رہے ہیں کہ اے بدبخت اٹھ اقبال کا راستہ لے یعنی ہدایت کے ابواب مفتوح ہو گئے ہیں اس کو اختیار کر تمام ہو گئے اشعار مثنوی کے ان اشعار میں مولانا نے فیض وحی اور فیض نبوت اول بیان کیا ہے اس پر فرحت ظاہر کی ہے پھر صحابہ کی طرف فیض رسانی کے لئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ تھی اس کو بیان کیا گویا یہ اشعار ان آیات کے متقارب المعنیٰ ہیں یہ تمام تر تقریر بطور تمہید کے تھی اور اس تقریر سے مقصود مجکو شبہات کا زائل کرنا تھا کہ جو ہم لوگوں کی نسبت ہیں ورنہ اصل مقصود یہ تھا کہ اس نعمت عظیمہ پر فرحت ماموربہا کا طریقہ بیان کیا جاوے اور اس میں جو لوگوں نے افراط تفریط کی ہے ان کی اصلاح کی جاوے اور مخالفین کے دلائل کا جواب دیا جاوے لیکن تمہید ہی میں بہت تطویل ہو گئی لیکن کچھ حرج نہیں اس لئے کہ بہت سے فوائد اس سے معلوم ہو گئے (یہاں پہونچکر نماز عصر کے لئے اٹھے پھر بعد نماز آگے بیان ہوا)

اب میں مقصود شروع کرتا ہوں تقریر سابق سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر فرحت ماموربہا ہے اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس فرحت کا طریقہ صحیحہ مقبولہ کونسا ہے سو اس کے طریقے دو ہیں ایک تو وہ طریقہ جس پر خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

عمل فرمایا ہو اس لئے کہ جیسا امت پر اس آیت کا امتثال واجب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی واجب ہے جیسا نبی کو نبی ماننا فی البدیہہ جس طرح امت کے ذمہ ضروری ہے اسی طرح بلا فرق اس نبی کو بھی اپنی نبوۃ کا اعتقاد فرض ہے اس لئے یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرحت کو کس طریق سے ظاہر فرمایا ہے اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کلیاً یا جزئیاً منقول نہ ہو بلکہ کسی نے ایجاد کیا ہو جس طرح سے آجکل بہت سے محبت کا دم بھرنے والے لوگ مجالس منعقد کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو نرے مدعی ہی ہیں ہاں جو کچھ روپیہ خرچ کرنے والے ہیں ان میں سے اکثر کی نیت بری نہیں وہ محبت سے ہی کرتے ہیں مگر غلطی میں ہیں اس لئے کہ محبت میں غلطی بھی تو ہو جاتی ہے یہ تو ضروری نہیں کہ جس فعل کا منشا محبت ہو اس میں غلطی نہ ہو جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کے جوش میں مثلاً ٹھیک دوپہر کو نماز پڑھنے لگے باقی جن کا کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا بلکہ اُن کو آمدنی ہوتی ہے یعنی مولود خواں مولوی ان میں سے تو اکثر کی نیت بھی اچھی نہیں ان کا مقصود صرف روپیہ ہی ہے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ بعض کو ان میں سے حق واضح بھی ہو گیا ہو لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہم یہ طریقہ جاری نہ رکھیں گے تو ہم کو جو روپیہ اور نذرانے اور جوڑے ملتے ہیں وہ نہ ملیں گے اس لئے وہ چھوڑتے نہیں۔ میرے پاس ضلع رہتک سے ایک صاحب کا خط آیا اس میں لکھا تھا کہ یہاں ایک بی بی ہیں جن کا نام لولو ہے ان کے یا بابا کہنے کی کسر ہے ورنہ سب حرف علت جمع ہو جاتے (لطیفہ کے طور پر ہے) جیسا ایک عربی کے شعر میں کسی نے یہ حروف جمع کئے ہیں ؎

رَأَيْتُ صَبِيًّا عَلَى كُثَيْبٍ يُخَجِّلُ الْبَدْرَ وَالْهِلَالَا ۔ فَقُلْتُ مَا اسْمُكَ فَقَالَ لُؤْلُؤْ فَقُلْتُ لِي لِي فَقَالَ لَا لَا

شاعر نے کمال کیا ہے لولو اور لی لی اور لا لا کو خوب جمع کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو ایک ٹیلہ پر دیکھا اور نام پوچھا اس نے کہا لولو میں نے کہا تو میرا ہے اس نے کہا نہیں اور یہ لولو بمعنی موتی کے ہے وہ لولو نہیں جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں۔ اس پر ایک اور حکایت یاد آئی نصیر شاعر کا ایک لڑکا بچہ تھا ایک بار چند شعراء نصیر سے ملنے آئے نصیر موجود نہ تھا یہ بچہ تھا شعراء نے اس سے فرمائش کی کہ کوئی شعر فی البدیہہ بنا کر سناؤ اس نے عجیب شعر اپنے بچپن کی شان کے موافق بے ساختہ کہا ؎

اے بتو مجکو ڈر گوش دکھاتے کیوں ہو ۔ میں ہوں بالا مجھے لولو سے ڈراتے کیوں ہو

غرض ان صاحب نے لکھا تھا کہ یہاں وہ بی بی مولد شریف پڑھتی ہیں اور ان کا کچھ نذرانہ بھی مقرر ہے اور ایک نئی بات یہ ہے کہ عید بقر عید کی نماز بھی عورتوں کو پڑھاتی ہیں اور ان سب قصوں کی جڑ وہی نذرانہ ہے اسی واسطے میں تو اپنے دوستوں سے یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ بدعات کرنے والوں کو منع نہ کرو لیکن ان کو دینا چھوڑ دو جب مفت محنت کرنا پڑے گی وہ خود ہی تنگ ہو کر ان بدعات کو چھوڑ دیں گے اس لئے کہ کام تو پورا کرنا پڑے گا اور ملے گا کچھ بھی نہیں تو خواہ مخواہ کی مشقت بھی ہوگی اور وصول کچھ نہ ہوگا تو خود ہی چھوڑ دیں گے بہرحال ہر عمل کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک منقول اور دوسرا تراشا ہو گفتگو اس میں ہے کہ اس فرحت کا طریق مروج کس قسم میں داخل ہے اس کے لئے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہوں اس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ جتنی چیزیں بعد خیر القرون کے ایجاد ہوتی ہیں ان میں کونسی بدعت ہے اور کونسی مستحب اور مندوب اور ثابت بالشریعۃ ہیں اور اسی سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اس فرحت کے ظاہر کرنیکا آیا کوئی طریقہ مقبولہ ہے یا نہیں اور نیز طریقہ مروجہ بدعت ہے یا نہیں پس جاننا چاہیئے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئیں ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدوین مدرسوں اور خانقاہوں کی بنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شئے نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیر یت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائط محدثہ میں کسی شے کی ضرورت نہ تھی تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت مسلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوۃ سب مشرف تھے قوت حافظ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا فہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں ورع و تدین بھی غالب تھا بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا غفلتیں بڑھ گئیں قوی کمزور ہو گئے ادھر اہل اہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا تدین مغلوب ہونے لگا پس علماء امت کو قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی بجمیع اجزائہ تدوین کی جائے چنانچہ کتب دینیہ حدیث اصول حدیث فقہ عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کئے گئے اسی طرح نسبت مسلسلہ کے اسباب تقویت و ابقار کے لئے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ

سبب خیر القرون میں نہ تھا اور موقوف علیہ حفاظت دین ماموربہ کی ہیں پس یہ اعمال گو صورۃً بدعۃ ہیں لیکن واقع میں بدعۃ نہیں بلکہ حسب قاعدہ مُقَدَّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ (واجب کا مقدمہ واجب ہے) واجب ہیں اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جنکا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ اور تیجہ دسواں چہلم وغیرہا من البدعات کہ ان کا سبب قدیم ہے مثلاً مجلس میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فَرْحٌ عَلَی الْوِلَادَۃِ النَّبَوِیَّۃِ (ولادت نبویہ پر خوشی) ہے اور یہ سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی موجود تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے یہ مجالس منعقد نہیں کی کیا نعوذ باللہ صحابہ کا فہم یہاں تک نہیں پہونچا اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ منشا ان کا موجود نہ تھا لیکن جبکہ باعث اور بنا اور مدار موجود تھا پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شئے کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت ہیں صورۃً بھی اور معنیً بھی اور حدیث من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ (جس شخص نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں اور پہلی قسم ما منہ (جو اس دین میں سے ہے) میں داخل ہو کر مقبول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا اس سے تمام جزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے وہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کنندہ عوام کالانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولد شریف کی مجلس کو ایجاد بھی ایک بادشاہ نے کیا ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں تصرف بھی کر رہے ہیں چنانچہ چند روز سے اس میں ایک اور ترقی ہوئی ہے کہ اس دن عید منانے لگے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پرانی رسم مولد کے متعلق تو علماء نے مستقل رسائل لکھے ہیں جیسے براہین قاطعہ وغیرہ اور احقر نے بھی اصلاح الرسوم میں مفصل بحث لکھی ہے لیکن اس نئی رسم کے متعلق جس کا نام عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم رکھا گیا ہے اب تک کوئی رسالہ نظر سے نہیں گذرا اگرچہ اجمالاً میں نے گذشتہ دو سال کے دو وعظ میں اس کا کچھ بیان کیا ہے جو طبع ہو گیا ہے لیکن مفصل بحث اس کے متعلق نہیں کی گئی آج اسی کے متعلق بیان کرنے کا ارادہ ہے لیکن تمہید میں دیر ہو گئی خیر مقصود اکثر مختصر ہی ہوتا ہے اسلئے اس میں زیادہ دیر نہ ہو گی لیکن اتنا مختصر بھی نہ ہو گا کہ کوئی پہلو رہ جائے۔ جاننا چاہیئے کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی اس کے متعلق دو کلام ہیں ایک تو اس کے نام مشروع ہونیکے متعلق دلائل دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب اس کے بعد سمجھئے کہ

شریعت کے دلائل چار ہیں کتاب، سنت۔ اجماع۔ قیاس۔ ان شاء اللہ تعالیٰ چاروں سے گفتگو کی جاوے گی اول کتاب اللہ کو لیجیے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ یعنی کیا ان کے لئے شرکا ہیں کہ انہوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الٰہی یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزءً یًّا تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں ہے امر مستحدث ہے اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے مفصل گفتگو تو ان کلیات کی جس میں یہ داخل ہو سکتی ہے آگے آوے گی باقی مجملاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرح ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی سبب ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جبکہ یہ سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ خیر القرون کے زمانہ میں بھی موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب و سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ سبب بھی اس وقت موجود تھے یعنی اظہار فرح اور شوکت اسلام کی اس وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح نہیں اور یہ بالکل امر مستحدث اور جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جاوے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب الترک ہے یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا۔ اب حدیث لیجیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شے نکالے جو اس میں سے نہیں پس وہ واجب الرد ہے جو تقریر آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے اور مراد شے سے وہ ہے جس کا سبب قدیم ہو اور پھر اس وقت معمول بہ نہ ہوئی ہو باقی جس کا سبب سبب جدید ہوا اور نیز وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہو وہ مَا مِنْہُ (وہ جو اس دین میں سے ہے) میں داخل ہو کر واجب ہے۔ اور دوسری حدیث لیجیے مسلم کی روایت ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَخْتَصُّوْا لَیْلَۃَ الْجُمُعَۃِ بِقِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ اللَّیَالِیْ وَلَا تَخُصُّوْا یَوْمَ الْجُمُعَۃِ بِصِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ الْاَیَّامِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ فِیْ صَوْمٍ یَصُوْمُہٗ اَحَدُکُمْ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

نے فرمایا ہے کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں پہلے سے روزہ رکھتا ہو اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو تخصیص منقول نہ ہو وہ منہی عنہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روز روزہ رکھنا کیسا ہے آگے ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور نہی کو عارضی کہا ہے اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جاوے یہ فروعی گفتگو ہے یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے سو اس قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے غرض یہ قاعدہ کلیہ کہ تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے اب خاص یوم ولادت کو عید منانے کی تخصیص دیکھئے کہ یہ تخصیص کیسی ہے ظاہر ہے کہ منقول نہیں ہے اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بد دین سمجھتے ہیں اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ اسکو بد دین جانتے جیسے کسی کی عادت ململ پہننے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے بہرحال اس کو دین سمجھتے پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول ہوئی یہ صغریٰ ہوا اور کبریٰ اول آچکا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو مقیس علیہ یعنی یوم جمعہ سے بھی یہ بڑھ کر ہے اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل تو احادیث میں صراحۃً وارد بھی ہیں اور یوم ولادت کی فضیلت صراحۃً وارد نہیں گو قواعد سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے سب ہی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہوگا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کا قائل نہ ہو چنانچہ سیوطیؒ یا علی قاریؒ اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں ؎

لِهٰذَا الشَّهْرِ فِي الْإِسْلَامِ فَضْلٌ ۔۔۔ وَمَنْقَبَةٌ تَفُوْقُ عَلَى الشُّهُوْرِ

رَبِيْعٌ فِيْ رَبِيْعٍ فِيْ رَبِيْعٍ ۔۔۔ وَنُوْرٌ فَوْقَ نُوْرٍ فَوْقَ نُوْرٍ

(اس مہینہ کے لئے اسلام میں بزرگی ہے اور ایسی منقبت ہے جو تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ربیع ہے ربیع میں ربیع میں نور ہے نور پر نور پر)

اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں ؎ ظہور فی ظہور فی ظہور ۔ سرور فی سرور فی سرور (ظہور ہے ظہور در ظہور۔ سرور ہے سرور در سرور) اور اس میں دو پچھلے وعظوں کا نام بھی آگیا النور اور الظہور۔ اور آج کے بیان کا نام السرور رکھتا ہوں۔ اس میں وہ بھی آگیا پس فی نفسہ برکت اور فضیلت کا انکار نہیں گفتگو اس میں ہے کہ جیسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد ہیں ایسے یوم

ولادت کے نہیں پس جس کے فضائل منصوص بہ ہیں جب اس کی تخصیص تو کیسے ناجائز نہ ہوگی بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم فضیلت کی فضیلت بھی حدیث میں آتی ہے چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں فرمایا وَلِدْتُ یَوْمَ الِاثْنَیْنِ یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوا ہوں تو اس کا جواب ان شاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آویگا۔ اور تیسری حدیث سنئے نسائی نے روایت کیا ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ ترجمہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید مت بناؤ اور مجھ پر درود بھیجو کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہونچے گا جہاں کہیں تم ہوگے اس حدیث میں غیر عید کو عید منانے کی بالتخصیص ممانعت ہے شاید کوئی اس میں شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر تو سب جمع ہوتے ہیں جواب یہ ہے کہ جانا تو جائز ہے لیکن عید کے طرز پر جمع ہونا منہی عنہ ہے مطلب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اس طرح میری قبر پر جمع مت ہو اور عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا ایک اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلاتا ہے پس اس طرح جمع ہونے کی ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے چنانچہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے جو جاتے ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں اس کی کوئی تاریخ خاص معین نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیفما اتفق قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلے آتے ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو۔ بہرحال اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے پس جس طرح عید مکانی ممنوع عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی اب رہ گئی یہ بات کہ اس کے بعد صَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ (مجھ پر درود بھیجو اس لئے تمہارا درود جہاں بھی تم ہو مجھ پر پہونچے گا) بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا علت فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ ظاہراً اس پر دال ہے سو شراح نے مختلف توجیہات اس کی کی ہیں میرے ذہن میں سب سے اقرب توجیہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی لَا تَجْعَلُوْا میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوٰۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جمع ہوتے ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف

یہاں آنے پر موقوف نہیں۔ ہے جہاں کہیں تم ہوگے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجہ ہے اور اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوٰۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پہ جمع ہونا جائز نہیں ہے تو کسی اور غرض مخترع کے لئے جمع ہونا تو کیسے جائز ہوگا لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں اس لئے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدون حضور قبر ہر جگہ ممکن نہیں اور زیارت کا مندوب ہونا دوسری روایات سے ثابت ہوتا ہے بلکہ قرآن شریف سے بھی اس کا استحباب معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ ترجمہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا یعنی معاصی ان سے سرزد ہوئے تھے اگر اس وقت یہ لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور وہاں آکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے تو بیشک اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنیوالا اور رحم فرمانیوالا پاتے اور جَآءُوْكَ (آپ کے پاس آتے) یہ عام ہے خواہ حیات میں ہو یا بعد الممات ہو اس سے زیارت کا مندوب ہونا بلکہ تاکد معلوم ہوتا ہے اور اس پر بشارت ہے کہ وہاں حاضر ہو کر توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوتی ہے۔ ایک لطیفہ یاد آیا کہ کانپور کے ایک مدرسہ میں بچوں کا امتحان ہو رہا تھا ان کو چہل حدیث یاد کرائی گئی تھی ممتحنین میں ایک صاحب اہل ظاہر[1] بھی تھے حدیث یہ آئی مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِيْ فَقَدْ جَفَانِيْ یعنی جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے میرے ساتھ بے مروتی کی وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ حدیث تو حیات کے ساتھ مخصوص ہے بچہ کیا جواب دیتا وہ آگے پڑھنے لگا اتفاق سے اس کے بعد یہ حدیث تھی مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ مَمَاتِيْ فَكَاَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ یعنی جس نے میری زیارت میری وفات کے بعد کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ایک مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ مولانا آپ کا جواب ہو گیا دیکھئے اس میں صاف ارشاد ہے کہ جو بعد ممات کے زیارت کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے حیات میں زیارت کی اور زیارت فی الحیوۃ کی مشروعیہ کو آپ بھی مانتے ہیں۔ بہر حال وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں صلوٰۃ سفر سے مقصود بالذات نہیں اور زیارت کی کوئی تاریخ معین نہیں ہے اور نہ اہتمام عید کا سا ہے پس اس کی ممانعت نہیں

[1] اہل ظاہر کہتے ہیں کہ زیارت قبر نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے سفر کرنا ناجائز ہے ۱۲

اسی طرح اور بھی جن حدیثوں سے بعض لوگوں نے اس کی ممانعت سمجھی ہے ان کو غلط فہمی ہوئی ہے زیادہ تر ایسے لوگ اس حدیث کو پیش کیا کرتے ہیں لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ وَمَسْجِدِی هٰذَا وَالْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی الخ یعنی کجاوے مت باندھو مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام و مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ تقریر ان کے استدلال کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی ممانعت فرمائی ہے مگر ان تین مسجدوں کی جانب پس معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ اگر سفر کر کے جاوے تو مسجد کی نیت سے جاوے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد نہ کرے کہ وہ ان ثلثہ کا غیر ہے یہ ہے تقریر ان کے استدلال کی۔ جواب یہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ مستثنیٰ جنس مستثنیٰ عنہ سے ہو یہاں مستثنیٰ مساجد ہیں پس مستثنیٰ عنہ بھی مسجد ہی ہونا اصل ہے کہ وہی جنس قریب ہے پس تقریر کلام کی ہوگی لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلٰی مَسْجِدٍ اِلَّا الثَّلٰثَةِ مَسَاجِدَ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر کر کے مت جاؤ مگر ان تین مسجدوں کی طرف پس قبر شریف سے اس حدیث میں کوئی تعرض ہی نہیں اس کی زیارت کا تاکد بحالہ دوسری احادیث سے ثابت ہے اور ان تین مسجدوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ ان میں مضاعفت اجر کی منصوص ہے اور کسی مسجد کے لئے منصوص نہیں ہے پس حاصل حدیث کا یہ ہے کہ ثواب کی زیادتی کے اعتقاد سے کسی مسجد کی طرف سفر نہ کرو اس لئے کہ کسی مسجد کے لئے زیادتی ثواب کی منقول نہیں ہے۔ بہرحال خاص زیارت قبر شریف کے قصد سے بھی سفر کرنا مندوب ہے۔ چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انھوں نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِکُلِّ قَوْمٍ عِیْدًا وَّهٰذَا عِیْدُنَا یعنی اے عمر منع نہ کرو ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کے اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید بنانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جاوے گا اور تخصیص منصوص باطل ہو جاوے گی جس سے کلام شارع کا الغاء لازم آویگا یہ تو قرآن و حدیث سے ممانعت اس عید مخترع کی ثابت ہوئی اب رہا اجماع سو اس سے بھی ثابت ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ تمام امت کا کسی امر کے ترک پر متفق ہونا یہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر چنانچہ فقہاء نے جابجا اس قاعدہ سے استدلال کیا ہے جس طرح سے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی

فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور تکبیر نہیں تھی اسی طرح جس شے کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو وہ واجب الترک ہے اسی بنا پر فقہاء نے صلوۃ عیدین میں بلا اذان و تکبیر کہا ہے پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے عیدین میں اذان اور تکبیر کا بھی اضافہ کر دینا چاہیئے اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدہ سے اور جگہ بھی کام لو اس پر ایک یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کیا اس لئے کہ اُمتی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں پس اجماع کہاں رہا جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق متقدم کا رافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھاوے گا پس جب تک تم لوگوں نے اس کو ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں رکھا اور دلیل بھی لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین سے ثابت نہیں غرض یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اسکے عدم جواز کی دلیل ہے پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید بدعت اور امر مخترع واجب الترک ہے۔ اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہوا اور ایک وہ جو مجتہد سے منقول نہ ہوا اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس منقول نہیں ہے یہ ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانہ میں ہوئی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے مع ہذا ہم خود قیاس نہیں کرتے اس لئے ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جبکہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس پر مقدم ہے اور ان کے کلام میں اس سے تعرض ہے چنانچہ تبعید الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور شور سے اس پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمان یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے اس میں کی کچھ ضروری عبارت اشاعت کے وقت آخر میں ملحق کر دی جاوے گی (چنانچہ اب ایسا ہی کیا گیا) پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا۔ یہ تو ہمارے دلائل تھے۔ اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور ان کا جواب سنئے اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ وہ تو اگر برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہ چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش

نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں اول وہ آیت قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے چاہیئے کہ خوش ہوں اسے استدلال کرسکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا ماموربہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید بھی اظہار فرحت ہے لہذا جائز ہے جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا ماموربہ ہونا نکلا اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح ہو تو فقہاء نے کتب فقہ میں جن بدعات کو رد کیا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہیئے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل زیغ کو ہمیشہ یہ دھوکا ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہے اسی بنا پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فَلْیَفْرَحُوْا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ یہ موحدین تو سال بھر میں ایک ہی مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت[1] خوش ہیں پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی ہر وقت عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عامل ہیں اور اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں ہیں خلاصہ یہ ہوا کہ فرح ماموربہ کے تین درجے ہیں افراط۔ تفریط۔ اعتدال۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملہ (حاء مہملہ کے ساتھ) کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ختم ہو گئی جیسا بعض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جاری رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں جیسا اہل تجدید بالجیم المعجمہ[2] کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادامۃ میں ہے پس ہم نہ محدد ہیں نہ مجدد بلکہ مدیم ہیں وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ (اس پر خدا تعالیٰ کا شکر ہے) دوسرا استدلال موحدین کا اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سنی تو خوشی میں آکر ایک باندی آزاد کر دی تھی اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہو گئی پس معلوم ہوا

[1] اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشاشت اور اس کے ذوق سے ہر وقت مخمور رہتے ہیں اور نہ اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَھٰذَا ھُوَ الْفَرَحُ الْمَامُوْرُ بِہٖ کَمَا مَرَّ فِیْ تَفْسِیْرِ الْاٰیَۃِ ۱۲ جامع (یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا کریں یہ فرح ماموربہ ہے جیسا کہ آیت کی تفسیر میں گذرا) [2] جیم منقوطہ کے ساتھ

کہ ولادت پر فرح جائز و موجب برکت ہے جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اُس پر ہر وقت عامل ہیں گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَاِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ الیٰ قولہٖ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَةً مِّنْكَ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا تک کہ اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جاوے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالےٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظمیٰ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (جبکہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو) میں سجدہ تحیۃ منقول ہے اور سجدہ تحیۃ و سجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں اس پر انکار منقول نہیں اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت و احادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جبکہ آیت کے معنی یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنادیں اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا۔ پس معنی یہ ہیں تَكُوْنُ الْمَآئِدَةُ سُرُوْرًا لَّنَا یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جائے عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیسا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہو جیسے

حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م۔ت۔ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک گویا شیخ سعدی کے شعر تمتع زہر گوشہ یافتم (ہر گوشہ سے میں متمتع ہوا) سے بھی متعہ نکلتا ہے اور آیت رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب ہمارے ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع۔ی۔د آوے اس سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ چوتھا استدلال اس قصہ سے ہوسکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ (آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا) نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے۔ اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نُزِلَتْ فِیْ یَوْمِ جُمُعَۃٍ وَیَوْمِ عَرَفَۃَ (یہ آیت جمعہ کے دن یا عرفہ کے دن نازل ہوئی) یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس حدیث سے یہ ہے کہ حضرت عمر و بن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنا لینے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک بھی نہ سوجھتا لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو چنانچہ ہمارے فقہا نے تعریف یعنی یوم عرفہ میں حجاج کے مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں نیز حضرت ابن عباس نے تحصیب کو لَیْسَ بِشَیْءٍ (وہ کوئی چیز نہیں) کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انھوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار اجتماع علی شجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہوگیا گو ہر ہر مقام پر منقول نہ ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا اس کو خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا

جائز نہیں یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعیید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے مگر خدا تعالےٰ نے پہلے ہی سے اُس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِیْ وُلِدْتُ فِيْهِ یعنی میں اس دن پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادۃ عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادۃ قربت ہے لہٰذا یہ جائز ہے اس کے بھی دو جواب ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادۃ ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے پس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہو تو تم نے حکمت کو اصل علت ٹھہرا دیا حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو۔ اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہا کیوں منقول نہیں اور نیز مثل صوم یوم الاثنین کے کہ یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت فتح مکہ معراج وغیرہا آپ نے ان کی علت سے کوئی عبادت کیوں نہ فرمائی پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے۔ اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادۃ کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعیید چاہیئے اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی پس ولادۃ اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص

کی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ حصل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہیئے پھر حیرت ہے کہ یوم الولادت دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ الولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں یوم اثنین میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر پیر کو عید کیا کریں غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین کا ثابت نہیں تا یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔ اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ جس قدر عبادات شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے مکرر ہونے سے مسبب بھی مکرر پایا جاوے گا مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آویگا صلوٰۃ بھی واجب ہو گی اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود شہر سبب ہے، جب شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کیلئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اس لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد سے مسبب متکرر اور متوحد ہو۔ تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب ارارۂ قوت تھی اب وہ ارارۂ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرو تاکہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہد ہو اب وہ سبب تو نہیں لیکن مامور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو امر خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب کیا ہے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ ہونا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گذر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہو گئی کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے وہ اس خاص یوم الولادۃ کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے پس

مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ وُلِدْتُّ فِیْهِ (اس دن میں میری ولادت ہوئی ہے) سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم الولادۃ تو گذر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اب ہم تبرعاً ان حضرات کی بھی ایک عقلی دلیل لکھ کر اور اس کا جواب دیکر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی درجہ میں صحیح ہوتا کہ جب ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئے نہ ہو ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شعائر اسلام کے لئے ہیں دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدیں اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہیے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو اسی طرح عاشوراء کے دن تعزیہ داری بھی کیا کرو تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور اگر جناب یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی دوالی ہوتی ہے تم بھی ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دوالی کیا کرو۔ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکاتے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے بھی آپ ایک ذات انواط مقرر فرما دیجئے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرما دیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں دیکھئے بظاہر اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبہ بھی کچھ نہیں لیکن چونکہ صورۃً ان کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (اے موسیٰ ہمارے لئے ایک ایسا ہی معبود مقرر کر دیجئے جیسا کہ ان کے لئے یہ معبود ہیں) پس جب ہی مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جاوے یہ تو

بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس بات میں گفتگو تھی جو اختصار کے ساتھ بیان کی گئی غرض عقل سے نقل سے ہر طرح بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید مخترع ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مسرت دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اس آیت پر عمل کریں چونکہ یہ باب سرور اور فرحت کے مامور بہ ہونے کے باب میں ہے اس لئے میں اس کا نام السرور لکھتا ہوں اور عید المیلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ اس میں مفصل کلام ہے اس لئے اس کو ارشاد العباد فی عید المیلاد کے ملقب کرتا ہوں اب اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرماویں اور بدعات اور تمام نامرضیات سے محفوظ رکھیں آمین یارب العالمین۔

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ۔ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۲ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہوگیا۔

۱۔ جدید سال ۱۹۸۳ء کے لئے بیس روپیہ براہِ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۲۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک جدید خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی تبلیغی۔ اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو بھی مل جاوے گا۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ دونوں عرضیں قبول فرماوینگے

جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام

طالبِ دعا محمد عبد المنان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱